نئے ادبی رجحانات

ڈاکٹر اعجاز حسین
الہ آباد یونیورسٹی

اشاعت اوّل جون ۱۹۴۲ء

اشاعت دوم مارچ ۱۹۴۳ء

اشاعت سوم اپریل ۱۹۴۶ء

اشاعت چہارم اکتوبر ۱۹۴۹ء

اشاعت پنجم مئی ۱۹۵۷ء

قیمت ۳ روپئے ۵۰ نئے پیسے

ناشر

کتابستان، الہ آباد

مطبوعہ

اسرار کریمی پریس الہ آباد

نذرِ عقیدت

اپنے شفیق استاد پنڈت امرناتھ جھا صاحب
وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی کے
انتہائے کرم و علم نوازی سے متاثر ہو کر
اس ناچیز تصنیف کو بصد خلوص
و ادب موصوف کے نام نامی
سے معنون کرتا ہوں

اعجاز

پانچواں ایڈیشن

کہنے سننے کے لئے یہ پانچواں ایڈیشن ہے مگر بقول غالب "شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں" تو یہ ساتواں ایڈیشن ہوتا ہے۔ اس کے دو ایڈیشن پاکستان میں ایک مہربان نے چھاپ لئے جن کی نہ مجھ سے اجازت لی گئی اور نہ کوئی معاملہ کیا گیا نہ پچھلے ایڈیشن پر کوئی ترمیم کی گئی صرف غلطیوں میں اضافہ ضرور کیا گیا۔ بہرحال یہ نسخہ جو آپ کے سامنے ہے میں اسکو پانچواں ہی ایڈیشن سمجھ رہا ہوں اس ایڈیشن میں جا بجا کچھ ترمیمات ہیں لیکن اس لئے ناقص ہیں کہ آزادی کے بعد سے جو رجحانات پیدا ہوئے ہیں ان کی تکمیل یا پختگی کے لئے ایک وقفہ کی ضرورت ہے اور وہ ذرا دیر میں آئے گا لیکن بعض ایسے رجحانات ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ اور تاریخی اعتبار سے باوجود نئے ہونیکے دیرپا معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً پیروڈی اور رپورتاژ۔ اسلئے ان کو اصناف سخن سمجھ کر کتاب کے آخر میں جگہ دیدی گئی ہے اس کتاب کے لحاظ سے یہ دونوں عنوانات اضافے ہیں جو گذشتہ اشاعتوں میں نہ تھے۔ اردو میں یہ اصناف نئی ہیں مگر دوسری زبانوں میں پرانی ہو چکی ہیں۔ پیروڈی تو خاص کر بہت پرانی چیز ہے اس کی بنیاد ہومر کے وقت سے ملتی ہے اردو میں یہ دور جدید بلکہ موجودہ زمانے کی چیز ہے اسلئے کہ اسکے خدوخال دور حاضر میں ابھرے ہیں۔ امید ہے کہ دونوں اصناف معلومات عامہ کے لئے مفید ہوں گی۔

اس موقع پر بتانے کو جی چاہتا ہے کہ ۴۷ء کے بعد تاریخ کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے آزاد قوم اور غلام قوم کی ذہنیت کا فرق بہت جلد محسوس ہونے لگا ہے۔ پورا سماج ایک نئے انداز سے متشکل ہو رہا ہے ابھی معاشرت کسی ایسے رستہ پر نہیں آئی کہ اطمینان ہو جائے کہ اب

یہ نظریہ دیر تک کارفرما رہے گا۔ ادب بھی تو سماج ہی کا پروردہ ہے وہ بھی اسی محور پر گھوم رہا ہے۔
چنانچہ مختلف و متعدد رجحانات پیدا ہو رہے ہیں تخلیق کے لحاظ سے تو متعدد باتیں آگئی ہیں
لیکن کل یہ باتیں رہیں گی یا نہیں اس وسواس میں ان نوزائیدہ رجحانات کو قلم بند کرنے میں تکلف
ہوتا ہے ہمارا آج کا ادیب بھی ایک خلفشار میں مبتلا ہے وہ کبھی ہنگامی مسائل کی طرف متوجہ ہوتا ہے
کبھی پنج سالہ پروگرام کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے مگر آزادی کے بعد بھی بیکاری و ذہنی انتشار کی
تاریک فضاؤں میں گم ہو جاتا ہے، مایوسی و قنوطیت چھا جاتی ہے یہ عالم غالباً ابھی باقی رہے گا۔
جب تک کسی ایک مستقل نظریہ کے ساتھ زندگی کو چلتے نہ دیکھ لے سماج کو جادۂ اعتدال پر نہ پالے
ادیب بھی کشمکش میں رہے گا اندیشہ ہے کہ وہ بھی محاذ بدلتا رہے گا ممکن ہے متضاد باتیں بھی کہنا
پڑے۔ بہر حال وقت آنے پر اس کتاب میں تازہ ترین رجحانات بھی جگہ پا جائیں گے۔

اس خیال سے کہ بعض حلقوں میں یہ کمی محسوس کی جائے کہ جو کچھ بھی تھا اس کتاب میں ان
رجحانات کا بھی ذکر ہونا تھا جو آج ادب کی گود میں پل رہے ہیں یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ
ان محسوسات کو قلم بند کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ سرسری جائزہ بہت
تشنہ معلوم ہوگا اس کے لئے میں دوسری کتاب لکھ چکا ہوں جس کا عنوان "آزادی کے بعد اردو ادب"
ہے۔ کتاب چھپ رہی ہے امید ہے ۵۶ء کے اختتام سے پہلے آپ تک پہونچ جائیگی فی الحال
تو اسی ایڈیشن پر قناعت کیجئے۔ اچھا ہے یا بُرا ہے جو کچھ ہے اس پر اپنی رائے دیجئے۔

اعجاز

نشیمن الہ آباد۔ دسمبر ۵۶ء

چند باتیں

اسلامی تمدن ایک مدت کے بعد اس قابل ہوا تھا کہ ہندوستانی تہذیب سے مل کر کوئی نئی طرز معاشرت ہندوستان میں قائم کر سکے۔ ملک کے طول و عرض میں ابھی یہ زندگی ہمہ گیر نہ ہو سکی تھی کہ سلطنت مغلیہ کے تار و پود بکھرنے لگے اور آہستہ آہستہ ایک تیسرے تمدن یعنی مغربی طرز معاشرت کی پرچھائیاں پڑنے لگیں۔ تاریخ اسکی سازگار بن گئی اور تھوڑی ہی مدت میں اس میں اتنی قوت آگئی کہ ہندستانی تہذیب نے اپنا حریف سمجھ کر مقابلہ کی کوشش کی۔ ۱۸۵۷ء میں ایک زبردست تصادم ہوا۔ اس ٹکر کی آواز سے تمام ملک چونک پڑا لیکن بالآخر ہندوستان کو مغرب کے آگے سر جھکانا ہی پڑا اور ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ نئے نظام نے ہندوستان میں متعدد تحریکیں پیدا کردیں، زندگی کو اصول نو سے ہم آہنگ بنانے کے لئے اخلاق، طرز معاشرت سب کو تبدیل کرنا پڑا، نئے نظریئے، سیاسی خیالات اور سماجی حالات کو اردو ادب بھی جذب کرتا رہا۔ اظہار جذبات کے لئے مختلف پیرائے اختیار کئے کبھی غزلوں میں اپنا انتشار پیش کیا۔ کبھی شہر آشوب سے۔ عہد قدیم میں بھی اس نے دل کا بخار نکالا۔ اور کبھی مثنوی میں خستہ حالی کا ماتم کیا۔ لیکن زیادہ تر اعتراف شکست فراریت کا ثبوت دیتا رہا۔ عصر جدید میں رفتار زمانہ سے ہم نفس ہونے کی کوشش کی۔ راہ فرار اختیار کرنے کے بجائے واقعات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا شروع کیا۔ ہر قومی و ادبی تحریک سے دلچسپی لی اور دور حاضر تک آتے آتے سیاسی و سماجی تحریکات کو اتنا جذب کرلیا کہ ایک جان دو قالب معلوم ہونے لگے، گویا عہد قدیم میں اردو نے حیات و نظام پر ایک سرسری نظر ڈالی تھی۔ عصر جدید میں زیادہ قریب سے مطالعہ کیا اور دور حاضر میں گود پھیلا کر سینے سے لگا لیا۔

دورِ حاضر میں جس تیزی سے اور جس منظم طریقہ سے انقلابات رونما ہوئے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں آسانی سے نہ ملے گی۔ اردو نے بھی ایک زندہ ادب ہونے کا ثبوت دیا۔ ہمہ گیری و جامعیت ہمیشہ سے زیادہ نمایاں ہوئی۔ دیہات و شہر، آسمان و زمین، کسان و مزدور، غرض ساری کائنات پر مختلف زاویوں سے نگاہ کی رفتارِ زمانہ کے ساتھ اس تیزی سے بڑھی کہ خدا جانے کتنے رجحانات اس کے دامن میں سمٹ آئے۔ ہر قدم پر ایک تحریک اور ہر سانس میں ایک انقلاب اردو ادب کا دورِ حاضر میں امتیازی کارنامہ ہو گیا۔ اب تجزیہ کر کے یہ دیکھنا ہے کہ کتنے رجحانات ہمارے ادبی خزانے میں آئے اور کس شان سے آئے۔ پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے لئے اردو ادب میں کتنی کمی رہ گئی ہے نیز موجودہ رجحانات کی خوبیوں اور خرابیوں کو دیکھ کر اندازہ ہو جائے کہ جدوجہد کیلئے اور کیا سامان مہیا کئے جائیں کہ منزلِ مقصود تک ہمارا ادب کامیابی کے ساتھ پہنچ جائے۔

اس خیال سے سارے ادب کا جائزہ لینا ضروری ہو گیا۔ اس کتاب میں دورِ جدید پر پوری روشنی ڈالنے کے لئے عہدِ قدیم کے رجحانات کا بھی تذکرہ کرنا پڑا مجھے اس کا احساس ہے کہ اس کتاب کے وجود میں آنے سے پہلے دو ممتاز اہلِ قلم نے قابلِ قدر تصنیفات میں جدید اردو شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ موہن سنگھ صاحب دیوانہ نے اپنے انگریزی مقالہ میں اور عبدالقادر سروری صاحب نے اپنی کتاب 'جدید اردو شاعری' میں بھی نہایت خوبی سے اپنی کوششوں کو پیش کیا ہے لیکن اول تو ان کتابوں میں ادب کے صرف ایک پہلو یعنی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے، نثر پر توجہ بالکل نہیں کی گئی۔ اور دوسرے یہ کہ ان تصانیف کو وجود میں آئے ہوئے دس سال کے قریب ہو گئے اور اس درمیان میں دنیا بہت آگے نکل گئی۔ اردو ادب میں کتنے رجحانات اور کتنے ادیب پیدا ہوئے یا مر گئے یعنی بعض شعراء نے میدانِ شاعری میں ایک ممتاز حیثیت سے قدم رکھا اور کسی خاص رجحان یا اندازِ بیان کو لے کر چلے مگر عمیق مطالعہ و مشاہدہ کے فقدان نے آگے بڑھنے نہ دیا اور بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی

صلاحیتوں کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصے میں ایک مستقل اہمیت حاصل کرلی۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اُردو ادب کے نئے رجحانات پیش کرنے کی مجھے جرأت ہوئی۔

مجھے اعتراف ہے کہ باوجود کوشش کے بھی تمام رجحانات کا جائزہ میں نہیں لے سکا لیکن اس کا خیال ضرور رہا ہے کہ کوئی اہم رجحان نظر انداز نہ ہونے پائے ممکن ہے کہ مجھے اس میں کامیابی ہوئی ہو۔ رجحان سے میرا مطلب ایسی تحریک سے ہے جس کی ہردلعزیزی عام ہوگئی ہو، دوچار آدمیوں تک محدود نہ رہی ہو۔ ادب نے اُسے وسعت دیکر کچھ عرصہ کے لئے قبول بھی کرلیا ہو۔

میرا خیال یہ ہے کہ سختی کے ساتھ تاریخ ادب میں ادوار کی تقسیم نہیں ہوسکتی۔ علاوہ اس کے کہ ادبی راستے بہت نمایاں طور پر دفعتاً الگ نہیں ہوتے۔ ایک دور کا اختتام دوسرے دور کی ابتدا سے کافی ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد نیا راستہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی منزلیں بھی الگ ہوگئی ہیں حالانکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے بہت پہلے علٰحدگی کی بنیاد پڑ چکی تھی ..... لیکن اس امر کے علاوہ ایک اور دقت ہوتی ہے کہ بعض ادیب ایک سے زیادہ دور میں بغیر نمایاں تبدیلی کے ملتے ہیں، ان کی ذہنیت اولین عہد میں مرتب ہو چکتی ہے۔ وہ دور مابعد کی تبدیلی قبول نہیں کرنا چاہتی مگر ان کا کلام و رجحان چونکہ پہلے سے ایک اہمیت و شہرت حاصل کرلیتا ہے اس لئے مذاق عام میں نئی ذہنیت کا دخل فوراً نہیں ہونے پاتا۔ اس کتاب میں آپ کو ایسے اہل قلم ملیں گے جن کے لئے شاید کہا جائے کہ یہ بوڑھے، نوجوانوں کی صف میں نظر آتے ہیں لیکن ان کے کارناموں کا تسلسل یا کسی نہ کسی طبقہ میں ان کی ہردلعزیزی مجبور کرتی ہے کہ انھیں نظر انداز نہ کیا جائے اس لئے رجحان کی اہمیت کے لحاظ سے جہاں مناسب سمجھا گیا ہے ان کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کے بعض اجزا مختلف رسائل مثلاً نیا ادب (لکھنؤ) شاہ کار (گورکھپور) نیساں (الہ آباد) وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں جن کو پڑھ کر لوگوں نے ہمت افزائی بھی کی تھی مگر پھر بھی ابھی میں علاوہ کاغذ کے قحط کے اور کئی وجوہ سے اس کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ اگر مجنوں صاحب، خواجہ غلام السیدین صاحب، طالب صاحب الہ آبادی، اور محمد یحییٰ صاحب تنہا (مصنف سیر المصنفین) نے شروع سے آخر تک مسودہ پڑھنے کی زحمت گوارا کرنے کے بعد اس کو شایع کر دینے پر اصرار نہ کیا ہوتا۔ ان حضرات نے نہ صرف پڑھنے کی زحمت گوارا کی بلکہ اپنی اپنی بیش قیمت رائے سے سرفراز فرمایا جس کا میں تہ دل سے ممنون ہوں۔

استاد محترم پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب قبلہ کی موجودگی ہی میرے لئے رہنما کا کام کرتی ہے۔ ہزاروں طرح کی بے راہ روی سے روکتی ہے تصنیف و تالیف کی راہ میں ہمیشہ ہمت افزائی کا باعث ہوتی ہے، اس کتاب کے سلسلہ میں بھی جب کبھی میں نے موصوف سے استفادہ کرنا چاہا آپ نے اپنی رائے سے سرفراز فرمایا ہے یہ ایک ایسی حقیقت کا اعتراف ہے جسے خلوص کی آنکھیں دیکھتی ہیں اور عقیدت مند دل محسوس کرتا ہے اسکے لئے شکریہ کا لفظ بے معنی اور کم قیمت ہے۔

میری ہر ادبی کاوش میں اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی سے احتشام صاحب نے دلچسپی لی اور مدد دی۔ اور خوشی اس کی ہے کہ اس وضع داری کو انھوں نے اپنی پروفیسری کے زمانہ تک نباہنے کی سعی مشکور کی ہے۔ ایک سے زائد بار کتاب کے پڑھنے میں انھوں نے باوجود سخت مصروفیت کے بھی اپنا قیمتی وقت صرف کیا، رائے دی اور کمزوریوں کی طرف بھی توجہ دلائی۔ میں شکر گزار ہوں مگر ڈرتا ہوں کہ وہ حسب معمول سعادت مندی و مراسم کی بنا پر یہ کہہ کر نہ ٹال دیں کہ "جی نہیں شکریہ کی کیا ضرورت ہے"

خواجہ سردار حسین صاحب (ریسرچ اسٹوڈنٹ) نے مسودہ کی ترتیب و ترمیم میں جو محنت کی ہے اس کی اہمیت میری نظروں میں یہ ہے کہ اگر انھوں نے اپنی ذہانت کا ثبوت نہ دیا ہوتا تو شاید یہ کتاب موجودہ صورت میں نہ ہوتی۔

میں نے اس کتاب کی تصنیف میں کن کن تصنیفات و رسائل وغیرہ سے فائدہ اٹھایا ہے ان سب کا بیان گنانا نہ تو مفید ہے نہ ضروری لیکن ان کی اہمیت کا اعتراف اور ان کے مصنفین کا شکریہ ادا کرنا ناگزیر ہے۔

تصویر کے لئے میں اپنے رفیق کار پروفیسر رابندر ناتھ دیب کا ممنون ہوں۔

نشیمن۔ الہ آباد
مارچ ۱۹۴۲ء

اعجاز

دوسرا ایڈیشن

دوران جنگ میں کسی کتاب کا ایک بار بھی شائع کرنا سنگلاخ زمین میں اچھے اشعار کہنے سے کم نہیں اور دوسری اشاعت کی فکر کرنا تو جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ مشکل ہے، کاغذ بلکہ جملہ لوازمات کا قحط عنقا کا حکم رکھتا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اس زمانہ میں کتاب چھپانے کا خبط ہوا ہے۔ کسی نہ کسی وجہ سے مجھے بھی دوسری اشاعت کا سودا مول لینا پڑا نئے ادبی رجحانات کو پہلی بار شائع کرتے وقت مجھے اطمینان تھا کہ اب کم از کم لڑائی کے بعد ہی دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئیگی لیکن یہ اطمینان بھی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے دیرپا نہ ثابت ہوا پانچ چھ مہینے کے اندر پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا اور ایک مصنف کو جو مسرت ہونی چاہیئے تھی وہ مجھے نصیب ہوئی کتاب کی مقبولیت سے زیادہ اسکی خوشی ہوئی کہ اب اردو پڑھنے والوں میں صرف احساس بیداری نہیں بلکہ جذبۂ عمل بھی پیدا ہوگیا ہے۔ ناول اور افسانوں کے علاوہ علمی و ادبی کتابوں پر بھی لوگوں کی توجہ ہے خریدتے ہیں اور غالباً پڑھتے بھی ہیں مختصر یہ کہ لوگ اپنے ادب سے دلچسپی لینے لگے ہیں چنانچہ میری کتاب کی مانگ برابر جاری ہے۔ لوگوں کی قدردانی و ہمت افزائی کا خیال کرکے مجھے بھی دوسرے ایڈیشن شائع کرنیکی مصیبت پر آمادہ ہونا ہی پڑا۔

اس ایڈیشن میں آپ کو زیادہ تبدیلیاں نہ ملیں گی جسکی خاص وجہ تو یہ ہے کہ پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں اتنا کم وقفہ ملا کہ ترمیم کے لئے نہ تو زیادہ رائیں مل سکیں اور نہ میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ بہرحال جو کچھ رسالوں اور خطوط سے تجویزیں حاصل ہوئیں انھیں اپنے طور پر جہاں تک معقول سمجھ سکا قبول کرکے میں نے کتاب میں جگہ دیدی ہے۔ امید ہے کہ یہ ایڈیشن پہلے سے بھی بہتر ثابت ہوگا۔

اس سلسلہ میں ان ریڈیائی نشرگاہوں اور رسالوں کا شکرگزار ہوں جنھوں نے کتاب پڑھ کر نقد و تبصرہ اور معقول تجویزوں سے بھی سرفراز فرمایا لیکن ساتھ ہی ساتھ ان اہل قلم سے شکایت بھی ہے جنھوں نے رسالوں میں نقاد کا فرض تنقیص محض سمجھ کر ریویو کئے۔ میرا خیال ہے کہ مصنف کو صحیح اعتراض و معقول تجویز میں ایک خاص روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے اگر ریویو کرنے والا سمجھ بوجھ کر اعتراض کرے تو وہ مصنف اور ادب کا صحیح معنوں میں بہی خواہ ہے مگر اس سلسلہ میں کوفت جب ہوتی ہے کہ بغیر اچھی طرح پڑھے کتاب پر ریویو کیا جاتا ہے ان چیزوں کے نہ ہونے کی شکایت کی جاتی ہے جو کتاب میں موجود ہیں یا موضوع سے الگ ہو کر ان باتوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو کتاب کے حدود سے باہر ہیں کسی نے سوانح حیات کا مطالبہ فرمایا ہے کسی نے خاص [illegible] کے تذکرے کی امید کرنا جن کو رجحانات سے کوئی خاص تعلق نہ ہو [illegible] کا کام ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ میں نے صرف ادبی رجحانات پر قلم اٹھایا تھا اس میں رجحانات کی کمی کے متعلق رائے قائم کرنے میں غلطیاں ہو سکتی ہیں [illegible] پر اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے لیکن مختلف شعراء کے اسلوب نگارش اور متعدد نثر نگاروں کی [illegible] بحث کی ضرورت تھی اور نہ کتاب کیلئے ضروری تھی۔ اگر ان باتوں کی کمی پر [illegible] غصہ آیا تو [illegible] معذور تھا اور شکایت فضول

دوسرے اڈیشن کے سلسلہ میں اپنے عزیز شاگرد سید مسیح الزماں صاحب جائسی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے باوجود اپنی انتہائی مصروفیت کے نہایت خلوص و انہماک کے ساتھ پروف دیکھے اور جا بجا معقول تجویزوں سے کتاب کو بہتر بنانے میں اپنا بہت سا قیمتی وقت صرف کیا

اعجاز

نشیمن۔ الہ آباد
جنوری ۱۹۴۴ء

زبان انسانی سماج کا وہ آلہ ہے جس نے روز ازل سے کشمکش حیات و رجحانات کی آئینہ داری کی ہے۔ زبانوں کا ابتدائی دور اگر عہد قدیم کی طرز زندگی کا پتہ دیتا ہے تو ترقی یافتہ ادبی دور اس ذہنی نشوونما کی تاریخ پیش کرتا ہے جس سے انسانی تخیلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو زبان کی پیدائش دوسری زبانوں اور ادبیات سے کسی قدر الگ ہے لیکن حالات سے متاثر ہو کر انھیں اپنے دامن میں جگہ دینے کا جو سلیقہ اس زبان میں پیدا ہو گیا ہے وہ کسی قدیم و قومی زبان سے کم نہیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر تک ہندوستان کا عیش پسند جاگیردارانہ نظام عشق و حسن، گل و بلبل، آب رکنا باد، گلگشت مصلیٰ، اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے دلچسپی لیتا رہا۔ لیکن اس درمیان میں بھی ذی حس اور ذہین شعراء یا وہ شعراء جنھیں دربار داری کی پابندیاں بالکل بیکار نہ کر سکی تھیں، کبھی کبھی ان موضوعات سے

کنارہ کشی کرکے زندگی کے دوسرے خارجی مظاہر سے بھی دلچسپی لینے کا ثبوت دیتے رہے۔ اور جن چیزوں کو ہم بالکل آج کی چیز کہتے ہیں ان کے دھندلے نقوش پہلے بھی غیر منظم صورت میں نظر آجاتے ہیں۔ مثلاً مناظر فطرت کا کبھی کبھی مثنویوں یا مرثیوں میں نظم ہوجانا۔ کسی تہوار یا کسی خاص موقع کی تقریب میں جذبات کا نمایاں ہوجانا جیسے میرؔ کی ہولی، سوداؔ کا شہر آشوب، حاتمؔ کی مثنویاں قلی قطب شاہ اور نظیرؔ اکبرآبادی کی متعدد نظمیں، لیکن اوّل تو قدماء میں بہت کم شعراء نے یہ چیزیں پیش کیں۔ اور جو چیزیں آئیں بھی ان کی اہمیت دنیائے ادب میں خاص نہ تھی اور دوسرے یہ ذخیرہ مقدار میں اتنا کم نظر آیا کہ زمانے کے رجحان نے قبول عام کی خلعت سے اسے سرفراز کرنا مناسب نہ سمجھا۔ زیادہ تر ضمناً و تفریحاً اس قسم کی نظمیں اس وقت گاہے ماہے آجاتی تھیں۔ غدر کے بعد سے باقاعدہ اس کا احساس ہوا کہ رفتار زمانہ سے ہم آہنگ ہونے کے لئے ادب کو ہمہ گیر اور زندگی سے قریب تر کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو محمد حسین آزادؔ کے مبارک ہاتھوں سے ایک انجمن کی بنیاد پڑی۔ جس میں موصوف نے زبان کے ارتقا و انقلاب پر ایک مبسوط تقریر کی اور اسی تاریخ سے یہ طے کیا کہ ترقی پسند طبقہ کے رجحانات کی تشکیل کے لئے اس انجمن میں شاعروں کا رویہ مروجہ طرز سے الگ ہو۔ بجائے مصرعۂ طرح دینے کے موضوع بتادئے جائیں۔ غزل کے بجائے لوگ نظمیں کہہ کر لائیں۔ آزادؔ اور حالیؔ نے انجمن کو ہر دل عزیز بنانے اور لوگوں کو راستہ بتلانے کے لئے نئے عنوانات منتخب کئے اور کئی ایک دلکش اور کارآمد نظمیں بھی کہیں۔

یہ مہتم بالشان تاریخ جدید اُردو ادب میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے محض اسی لئے نہیں کہ ایک نئی روش کا اضافہ ہوا بلکہ اب اس سے ایک اتنی بڑی کمی پوری ہونے والی تھی جس کی وجہ سے ہماری زبان کو ندامت سے دنیا کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا۔ حسن وعشق کے افسانوں کی بھرمار میں غریبوں کی زندگی، قدرتی مناظر، قومیت کے اُبھار کا کہیں پتہ نہ تھا۔ جیسے ادب کو عوام سے کوئی لگاؤ ہی نہیں کشمیر، ہمالیہ، اور گنگا اپنی رفعت اور عظمت کے ساتھ داہنے بائیں، سامنے موجود ہوں اور ادب کا دیوتا ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے طرّہ یہ کہ ان کے قابل قدر اور جذبات افروز ہونے پر ایمان بھی ہو۔ عشق کی تشبیہات میں ان کا صرف کرنا ان کے سہارے سے مضمون میں جدّت پیدا کرنا کبھی کبھی ضروری سمجھا بھی جاتا ہو لیکن وضعداری و تقلید نے فرصت ہی نہ دی کہ عاشقانہ حدود سے الگ ہو کر کبھی ان کی انفرادی حیثیت، دلکشی اور اہمیت کو بھی دماغ و قلم کے قابل سمجھا جائے۔

غدر یا اس سے کچھ اور بھی پہلے اہل نظر کو ہماری شاعری کے انبار میں ایک طرف کچھ حصہ ملا جو رسمی، بے جان، بے کیف اور بے کار معلوم ہوا۔ اور دوسری طرف مغربی ادب و تمدن میں نئے راستے اس تیزی کے ساتھ دکھائی دیئے کہ اب یہ بھی دقّت نہ رہی کہ غزل، قصیدہ، مثنوی، اور عاشقانہ جذبات کے علاوہ کس شکل اور کس عنوان سے کیا لکھا جائے، نئے خیالات اور نئے انداز کے لئے ایک زمانہ بیچین تھا۔ اس بیچینی میں تاریخی طاقتیں بھی کام کر رہی تھیں۔ آزاد نے بڑی نبض شناسی سے کام لیا۔ زمانے نے لوگوں کے محسوسات کا صحیح اندازہ لگانے پر مجبور کیا

اور انھوں نے باقاعدہ ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، خضر بن کر رہنمائی کے لئے آگے بڑھے۔ نئے موضوعات پر خود بھی خامہ فرسائی کی اور دوسروں کو بھی مائل کیا۔ یہ طرز نو بڑی عقلمندی پر مبنی تھا۔ اس لئے کہ اگر غزل کو ترمیم کرکے زمانۂ حال کے حسب ضرورت و منشا بنانے کی فکر کرتے تو کوشش بالکل بے سود ثابت ہوتی۔ نہ تو غزل کا مزاج نئے مذاق و ضرورت کو قبول کرتا اور نہ جدید تحریک غزل کی متحمل ہوسکتی۔ نتیجہ دونوں کے لئے تباہ کن ہوتا۔

اس دور اندیش بزرگ نے ادب کے صرف ایک ہی پہلو کو نہیں سنوارا، بلکہ بیک وقت دونوں پہلوؤں کے درست کرنے کی کامیاب کوشش کی اور خوشی اس کی ہے کہ یہ سعی مشکور بھی ہوئی۔ سکندری انداز میں بحر و بر دونوں کو یکساں نوازا ہے۔ بحر نظم کے ساتھ ساتھ میدان نثر کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اگر نظم میں قدرتی مناظر، اخلاقی خصوصیات اور دوسری کارآمد باتوں کا اضافہ کیا ہے تو نثر میں بھی فن تنقید، علم اللسان، رمزیہ، ادب الاطفال وغیرہ پر توجہ کرکے رجحانات کو نئے راستے پر ڈال دیا ہے۔ زمانہ کے محسوسات اور ضروریات کو اپنے جادو نگار قلم سے کچھ اس طرح متشکل کیا کہ چھوٹے بڑے سبھوں نے بیساختہ دل سے داد دی اور جن کو توفیق ہوئی اُنھوں نے اسے پیغام عمل سمجھ کر لبیک کہا اور خود بھی نئے راستوں پر قدم ڈال دئے۔

نئے رجحانات سے پہلے

جدید اُردو ادب کے رجحانات پیش کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دور سے پہلے کے رجحانات بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دئے جائیں تاکہ موازنہ میں بھی آسانی ہو اور ہر دور کی اہمیت زیادہ واضح ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ہمیں سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُردو کا رجحان ابتدا ہی سے عاشقانہ رہا ہے۔ اس کے وجوہ تلاش کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اُردو نے آنکھ کھول کر دیکھا تو فارسی ادب سامنے تفصیلات اور واردات عشق و حسن سے کھیل رہا تھا۔ دل کھونا، ہجر میں آہیں بھرنا، تڑپنا، مرنا جینا، کبھی کبھی مجاز سے حقیقت تک پہنچنا اور اس کے ساتھ ساتھ حسن کی تعریف، اپنی ستم کوشی پر ناز، اپنی قوت برداشت کا مظاہرہ غرضکہ دنیائے عاشقی کے جملہ لوازمات پر نظر پڑی، ہندی شاعری سے میل ہوا تو وہاں بھی کم و بیش یہی سماں نظر آیا — ناممکن تھا کہ گرد و پیش کے مناظر اپنا اثر نہ ڈالتے۔ یہ چیزیں اس کثرت سے

خوبیوں کے ساتھ سامنے آئیں کہ دوسرے کارآمد موضوعات پر بڑی دیر میں نظریں گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری نے بھی زبان عاشقی میں گفتگو شروع کردی۔

ولی کے وقت سے یا اس سے پہلے بھی دکن ہو یا شمال جہاں کہیں نظریں جاتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کا سب سے پہلا رجحان دُنیائے محبت (حقیقی یا مجازی) کی سیر کرنا اس کے واقعات و رازہائے سربستہ کا بیان کرنا اور ان سے لطف اندوز ہونا ہی ہے۔ اس رجحان کی نشو و نما میں تقلید سے زیادہ سماجی اور اقتصادی مسئلے کارفرما رہے۔ ایسے شعرا بھی ملتے ہیں جن کے یہاں انفرادیت اور ماحول سے متاثر ہونے کے ثبوت کافی ملتے ہیں۔ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں بھی مختلف مقامی عنوانات و ذاتی تاثرات پر طبع آزمائی کرکے شعرا نے نئے نئے راستے اردو شاعری میں پیدا کردئے تھے جن کے لئے آج دور حاضر بیچین ہے' مصنف کلیات نے باغوں پھلوں، محلوں، تہواروں اور معشوقوں (اپنے معشوقوں کے نام بنام) پر متعدد نظمیں لکھ کر ادب کو زندگی سے قریب کرنے کی قابل قدر کوشش کی تھی۔ ایسے شعراء جو کچھ بیان کرتے ہیں اس میں اثر و خلوص کا غلبہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اوّل تو ایسے شعراء کی تعداد بہت کم ہے اور دوسرے یہ اثر بھی عام نہ ہو سکا۔

میر و سودا کے عہد تک عاشقانہ جذبات کے علاوہ ہم کو کچھ رجحانات ایسے بھی ملتے ہیں جو کئی لحاظ سے قابل قدر ہیں مگر بدقسمتی سے اس وقت کے تاریخی اور سماجی حالات کی وجہ سے ان کو فروغ نہ حاصل ہو سکا ورنہ دور جدید سے بہت قبل اُردو شاعری کا دامن کافی وسیع ہوجاتا۔ بعد کی نسلوں نے چند کلیوں ہی پر

قناعت کرلی اور گلشن میں رہ کر علاجِ تنگیٔ داماں کی فکر نہ کی۔ دکن ہو یا شمال ابتدا میں ہر جگہ شعرا نے اپنی عاشقی کی داستانوں میں ایک حصہ بیانیہ شاعری کا بھی ایسا پیش کیا تھا جس میں منظر نگاری، مقامی اثر، عوام کی زندگی، تبلیغی عنصر سبھی حالات جا بجا مل جاتے ہیں لیکن جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا یہ چیزیں کم ہوتی گئیں۔

دکنی شعرا نے لوگوں کے مذہبی رجحان کا اندازہ کرتے ہوئے اپنے کلام کو اشاعتِ مذہب کا بھی ایک آلہ بنایا تھا۔ نرم الفاظ میں اصول دین اور اُس کے فوائد اکثر نظم کرتے رہے۔ میراں جی شاہ اور دوسرے شعرا نے بھی اپنی مثنویوں میں اس موضوع کو کافی جگہ دی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور خاص بات قابل ذکر نظر آتی ہے یعنی اس طرح کی مذہبی نظموں اور دوسری عشقیہ مثنویوں سے بعض شعرا کی نظم گوئی اور تنوع پسندی کا اندازہ ہوتا ہے گویا نظم کے موضوعات مقرر کرکے مسلسل طریقہ پر غیر مادّی اشیا کی خصوصیت پر روشنی ڈالنے کا کافی ملکہ ہو چلا تھا۔ اگر اس رویہ کی طرف دوسرے لوگ بھی توجہ کرتے تو رسمی شاعری کا عنصر بھی کم ہو جاتا اور وسعت و ندرت کا بھی ادب میں اضافہ ہوتا جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بے اعتنائی کا شکار ہوتا رہا اور رفتہ رفتہ گم ہو جانے کے برابر ہو گیا۔ حالانکہ یہ خصوصیت مثنوی کے علاوہ اردو کے اکثر اصناف سخن میں آچکی تھی۔ مرثیہ خواہ اس زمانہ میں مذہبی جوش و انہماک سے وجود میں آیا ہو، لیکن اس میں بھی ادبی نقطۂ نگاہ سے بعض حصے کارآمد نکل آتے ہیں۔ کربلا کے واقعات کو بیان کرنا، مصیبتوں سے لوگوں کا دوچار ہونا، پریشانیوں میں دشمن سے مردانہ وار مقابلہ کرنا یہ سب باتیں اسکا ثبوت دیتی ہیں کہ

غزل سے الگ ہوکر بھی لوگوں نے اپنے رجحانات کا پتہ دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد والوں نے ان خصوصیات کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بہرحال ابتدا میں ادبی رجحانات پر مذہب کا غلبہ صاف نظر آتا ہے چنانچہ مذہب ہی کے سلسلہ میں تصوف کا ذخیرہ بھی اُردو شاعری میں بہت کچھ آگیا۔ ادب کا یہ رجحان اتنا تیز ہوا کہ عرصۂ دراز تک لوگوں نے صوفیانہ شاعری پر طبع آزمائی کرنا اپنا فرض سمجھا۔ غزلوں کی طرح اس میدان میں بھی حقیقی اور اصلی صوفی شعرا کم اُن سے زیادہ تر شعراء نے رسمی عقائد نظم کئے ہیں۔ جو عموماً سطحی اور محدود خیالات پر مبنی ہیں۔ مذہبی جذبات کا اثر تھا کہ ابتداء ہی سے اُردو شاعری میں نعتیہ کلام آنے لگا اور ادب کا یہ رجحان اتنا غالب ہوا کہ ہر شاعر خواہ وہ کسی صنف سخن پر طبع آزمائی کرے، حمدِ خدا، نعتِ رسول، مدحِ آئمہ و بزرگانِ دین سے اپنے کلام کی ابتدا ضرور کرتا تھا یہ رویہ امیر مینائی کے عہد تک اُردو نے قائم رکھا۔ غالباً عزیز کا گلکدہ پہلا دیوان ہے جس میں ان مذہبی خصوصیات سے علیحدگی برتی گئی ہے۔

اُردو شاعری کا یہ رجحان بھی قابل ذکر ہے کہ اس نے فارسی کا اثر اتنا قبول کر لیا تھا کہ قریب قریب ہر بات میں اس کی تقلید اپنا فرض سمجھتی رہی۔ عروض، خیالات، جذبات، طرز، غرضکہ ہر ایک میں فارسی کے نقش قدم پر چلتی رہی تقلید یا ترجمہ کرنا بُرا رجحان نہ تھا۔ بہت کچھ فائدہ اس سے پہنچ سکتا تھا اور پہنچا بھی۔ زیادہ تر تقلید کا پہلو غالب رہا۔ محاورات اور الفاظ کی تبدیلی البتہ کہیں کہیں علیحدگی کا ثبوت دیتی ہے۔ اسی طرح تلفظ اور الفاظ کے معنی بدل کر کبھی کبھی اس نے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے اپنے ماحول کی مطابقت میں کوئی راستہ الگ نہ پیدا

ہو سکا۔ بہرحال عہد قدیم کے اس رجحان کو واضح کرنے کے لئے کہ اس میں ادب کو زندگی سے کچھ تعلق تھا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میر و سودا کے کلام سے لوگوں کی زبون حالی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ گو بیان تشنہ معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی "گھر کا حال" میر نے اپنے گھر کی خستہ حالی کو کس خوبی سے بیان کیا ہے، سودا نے شہر آشوب میں ہجووں میں اور کبھی کبھی قصائد میں بھی بڑی تفصیل اور خوبی کے ساتھ اپنے زمانے اور لوگوں کے حالات نظم کئے ہیں۔ ان سب باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے باکمال شعرائے اپنے رجحانات کو غزل کے دائرے تک محدود نہیں رکھنا چاہا لیکن زمانہ کی بد مذاقی اور غلامانہ ذہنیت کا علاج ہی کیا تھا۔ ع

"ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی"

جب ذہنیت پست ہو جاتی ہے تو تقلید کے علاوہ مشکل ہی سے کوئی نئی چیز بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خلاقی و تحقیق کا ذکر ہی کیا۔ آگے چل کر غزل اور قصیدہ کی اصلی خصوصیات کی طرف بھی نظر کم گئی۔

غزل و قصیدہ کا غلبہ پا جانا کوئی تعجب کی بات بھی نہ تھی۔ اردو شاعری کی ابتدا ہندوستانی زوال کے شباب سے ہوتی ہے۔ سیاسی و اقتصادی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بدامنی، فاقہ مستی، اور سب سے بڑھ کر شیرازہ بندی کی کمی غیر اعتمادی اور پست ہمتی کا ہر طرف زور۔ ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ بزدلی اور بدگمانی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایسے عالم میں زمانہ چاہتا ہے کہ ہم جس حالت میں ہیں اس کا کوئی جواز مل جائے۔ غزل مع اپنے تصوف کے تسکین دینے کے لئے آگے بڑھی۔ غلط قسم کی قناعت، قسمت پر شاکر رہنے کی بیجا تعلیم میں اس کی فرار پسند ذہنیت کو جس بات کی تلاش تھی مل گئی۔

پھر اس کے علاوہ حسن و عشق کی داستان تھوڑی دیر کے لئے افیون کا سکون بہم پہنچانے کے لئے کیا کم تھی۔ ہر شخص کے پہلو میں دل، دل میں اُمنگ اور اُمنگ کے لئے رندی و شاہد بازی کی داستان گلِ مراد سے کم نہ تھی۔ اس سے ہماری مُراد یہ نہیں کہ غزل سرتاپا بیکار یا مضر ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس کے دامن میں وہ جواہر پارے بھرے ہیں جو دوسرے اصنافِ سخن میں مشکل سے ملیں گے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ماحول کی خستہ حالی کا خاکہ کبھی کبھی اس نے بھی پیش کیا ہے۔ اسکی قابلِ قدر مجموعی خصوصیت کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ ہمیں اس کا پورا احساس ہے کہ دنیا بلکہ کائنات کا سب سے قیمتی موتی عشق ہے۔ بغیر اس کے تاجِ انسانیت کا نمایاں ہونا دشوار ہے اس میں بھی شک نہیں کہ ہماری غزل نے اس جوہر کو نہایت خوبی کے ساتھ اہلِ بینش کے سامنے پیش کیا لیکن اوّل تو عشق کے علاوہ دوسرے جذبات کا بیان کم ہوا اور پھر اس ذخیرے میں ایک ایسا عنصر بھی آتا رہا جس نے عشق کی لطافت کو صدمہ پہنچایا۔ بعض اخلاقی پہلو بہت غلط طریقے سے پیش کئے گئے جو ایک گرتی ہوئی قوم کی غفلت شعاری، بے حسی کا سہارا بن گئے۔ مثلاً قسمت پر شاکر رہنے کے لئے آتش نے صوفیانہ انداز میں کہا ہے ؎

قسمت میں جو لکھا ہے وہ آئے گا آپ سے ۔۔۔ پھیلائیے نہ ہاتھ نہ دامن پسارئیے

یا ذوق کے اس شعر کو لے لیجئے کہ ؎

احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا ۔۔۔ کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

اس قسم کا ذخیرہ کافی مل جائے گا۔ زیادہ مثالیں پیش کرنا بیکار ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ جابجا ایسے خیالات بھی ان ہی غزلوں میں آئے جو پیامِ عمل ہو سکتے ہیں۔

مگر ایک گرتی ہوئی قوم ہمیشہ اپنے حسب حال خیالات کو ذریعہ سکون سمجھتی ہے اور اپنی موجودہ حالت و ذہنیت کو جائز و مستحسن سمجھنے کے لئے زیادہ تر اسی تعلیم و نظریہ کو قبول کرتی ہے۔ جو اس کی بے حسی اور خواب آور کیفیت کو نہ چھیڑے۔ بلکہ اگر کسی طرح سے جا یا بیجا مذہب کی آڑ بھی مل سکے تو پھر کیا کہنا۔ چنانچہ اس وقت تک درد کی طرف متوجہ کرنے والے شعرا اپنا اثر نہ ڈال سکے ورنہ کچھ اشعار تو مل ہی جاتے ہیں جو جوش پیدا کرنے کے لئے کافی ہو سکتے تھے۔ مثلاً آتش کے یہاں ایسے اشعار بھی مل جائینگے جن میں جوش، خودداری اور ہمتِ مردانہ سب کچھ ہے مثلاً

کام ہمت سے جوانمرد اگر لیتا ہے — سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

★

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

سودا کے عہد تک اُردو شاعری کا رجحان غالب عشق و حسن کے کارناموں کو نظم کرتا تھا۔ اشعار میں تاثیر، خلوص، جوش، سادگی سب ہی کچھ ہوتا تھا غزل گوئی کے دائرے سے شعرا کبھی کبھی باہر بھی قدم رکھتے تھے۔ اور بیانیہ شاعری پر بھی توجہ کرتے تھے۔ مثنوی، قصیدہ، ہجو، شہر آشوب، واسوخت میں اپنے زمانے کے حالات، قوموں کی پستی و بلندی کا راز۔ تاریخی واقعات، مقامی [illegible] اور تقریب کی اہمیت، اہلکار کی معرکہ آرائی وغیرہ بھی وقتاً فوقتاً [illegible] کرتے رہتے ہیں ان میں سے بعض اجزا کئی لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ اسی زمانہ میں شاعری کا رجحان تصوف کی طرف زیادہ ہوا جس کے زیادہ ذمہ دار میر درد ہیں جنھوں نے اس خوبی سے صوفیانہ شاعری کو اُبھار اکہ معراج کمال پر پہنچا دیا۔ نہ ان کے پہلے نہ ان کے بعد

اس میدان میں ان کا کوئی ثانی پیدا ہو سکا۔ اس دور میں سودا کی محرک قوتوں نے
زمانے کا رجحان ایک اور طرف بھی کر دیا۔ اب سے پہلے آبرو، مظہر جان جاناں کے
یہاں ایک آدھ شعر ایسے مل جاتے تھے جو بزم اردو میں بہت شوخ و تیز ہوتے
تھے۔ مگر یہ شعر محض آپس کی چھیڑ چھاڑ کے لئے یوں ہی کہہ دئے گئے ہوں گے
ان سے زمانہ کا کوئی رجحان نہیں بدلا۔ اور نہ یہ کوئی مستقل تحریک پیدا کر سکے
لیکن سودا نے اردو میں ہجو گوئی اتنی دھوم دھام سے کی کہ ایک زمانہ کو اس سے
دلچسپی ہو گئی اور غضب یہ ہوا کہ سودا نے بڑے بڑے متقی و پاکباز شعرا کو اس
سے دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔ میر ضاحک بھی اس میدان میں آ تر آئے میر فاخر
مکین اور دوسرے ہمعصر شعرا کو بھی اس صنعت میں چار و ناچار طبع آزمائی
کرنی پڑی۔ وجہ یہ تھی کہ سودا ان لوگوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیتے۔ جہاں ذرا کہیں
کسی سے رنجش ہوئی انھوں نے چھیڑنا شروع کر دیا۔ قلم دوات لیکر بیٹھے اور
ہجو لکھنا شروع کر دیا زمان کو دشنام کہاں، بڑے سے بڑے الفاظ میں نکتہ چینی
کرنے جہاں تک کہ فحاشیات سے بھی دریغ نہ فرماتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ جو لوگ انکے
ہجو سے مجروح ہوتے وہ بھی اتفاقاً اسی قسم کے اشعار جواب میں لاتے۔ اس سے
بحث نہیں کہ مقابلہ میں کون کامیاب ہوتا تھا لیکن انجام یہ ہوا کہ یہ تحریک خواص
سے گزر کر عوام تک پہنچی اور ادب میں ایک مکروہ انبار جمع ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہجو کی سطح بہت پست اور بزم ادب کے لئے بڑی
حد تک مضر ثابت ہوئی۔ لیکن ان کانٹوں سے الجھے ہوئے کبھی کبھی ایک آدھ
پھول بھی آ جاتے ہیں۔ یعنی اگر دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو ان ہی ہجوؤں

ہیں تنقیدی عنصر بھی ملتا ہے۔ گو ان کو تنقید کا بدترین پہلو کہا جا سکتا ہے۔ ذاتیات پر بھی حملہ ہے اور کمالات کی بھی نکتہ چینی ہے لیکن ہمعصر کے معائب کم از کم سوداؔ اچھی طرح بیان کر جاتے ہیں ان کے شکار عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جو فرعون بے ساماں یا نالائق ہوتے ہیں۔ لیکن زمانہ کو اپنی ریاکاری سے دھوکے میں رکھ کر اپنے کو اس کے برعکس سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مولوی صاحب زعم میں اپنے کو واقف شرع محمدی سمجھ کر کوے کی حلت یہ جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ سوداؔ کو خبر ہوتی ہے اور مولوی مذکور کے خلاف ایک پرزور نظم کہتے ہیں۔ جس کے ہر بند کا پانچواں مصرع یہ ہے ؎

"اک مسخرہ یہ کہتا ہے کوا حلال ہے"

اس نظم میں جی کھول کر مولوی صاحب کی خبر لی ہے۔ اسی طرح اور بھی ہجویں ہیں جن میں ان شعراء پر اعتراضات کئے ہیں جو فن میں ناقص ہونے کے باوجود مدعی کمال ہیں۔ اس سلسلہ میں اسوقت حیرت ہوتی ہے جب سوداؔ اپنے زمانے کے شعراء کے معائب بیان کرتے کرتے خود اپنے عیوب بھی بلاتکلف بیان کر جاتے ہیں۔

ہجو کی یہ ایک نام نہاد خوبی بھی دوسروں کے یہاں کم ملتی ہے وہاں یا تو اپنے الزامات کی تردید ہوتی ہے یا پھر مدمقابل کو گالیاں۔ کاش یہ صنف سخن بدمذاقی کے ہاتھوں سے نکل کر متانت اور سنجیدگی کے دائرے میں آجاتی تو اردو میں منظوم تنقید کا ایک کارآمد پہلو پیدا ہو جاتا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ کسی نے اسے راہ راست پر لانے کی فکر نہ کی بلکہ آگے چل کر اسکی رہی سہی خوبی بھی جاتی رہی اور انشاؔ و مصحفیؔ کے زمانے میں محض ذاتی و شخصی عیوب کو شعر کے جامہ میں نمایاں کرنے کا ایک

آلہ بن کر رہ گئی اور وہ بھی صرف مخالفت کے لئے۔ بہر حال پست زمانہ میں عوام کے مذاق کو بد سے بدتر بنانے میں اس رجحان نے کافی مدد کی۔

اسی قسم کی شاعری سے ملتی جلتی ایک اور صنف شاعری پیدا ہو گئی جسے ریختی کہتے ہیں اور جسکے موجد سعادت یار خاں رنگین سمجھے جاتے ہیں۔ گویا اس قسم کے خیالات اس سے پہلے دکنی شعرا کے یہاں بھی بھولے بھٹکے مل جاتے ہیں[5]۔ لیکن شمال میں سعادت یار خاں رنگین نے اس طرف زیادہ توجہ کی اور یہ سہرا ان ہی کے سر سمجھا جاتا ہے۔ موجد کی تحقیق فی الحال ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے لہٰذا ہم اس بحث سے آگے بڑھ کر اسکی خصوصیت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

اس صنف میں غزل کے انداز بیان کے برعکس اظہار جذبات عورتوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ زبان بھی عورتوں ہی کی ہوتی ہے اور لہجہ بھی۔ اضافت و ثقیل الفاظ سے گریز کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ عورتوں میں یہی انداز بیان رائج ہے۔ جذبات و خیالات عموماً پست ہوتے ہیں مذاق بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اردو شاعری کو اس ریختی سے بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا بلکہ غیر فطری لہجہ کا بھی اردو کو متحمل ہونا پڑا۔ جذبات و الفاظ عورتوں کے ہوتے ہیں مگر ناظم مرد ہوتا ہے اس وجہ سے مذاق سلیم کے لئے یہ صنف کبھی ناخوشگوار ثابت ہوئی گو اس قسم کی شاعری کو کبھی فروغ نہیں ہوا لیکن کم بخت اتنی سخت جان ثابت ہوئی کہ آج تک بھلے برے جئے جا رہی ہے۔

ہجو اور ریختی دونوں اصناف کا وجود درباداری کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے

---

[5] اردو شہ پارے ۱۲

فریقین نے امراء کی خوشنودیٔ مزاج اور اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے مدمقابل کے معائب بیان کرنا اختیار کیا تاکہ فضیلت حاصل ہو اور دوسرا فریق رئیس کی نظروں میں ذلیل و خوار رہے۔ ذہنیت کی پستی اور زمانہ کی بدمذاقی نے عمدہ تخئیل و دلکش انداز بیان، جدّت و قدرت، فن کاری وغیرہ کی قابل قدر خصوصیات کو مقابلہ میں لانے کے بجائے خاندانی کمزوریاں، ذاتی عیوب شکل و صورت کی خرابیوں کو نمایاں کرنے کا نام جوش طبیعت و زور کمال سمجھا اور اس تنگ نظری کے طرز ادا کا نام ہجو رکھ دیا۔ ریختی بھی تفریح طبع کا ذریعہ سمجھ کر رؤسا کی خدمت میں پیش کی گئی نہ اس کے اشعار سمجھنے میں ذہن پر بار پڑا نہ غور کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑی۔ بلکہ عورت کے حرکات و سکنات لب و لہجہ کی جھلک پاکر جذبۂ تعیش نے کہا ہوگا۔ ع۔

"اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری"

یہ صنف ایک مخصوص دائرے کی چیز سمجھی گئی۔ ادب عالیہ میں کبھی اس کا شمار نہیں ہوسکا ریختی کے حرم میں ہم کو کوئی خوبی نظر نہیں آتی بجز اس کے کہ عورتوں کے مخصوص الفاظ و محاورے، لب و لہجہ کا کچھ اندازہ ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ فائدہ کسی اور طرح پر اور اس سے زیادہ پہنچایا جاسکتا تھا اور غالباً اس نیت سے یہ چیز لائی بھی نہ گئی ہوگی۔ ہاں اگر اس میں متانت و سنجیدگی اور خلوص کے عناصر آجاتے تو بڑے کام کی چیز ہوجاتی۔ عورتوں کی زبان سے ان کے حقیقی و لطیف جذبات بھی ادب میں آجاتے جن کی اس وقت تک غزلوں میں بڑی کمی معلوم ہوتی ہے۔ وہ سنگدل، سفّاک،

جنگجو، جفا شعار، پُر فریب اور اسی طرح کے دوسرے اوصاف سے متصف دکھائی گئی ہیں۔ اگر اپنی داستان خود بیان کرتیں یا ان کے جذبات اپنے اوپر طاری کرکے کوئی اور بھی واردات قلب بیان کرتا تو تصویر کا دوسرا رُخ بھی ادب کے آئینہ میں نظر آتا۔

اس عہد تک ایک اور خاص رجحان نظر آتا ہے۔ یعنی قصیدہ گوئی اور اس کے اقتدار کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ جو اس صنف میں کمال نہیں رکھتا تھا وہ بڑا شاعر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہر شاعر قصیدہ کہنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ عموماً فارسی کے بہترین قصیدہ گو شعراء کا تتبع باعثِ فخر سمجھا گیا۔ انھیں کے انداز بیان شکوہ الفاظ، جوش، دقت پسندی، تشبیب اور حسن التخلص کو نصب العین قرار دیا گیا۔ اُردو میں عموماً قصیدے اُمراء، نوابوں اور بزرگان دین کی مدح میں کہے گئے لوگوں کا عام رجحان مدح میں مبالغہ سے کام لینا تھا۔ اس صنف شاعری میں سب سے بلند پایہ شاعر مسلمہ طور پر سودا سمجھے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس باکمال شاعر کے قصائد کے لطیف دکارآمد اجزاء پر ذرا سمجھ کر دوربینی سے نظر ڈالی گئی ہوتی تو بڑی خوبیاں اور مفید چیزیں اُردو شاعری کو ہاتھ آجاتیں۔ ہمارا مطلب سودا کی تشبیبوں سے ہے۔ جن میں منظر نگاری، حکیمانہ نکات، علمی مسائل، رموزِ حیات وغیرہ بڑے مزے میں شاعرانہ انداز کے ساتھ جگہ پاتے ہیں۔ ان اجزاء کو اگر زیادہ اُبھار کر دوسرے شعراء پیش کرتے رہتے تو ہماری شاعری میں مسلسل دکارآمد نظموں کے علاوہ متنوع مضامین، بلند و پاکیزہ خیالات کا بیش بہا ذخیرہ اکٹھا ہو جاتا۔ بعد والوں نے وہ خصوصیات بھی قائم نہ رکھیں جو سودا کے یہاں پید

ہوگئی تھیں۔ تشبیب میں نہ شگفتگی رہ گئی نہ تنوّع، فطری منظر نگاری جو ابتدا میں آ گئی تھی وہ بھی تصنّع و رنگینی کی نذر ہوگئی۔ الفاظ سے کھیلنے کا شوق بڑھتا گیا ذوق و غالب کے زمانے تک کسی قدر ندرت پسندی و تنوع مضامین پر توجہ رہی، لیکن سودا کے کارناموں پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ ذرا اور آگے چل کر مبالغہ اور قافیہ پیمائی قصیدہ کے پر پرواز بن گئے۔ ممدوح کے گھر کی تفصیل اور اس کے معمولی سے معمولی کارناموں کی تعریف پیش کرنا قصیدہ نگاری کا ضروری جزو ہو گیا کردار نگاری اور واقعہ نگاری کا روز بروز فقدان ہوتا گیا۔

دنیوی ممدوح کی عظمت جیسے جیسے کم ہوتی گئی، مدّاح کا بھی پایہ گرتا گیا۔ قصیدہ کی فضا تیزی کے ساتھ بدل رہی تھی۔ صلہ کی امیدیں مایوسیوں سے ہمکنار ہو چلی تھیں۔ اضمحلال و تنگ دستی و کس مپرسی کا ذہنیت پر غلبہ تھا۔ طبیعت میں جوش، خیال میں اُبھار، دلوں میں شگفتگی قصیدہ گوئی کے لئے ضروری ہیں۔ وہ سب سیاسی و اقتصادی انقلابات میں ختم ہوتے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کی قصیدہ گوئی کا جواب اُردو میں ہونا تو کیا معنی خود سودا کے کلام کا جواب بعد والے نہ پیدا کر سکے۔

غزل کی ابتدا آپ دیکھ چکے ہیں کہ کس زمانہ میں ہوئی اس میں قنوطیت کا پیدا ہو جانا بالکل فطری تھا اس سے امنگ اور جوش و خروش کی توقع کرنا ماحول سے بے خبر ہونے کی بیّن دلیل ہے مختلف انقلابات جو سماج اور ذہنیت پر چوٹ لگا رہے تھے ان کا پورا نقشہ غزلوں میں نظر آتا ہے۔ اس نے اپنے اور ہمسایوں کے غم غلط کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بذاتہ اتنا بُرا نہ تھا جتنا بنا دیا گیا تھا۔ آپ بیتی میں جگ بیتی کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ میر کو اس کا خاص ملکہ ہے۔

قلی قطب شاہ اور ولی کے وقت سے لیکر میر کے پہلے تک غزل میں اتنی قنوطیت نہیں نظر آتی جو میر کے یہاں ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں ان کی ذاتی پژمردگی کا عنصر زیادہ ہو لیکن پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی فضا میں قنوطیت برس پڑی۔ اور غزل اس فضا کی ترجمان ہوگئی۔

فائز، ولی، مظہر جان جاناں، حاتم وغیرہ کا نظریۂ عشق ایک ہی ہے۔ بیان و زبان میں کسی قدر فرق ہو جاتا ہے۔ داخلی پہلو پر زیادہ زور ہے الفاظ ہندی کے بھی آتے ہیں۔ سادگی و تاثیر مدنظر ہے۔ جذبات خلوص پر مبنی ہیں۔ عموماً سنجیدگی و درد تمام غزلوں میں نمایاں ہیں۔ میر نے ان عناصر کو اور زیادہ کر دیا۔ تاثیر و سادگی اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ تصوف شروع سے غزل میں آرہا تھا۔ میر، سودا، درد کے عہد تک آتے آتے چار چاند لگ گئے۔ سودا نے لب و لہجہ کی بلندی پر بھی کافی توجہ کی غزل کی سطح پہلے سے بہت بلند ہوگئی لیکن دور متوسط میں زبان و الفاظ کی تراش و خراش پر زیادہ زور رہا۔ خیالات و موضوعات پر علاوہ غالب کے کسی نے خاص توجہ نہ کی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عہد قدیم میں ہندی کا اثر نسبتاً زیادہ ہے۔ الفاظ بھی ہندی کے آتے ہیں اور جذبات و رسوم بھی اور علاوہ اس کے زبان کو آزاد رکھنے کا بھی خیال ہے۔ قافیہ میں زیادہ سختی نہیں، گھوڑا، موڑا، گورا، سب ہم قافیہ سمجھے جاتے تھے۔ اکثر غزلیں بھی بے ردیف ہوتی تھیں۔ الفاظ کا املا بھی صوتی اصول پر تھا۔ مثلاً تسبیح کو "تسبی" صحیح کو "سہی" بگانہ کو" بگانہ کو"[۱] لیکن بعد والوں نے ان سب باتوں کو

---

[۱] آبحیات صفحہ ۹۰

عیب سمجھ کر ترک کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ دورِ متوسط میں ہندی الفاظ کی جگہ بھی فارسی و عربی لفظوں نے لے لی۔ املا بھی صوتی لحاظ سے ہٹ کر قواعد و لغت کے اعتبار سے لکھا جانے لگا۔ اپنے نزدیک ان لوگوں نے ناہمواری دور کرنے کی کوشش کی مگر اس فکر میں مقامی اثر و آزادی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور اُردو کی انفرادیت بھی خطرہ میں آگئی۔

بعد میں جرأتؔ و انشاؔ کی وجہ سے غزل کے رجحان میں یہ تبدیلی ہوئی کہ بجائے متانت و بلندیٔ تخئیل کے چھیڑ چھاڑ اور شوخی زیادہ آگئی۔ قنوطیت کم ہوئی مگر کیف و دیرپا اثرات کو صدمہ پہنچا۔ زبان و مذاق کی بلند ہوتی ہوئی سطح کو کسی قدر نیچے آنا پڑا۔ داخلی پہلو کے بجائے خارجی پہلو زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ یہ مذاق کی تبدیلی کبھی کم کبھی زیادہ یونہی اپنا کام کرتی رہی یہاں تک کہ دہلی میں مرزا غالبؔ کا زمانہ آگیا۔ اس باکمال و دور اندیش شاعر نے بڑی صناعی و خلاقی دکھائی۔ اپنے زورِ علم تخئیل، فن کاری، و نادر معلومات کو ایک جگہ جمع کر کے ایسی ذہانت سے کام لیا کہ اُردو کے مذاق و متانت و تخئیل کی سطح کو ہمیشہ سے زیادہ بلند کر دیا۔ علاوہ تغزل و معنی آفرینی کے فلسفیانہ مضامین سے غزل میں تنوع پیدا کر دیا۔ زمانہ کی بدمذاقی اور پست ذہنیت نے غالبؔ کے اس قابل قدر فعل کو ادبی بغاوت تصور کیا۔ کبھی مذاق اڑایا۔ کبھی حقارت کی نظروں سے کلام پر نکتہ چینی کی کبھی سرقہ و کم علمی کا الزام بھی دیا۔ لیکن یہ ہمّت کا دھنی پہاڑ بن کر اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور بالآخر زمانہ کے رجحان کو بدل کر اطمینان کی سانس لی۔ غالبؔ کی زندگی میں زمانہ نے انکے نقوش کا اثر دیر میں لیا مگر موجودہ دور آتے آتے ان کا اثر اتنا تیز و موثر ثابت

ہوا کہ پورے دور کی ذہنیت ان ہی کے اثر کی رہین منت ہے۔
اب غزل میں سامنے کے مضامین سے آگے بڑھ کر گہری باتیں بھی شعراء لانے لگے۔ میر کی طرح آپ بیتی کو اس انداز میں بیان کرنے کی کوشش ہونے لگی کہ جگ بیتی کا اثر پیدا ہوجائے۔ مضامین کی ہمہ گیری پر کافی توجہ ہونے لگی مومن نے بھی عاشقانہ انداز میں اونچی باتیں کامیابی کے ساتھ پیش کیں۔ داخلی پہلو کو پھر فروغ ہونے لگا۔ ذوق نے اخلاقی مضامین اور پاکیزہ خیالات کیطرف لوگوں کے رجحان کو پھیرنا شروع کردیا۔
غالب کے انداز بیان کا اثر شیفتہ و حالی پر براہ راست پڑا۔ ان لوگوں کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ مبالغہ و عامیانہ جذبات سے اُردو غزل کو محفوظ رکھا جائے چنانچہ حالی نے اپنی تھوڑی سی ابتدائی غزلوں میں میر کے درد، غالب کے انداز بیان اور شیفتہ کی سادگی اور سچائی کو یکجا کردیا۔ غالب کا اثر اپنے ہمچشموں یا نوجوانوں پر سستی، مگر استقلال کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھا۔ لیکن جو لوگ سن میں ان سے زیادہ تھے اور اپنے رنگ میں پختہ ہوچکے تھے۔ ان کے مذاق کا تبدیل ہونا مشکل تھا۔ شاہ نصیر آتش، ناسخ، آباد وغیرہ ایک ایسے اسکول سے تعلق رکھتے تھے جو خارجی پہلو، الفاظ کے اُلٹ پھیر اور سامنے کی باتوں سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اس اسکول کا رجحان مبالغہ، رعایت لفظی، اور سنگلاخ زمین، قافیہ پیمائی کی طرف زیادہ رہا۔ اس دور کے شعراء نے زبان کی صفائی الفاظ کی نشست، تراش و خراش قواعد پر زیادہ دھیان رکھا۔ اُردو کی یہ خدمت بھی ادب کے سنوارنے کے لئے ایک اہم خدمت تھی۔ کیونکہ اردو ادب اتنی ترقی کرچکا تھا کہ بغیر خس و خاشاک

کے صاف کئے ہوئے ترقی کی طرف ادب کا قدم آسانی سے نہ اُٹھ سکتا۔ زبان کے لئے معیار و مرکز کا قائم ہوجانا ضروری تھا اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ ایک دوسرے نقطۂ نظر سے زبان کا مرکز قائم ہونا نقصان دہ بھی ہوتا ہے کیونکہ پابندیاں بڑھتی ہیں۔ اور عام طور پر یہ پابندیاں خیال اور معنی میں نہیں، زبان اور محاورہ کے استعمال میں ہوتی ہیں۔ اس لئے خیال سے ہٹ کر ساری توجہ زبان کی جانب ہوجاتی ہے چنانچہ یہ چیز صرف خطرہ کی حیثیت سے نہ رہی بلکہ واقعی اُردو ادب کے ایک بہت بڑے حصہ پر حاوی ہوگئی۔

اس دور میں لوگوں کا رجحان زیادہ تر ادب کے ظاہری خد و خال پر رہا۔ الفاظ و قوافی سے کھیلنے میں زیادہ مسرت ہوئی۔ خارجی عنصر کے نظم کرنے میں ایک خاص لطف آیا۔ شعر میں تخئیل کی بلند پردازی کم ہوگئی۔ بال کی کھال نکالنے کو مضمون آفرینی و باریک بینی سمجھا گیا۔ تشبیہات و استعارات زیادہ صرف کئے گئے مگر ان میں تنوع کم تھا۔ محدود و مخصوص دائرے کی چیزیں آتی رہیں۔ ان کے اسباب ہم کو امیرانہ اور جاگیردارانہ طرز زندگی میں تلاش کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس وقت ادب عوام سے نہیں اُمراء اور درباروں سے تعلق رکھتا تھا۔ اور جو ظاہرداریاں، جو نزاکتیں اس امیرانہ زندگی میں تھیں اُنھوں نے ادب میں بھی دخل پالیا۔

اس میں شک نہیں کہ روزمرہ کے عاشقانہ جذبات، خارجی عناصر بھی اُردو کی وسعت کا باعث ہوسکتے تھے اور ایک حد تک ہوئے بھی، لیکن یہ رویہ اعتدال سے زیادہ بڑھ گیا۔ معنویت کی طرف اتنی توجہ نہ کی گئی جس کی مستحق تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ میر کی پیدا کی ہوئی فضا سے جو قنوطیت و پژمردگی اُردو کی دنیا میں آگئی تھی

وہ کم ہو چلی۔ یعنی اس زمانہ میں غم آمیز جذبات و یاس آفریں خیالات کی جگہ
ظاہری مسرت و رنگینیٔ بیان نے لے لی اور حالات بھی بدل گئے بُرا یہ ہوا
کہ تاثیر غزلوں میں کم ہو گئی۔ غالباً اس نتیجہ کا مرتب ہونا فطری تھا۔ میرؔ و سوداؔ
کے زمانے میں ہر طرح کی مصیبت دلّی پر رہی۔ ان کی آنکھوں نے اپنے سامنے
بہار لٹتی دیکھی تھی۔ لکھنؤ میں جہاں عیش و آرام کی گنگا بہہ رہی تھی وہاں بھی میرؔ
اپنے انداز بیان کو کیسے بدلتے۔ انھوں نے دہلی کے تلخ تجربوں کو یاد کرکے جی
میں کہا ہوگا ؎

قبائے لالہ و گل میں جھلک رہی تھی خزاں
بھری بہار میں رویا کیے بہار کو ہم

بہرحال لکھنؤ اور دہلی کی دنیا میں اتنا اقتصادی و معاشرتی فرق ہو گیا تھا
کہ آتشؔ و ناسخؔ وغیرہ کو شادمانی کا عنصر لانا ضروری تھا۔ وہ اپنے ماحول سے متاثر
ہو رہے تھے۔ دربار کی رنگینی و تعیّش سے اثر پذیر نہ ہونا نا ممکن تھا۔ وقتی محبت
کا اظہار، دو بدو حسینوں سے گفتگو کر لینا اور خوش ہو لینا نوابوں اور بادشاہوں کے
یہاں کی معمولی باتیں ہیں۔ اس قسم کی چہل پہل کا اس وقت شاعری میں آجانا
فطری تھا۔ اہل دربار اور دربار سے توسل رکھنے والوں کا ایسا ہی رجحان ہو جانا
بعید نہ تھا اور نہ اس پر تعجب کرنا چاہیے۔

اس دور کا عام رجحان قصیدہ گوئی کی طرف سے کچھ الگ ہو گیا ہے، غزلیں
بڑی لمبی ہوتی ہیں۔ مثنوی کی طرف توجہ زیادہ تو نہیں مگر بے اعتنائی بھی نہیں برتی
گئی۔ بہت سے شعرا نے طبع آزمائی کی مگر اس دور میں اس صنف میں سب سے زیادہ

نام پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم لکھ کر پیدا کیا۔ جو علاوہ اور خصوصیات کے رنگینی بیان رعایت لفظی واختصار کی نہایت لطیف مثال ہے اور یہ اس زمانہ کا عام مذاق تھا۔

اس سلسلہ میں اس کا ذکر غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس زمانہ میں استادی وشاگردی کا مرض بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ مشاعروں میں شاگردوں کی پوری پوری فوجیں اپنے استادوں کے ساتھ معرکہ آرائی کے لئے جاتیں اور اپنے ساتھیوں کے کلام پر تحسین وآفرین کے نعرے بلند کرتیں۔ کبھی کبھی یہ نوک جھونک اتنی بڑھ جاتی کہ بڑے فساد کا احتمال ہوتا۔ ہمارے نزدیک اس بدعت کے موجد انشا ومصحفی ہیں جن کا اثر عرصہ تک اردو شاعری کی فضا پر چھایا رہا۔ بہرحال یہ مذاق بھی اپنی جگہ پر ایک پُر لطف چیز ہے کہ اس زمانہ میں استادوں کا شاگرد اور شاگردوں کو استاد بنانے کا خبط تھا۔ اور جتنا ذوق اس عہد میں مشاعروں کا ہوا شاید اس سے پہلے کبھی اور کسی زمانہ میں نہ تھا۔

اس دور کی مجموعی خصوصیات کا اچھا یا بُرا جو کچھ بھی مذاق وادب پر اثر پڑا۔ اس کی بحث سے الگ ہو کر ہم اتنا ضرور دیکھتے ہیں کہ عاشقانہ جذبات کے عام کرنے سے اُردو کی اشاعت میں بہت زیادہ مدد ملی۔ ہر شخص اُردو اشعار سے دلچسپی لینے لگا۔ اردو غزل ہر صحبت کی زینت سمجھی جانے لگی۔ اشعار کا یاد ہونا، اس سے حظ اٹھانا۔ اس پر رائے زنی کرنا۔ اس کے متعلق گفتگو، علم مجلس کا ایک جزو خاص بن گیا۔

اس دور نے ایک ایسی گرانمایہ چیز کو معراج کمال پر پہنچایا جس کی مثال اُردو وفارسی کیا دنیا کی کسی اور زبان میں مشکل سے ملے گی۔ مرثیہ گوئی نے نہ صرف لوگوں

کے مذاق کو شائستہ و پاکیزہ بنادیا بلکہ اُردو ادب میں ایک بیش بہا صنف کا اضافہ کردیا۔
اس کے آتے ہی اُردو شاعری نے فارسی و ہندی ادب کی طرف پہلی بار آنکھ اُٹھا کر
آزادانہ دیکھا کہ میں نے بھی ایک ایسی راہ پیدا کرلی ہے جو تقلیدی و رسمی دنیا
سے الگ ہے گویا اس نے یہ بتادیا کہ اب مجھ میں وہ صلاحیت آگئی ہے کہ
میں اپنی دنیا آپ پیدا کرسکوں۔ مرثیہ نے لوگوں کے سامنے موضوع شاعری کے
ایسے ایسے ٹکڑے پیش کئے کہ ہماری شاعری مالا مال ہوگئی۔ اس صنف شاعری
پر تنقید ہمارے دائرے سے باہر ہے اس لئے اس کی خوبیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے
صرف اس پہلو پر غور کرنا ہے کہ مرثیہ سے لوگوں کے رجحانات پر کیا اثر پڑا۔

اب تک حسن و عشق کی دنیا سے الگ ہوکر اردو شاعری نے بات نہ کی تھی۔
اس سے دلچسپی رکھنے والے والہانہ جذبات سے سرشار تھے مرثیہ نے تقدس
شجاعت، قومی ایثار، کے جذبات دلکش انداز میں بیان کرکے ایک نئی دنیا کا خاکہ
سامنے کردیا۔ لوگوں کو یہ بھی بتادیا کہ باپ، بیٹے، ماں، بہن، بھائی، بھانجے کس
طرح ایک دوسرے سے انس رکھتے ہیں۔ آدابِ گفتگو نشست و برخاست کے
انداز ذہن نشین کراکے تمدنی زندگی پر اثر ڈالنے کی کوشش کی۔

آتش و ناسخ کے دور میں جو سوز و گداز کم ہوگیا تھا۔ اس کی تلافی مرثیوں نے
کردی۔ واقعۂ کربلا اپنی جگہ پر خود بہت زیادہ دردناک تھا اور پھر انیس کا ایسا
خدائے سخن نظم کرے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سوز و گداز کس قدر زیادہ اور پُراثر ہوگئے
ہوں گے۔ مرثیہ نے اپنے شباب میں اس قدر لوگوں کو گرویدہ کیا کہ میر انیس
و مرزا دبیر کی مجلسوں میں گھنٹوں پہلے جانے والوں کو جگہ آسانی سے نہیں ملتی تھی۔

اس کی پسندیدگی عام ہوگئی تھی۔ مرثیہ گوئی نے اُردو شاعری کے رجحان کو سادگی، صفائی تاثیر کی طرف مائل کردیا۔

انیس و دبیر نے رباعی پر بھی خاص توجہ کی اور اس خوبی سے اس صنف سخن کو اُبھارا کہ لوگوں کی نظریں پھر اس پر پڑنے لگیں۔ یہ رباعیاں عموماً مرثیہ سے متعلق ہوتیں۔ جس میں اخلاقی و مذہبی جذبات غالب تھے۔ اس وقت عقیدت مندی کا بھی زور تھا اس وجہ سے اور زیادہ لوگوں نے دلچسپی لی۔ رباعیات نے اخلاق پر کافی اثر ڈالا جس کو غیر شعوری طور پر غزل نے بھی قبول کیا۔

ذہنی و معنوی اثرات کے بعد اس کا بھی ذکر کردینا ضروری ہے کہ یہ صرف مرثیہ کا اثر تھا کہ مسدس کی شکل اس قدر ہردلعزیز ہوگئی۔ انیس و دبیر نے اپنے کلام کو مسدس میں اتنے موثر انداز میں پیش کیا تھا کہ بیانیہ شاعری کے لئے یہی صورت آنے والی نسلوں کو بہترین معلوم ہوئی۔ چنانچہ دور جدید کے اکثر سربرآوردہ شعرا آزاد۔ حالی۔ اقبال۔ چکبست وغیرہ نے اپنے پیامات زمانے تک پہنچانے کے لئے مسدس ہی کا انتخاب کیا۔

مرثیہ گوئی کے دور میں اُردو شاعری کا رجحان بہترین راستے پر آگیا تھا۔ اسکی توجہ رزم بزم دونوں پہلوؤں پر تھی۔ رزم کے میدان میں فوجوں کا جمع ہونا تلوار کا چلنا، نیزوں کا چمکنا۔ گھوڑوں کی نقل و حرکت، فوجوں کا بھاگنا، دشمن کے لشکر میں گھر کر لڑنا۔ ان سب مناظر پر اُردو کی نظر انتخاب نہایت عمدہ موقع سے پڑی تھی۔ بزم کی داستان اس سے زیادہ پسندیدہ تھی، اب تک ہماری شاعری کا رجحان صرف عشق و عاشقی کے واقعات تک محدود تھا۔ مرثیہ کے اس شان سے وجود

میں آنے سے اس کے مذاق میں تنوع پیدا ہوا۔ مختلف اشخاص کے جذبات سے مانوس ہونے کا موقع ملا۔ اور قصیدے میں بھی گھوڑے وغیرہ کی تعریف کے سلسلہ میں کسی قدر اعتدال آگیا جس کا ثبوت امیر۔ داغ وغیرہ کے یہاں ملتا ہے۔

منظر نگاری میں بھی جو حصّے اس وقت اردو شاعری نے منتخب کئے وہ نہایت پُر لطف اور کارآمد تھے۔ صبح و شام کی خوشگوار فضا، رات کا سناٹا۔ دریا کا موجیں مارنا۔ صحرا کا تپنا۔ ریت کا اڑنا۔ علم کے پھریرے کا ہوا میں لہرانا۔ لشکریوں کا اسلحہ درست کرنا، آپس میں فن جنگ کی گفتگو کرنا، یہ ایسے مناظر تھے کہ دنیا کے ہر ادب کے لئے مایۂ ناز ہوسکتے ہیں۔

افسوس کہ دورِ انحطاط میں اردو اپنے اس مذاق کو بھی زیادہ آگے نہ بڑھا سکی۔ میر انیس و مرزا دبیر کے عزیزوں کے علاوہ بہت کم لوگوں نے اس میدان میں آنے کی ہمت کی۔ جن لوگوں نے خواہ وہ خاندان کے ہوں یا کہیں اور کے، توجہ کی بھی تو کوئی ترقی نہ دے سکے۔ کوتاہ بیں زمانے نے مذہبی چیز سمجھ کر جواہر پاروں کو نظر انداز کر دیا کسی کو بھی توفیق نہ ہوئی کہ ان اجزا کو نمونہ بنا کر مستقل موضوع قرار دیتا اور مذہب سے ـــــ اگر مذہب اس راستہ میں سدِ راہ ہوتا تو ـــــ ادبی حصّے کو چھین کر ترقی دیتا اور اپنا کر لیتا۔

اس دور کے بعد بھی اُردو کا رجحان غزل قصیدہ، مثنوی کی طرف ویسا ہی رہا جیسا اس سے پہلے تھا۔ کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ضمنی طور پر دو ایک طرف اور ہماری شاعری نے قدم اٹھانے کی کوشش کی، مگر زمانہ کا رنگ دیکھ کر پھر اپنی جگہ آگئی۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں "سبھا" کا وجود ہوا۔ یہ ڈرامائی شاعری

کا جزو تھا۔ امانت اور مداری لال وغیرہ نے اس صنف کی طرف خاص توجہ کی اور زمانہ متاثر بھی ہوا کافی دلچسپی لینے لگا۔ مگر غالباً ادبی پہلو کے خیالات سے نہیں بلکہ تماشا سمجھ کر۔ اگر اس کے موجد اپنا معیار بلند اور اعلیٰ رکھتے تو ممکن تھا کہ لوگ ادب کے ساتھ تفریحی مشغلہ کے موقع پر کچھ اس صنف کے بڑھانے کی کوشش کرتے اور آج ہمارے یہاں ڈرامے کا ذخیرہ کافی اور شاید اچھا بھی ہوتا مگر بقول سروری[۵۱] صاحب "یہ بھائیں شاعری کا اعلیٰ نمونہ نہ تھیں۔" واسوخت کے متعلق بھی ہم صرف جدید اردو شاعری کے ایک اقتباس پر اکتفا کرنا کافی اور مناسب سمجھتے ہیں: "واسوخت[۵۲] کے موجدوں نے ریختی گویوں کی طرح اس کی بنیاد ہی ایسے زود فنا جذبات پر رکھی تھی کہ جلد ہی یہ صنف متروک ہوگئی اور اب صرف تاریخ ادبیات کی زینت ہے۔"

واجد علی شاہ کے بعد اردو شاعری کا مرکز لکھنؤ بھی نہ رہ سکا۔ جہاں جس کو ٹھکانا ملا چلا گیا۔ کوئی ستر سال تک یہ شہر مسلسل اردو ادب کی خدمت کرتا رہا۔ اس کے بعد رام پور نے کوشش کی کہ ادبی حیثیت سے دہلی اور لکھنؤ کا جانشین ہو جائے کافی تعداد میں شعرا یہاں پہنچے بھی لیکن وہ اہمیت نہ حاصل ہو سکی۔ ان میں غالب داغ۔ آسیر۔ جلال۔ آسیر۔ منیر۔ قلق۔ تسلیم اور بحر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دہلی اور لکھنؤ کے تباہ ہوجانے کے بعد ان اسکولوں کی خصوصیات مستقل طور پر لوگوں کو نظر آنے لگی تھیں۔ دہلی اسکول میں سادگی و تاثیر و خلوص کا غلبہ تھا۔ داخلی پہلو پر زیادہ توجہ تھی۔ لکھنؤ اسکول کی خصوصیات میں رنگینی۔ مبالغہ۔ صناعی

---

۵۱ جدید اردو شاعری صفحہ ۶۳ ۵۲ جدید اردو شاعری صفحہ ۶۲

صفائی کا زیادہ زور تھا۔ اس اسکول نے خارجی پہلو پر زیادہ نظر رکھی۔ الفاظ و محاورات کو درست کرنے میں اپنی قابلیت زیادہ صرف کی۔ اُردو نے اس افراط و تفریط کو جادۂ اعتدال پر لانے کی کوشش رام پور میں کی اب اس کا رجحان یہ ہوا کہ داخلی و خارجی دونوں پہلوؤں پر دھیان دیا جائے۔ طرز بیان اور زبان کی صفائی میں تاثیر و خلوص بھی شامل ہو جائیں۔ یہ کوشش ایک حد تک کامیاب بھی ہوئی مگر سست رفتاری سے۔

داغ اور امیر مینائی دلی اور لکھنؤ کے رنگ میں شاعری کر رہے تھے، اور دونوں ایک دوسرے سے اثر لے رہے تھے اور دونوں اس دور انحطاط میں جب کہ زندگی کی نئی کشمکش شروع ہو چکی تھی درباروں سے وابستہ ہونے کی وجہ سے محاورات انداز بیان، تراکیب پر زور دے رہے تھے۔ یہ لوگ کبھی کبھی جادۂ اعتدال سے بھی ہٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، امیر کے یہاں کچھ بنوٹ زیادہ ہے اس لئے تاثیر حسب دلخواہ پیدا نہ ہو سکی حسن قبول کے لحاظ سے داغ، امیر پر سبقت لے گئے جس کی خاص وجہ شوخی اور تیکھا پن کے علاوہ ان کی فن کاری میں نہاں ہے۔

رام پور زیادہ دنوں تک شعرا کی سرپرستی نہ کر سکا، مجمع منتشر ہو گیا۔ داغ حیدر آباد چلے گئے۔ امیر نے بھی کچھ دنوں بعد اسی دیار کا رخ کیا۔ مگر شاعری کا جو مذاق یہاں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ برابر اپنا اثر کم و بیش کرتا رہا۔ آتش و ناسخ کے شاگرد اپنے استادوں کے رنگ میں اتنا رنگ چکے تھے کہ ابھی تک وہ پرانی ڈگر پر چل رہے تھے۔ ان کے مذاق میں شاید کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

غزل کا اب بھی غلبہ تھا۔ قصیدہ و مثنوی دونوں کی توجہ تھی۔ قصیدہ پر زیادہ

مثنوی پر کم۔ داغ و امیر دونوں نے متعدد قصیدے کہے مگر اس معرکہ میں امیر کو داغ پر فوقیت حاصل تھی۔ کیونکہ امیر فطرتاً خارجیت پسند تھے۔

ادبی دور کی تقسیم کے اعتبار سے ہم اس مقام پر آگئے ہیں جو قدیم اور جدید اردو شاعری کا سنگم ہے۔ جہاں پرانی شاعری کے سربرآوردہ شعرا نئی شاعری کے علمبرداروں سے مل رہے ہیں۔ آزاد و حالی، امیر و داغ کا احترام کرتے ہوئے اپنی عمارتوں کے نقشے مرتب کر رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ ہم کسی طرح آپ کی منقصت گوارا نہیں کر سکتے۔ آپ کے کارنامے کبھی بھلا نہیں سکتے۔ صرف زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے اردو شاعری کا دائرہ وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ حسن و عشق کی منزلیں طے ہو چکی ہوں یا ابھی باقی ہوں ادب کو وطن کی بیداری کے لئے صور بنانے کی اجازت دیجئے۔

قدیم شاعری کے رجحانات کو مختصر طور پر ایک جگہ بیان کر دینا غالباً نامناسب نہ ہوگا۔

ابتدائے آفرینش سے اس شاعری کا رجحان عاشقانہ رہا۔ غزل اس کا خاص آلہ کار تھی۔ قصیدہ، مثنوی، واسوخت جو کچھ بھی کہے گئے زیادہ تر عشقیہ انداز میں جذبات خیالات، عروض، طرز بیان میں فارسی کی تقلید کو اردو شاعری ضروری سمجھتی رہی۔ اور اپنے علمی و ادبی خزانہ کو فارسی کے ذخیرہ سے بڑھاتی رہی۔

مذہبی رجحان کی وجہ سے مرثیہ کا وجود ہوا لیکن ابتدا ہی سے ادب کا پہلو لئے ہوئے۔ انیس و دبیر کے زمانہ میں مرثیہ ایک خاص جزو ادب بن گیا جو اردو کو فارسی کی تقلیدی ذہنیت سے علیحدہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

مذہب کی طرف ابتدا سے توجہ رہی۔ تصوف وغیرہ کا ذخیرہ اسی تحت میں آگیا۔ ادب کا ذخیرہ مقدار کے اعتبار سے کچھ وسیع بھی ہوگیا۔ اور مذہبی شاعری عرصہ تک تبلیغی فرض بھی ادا کرتی رہی۔

لکھنؤ میں آکر اس کا رجحان زبان کی صفائی اور قواعد کی طرف ہوا ہندی کا رہا سہا اثر بھی کم ہوگیا فارسی کی طرف زیادہ توجہ ہوگئی۔

آخر میں یہ لکھنا پڑتا ہے کہ اب سے پہلے اردو کی توجہ عوام کی طرف (ان کی اجتماعی حیثیت میں) کبھی نہیں رہی۔ غریبوں کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ اور اگر کچھ کہا گیا تو صرف اخلاقی حیثیت سے، قوم کی شیرازہ بندی میں ہماری شاعری نے کوئی مدد نہیں دی۔ نہ کوئی پیام دیا۔ نہ راہ عمل پر لانے کی فکر کی۔ حالانکہ ادب کے لئے اس میدان میں آنا ضروری تھا۔ منظر نگاری اور اپنے مقامی اثرات سے زیادہ تر گریز رہا۔ اگر نظیر اکبرآبادی و انیس نہ توجہ کرتے تو شاید یہ عناصر ہمیشہ کیلئے قدیم شاعری سے مفقود ہی رہتے۔ عہد قدیم میں اگر بھولے بھٹکے کوئی شاعر منظر نگاری یا کاروباری طبقہ و زندگی کے متعلق کچھ کہتا بھی تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ اس کے جذبات اُسے مجبور کرتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے حیات کے مختلف پہلو کی ترجمانی پر اُردو مجبور کرتی تھی اور چونکہ شدت جذبات سے چیزیں ظہور میں نہیں آتی تھیں۔ اسی وجہ سے اُن میں شعریت بھی زیادہ نہیں۔

قدیم شاعری کے رجحانات ختم کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ جدید اُردو ادب کے وجود میں آنے کے کیا کیا اسباب ہوئے۔ ان اثرات کی تفصیل و تشریح آگے کی جائے گی۔ یہاں اس کا ایک مختصر سا خاکہ بنا لینا اسباب کے سمجھنے میں

آسانی پیدا کرے گا۔

ہمارے نزدیک سب سے زبردست اثر تو سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے زبان پر پڑا۔ جو ہر ملک و ہر زمانہ میں ہوتا ہے۔ دہلی کے کمزور ہوتے ہی اہل نظر نے دیکھ لیا تھا کہ اب انگریز بغیر تمام ہندوستان پر قبضہ کئے ہوئے رہ نہیں سکتے۔ ان کے قدم رفتہ رفتہ استقامت کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ اس سے بھی پہلے دیکھنے میں آیا تھا کہ آج یہ سلطنت گئی کل وہ صوبہ انگریزوں کا ہوگیا۔ اس ہلچل میں سکون و اعتماد سب کھو گئے اودھ کی سلطنت میں یک گونہ آرام ضرور تھا مگر جس انداز سے اس کے پر پرزے کم کئے جا رہے تھے آمدنی و اقتدار میں فرق آ رہا تھا وہ صاف بتا رہا تھا کہ اب زیادہ دن یہ سلطنت بھی ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہیں رہ سکتی۔ اس کا احساس ممکن ہے کہ شروع میں نہ رہا ہو مگر آخر میں تو پورا یقین ہوگیا تھا کہ انگریز دہلی اور کلکتہ کے درمیان میں اودھ یا لکھنؤ ایسی ضروری جگہ کو کسی غیر کے ہاتھ میں نہ رہنے دیں گے۔ مگر یہ یقین اب کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ جس طرح کسی مریض کو بستر مرگ پر قضا گھیرلے اور وہ کچھ نہ کر سکے اسی طرح ان غریب نوابوں کے پاس سلطنت بچانے کا کوئی علاج نہ تھا۔ پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا انگریزی اقتدار اتنا بڑھ چکا تھا کہ اب بغیر سر تسلیم خم کئے رہنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اور ایسی حالت میں جیسا ہر بیکس و مجبور انسان کرتا ہے وہی آخری شاہان اودھ نے بھی کیا۔ سوچا کہ سرکشی کرنا خودکشی کے برابر ہے۔ ریذیڈنٹ جو چاہے کہے گورنر جنرل جو چاہے کرے سب شربت کے گھونٹ کی طرح پی جانا چاہئے اور جب تک جان بچ سکے زیادہ سے زیادہ خوشی و مسرت کے ساتھ بسر کر لینا چاہئے۔ جہاں تک ممکن ہو بادۂ عیش و عشرت سے سرشار

رہا جائے تاکہ مدہوشی و بیخودی میں تلخیٔ ایام زیادہ تکلیف نہ دے سکے۔ غالبؔ نے سچ کہا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

اس سیاسی ماحول میں لکھنؤ کا ادبی دور پرورش پا رہا تھا رنگ رلیوں میں شاعری کی سرپرستی ہو رہی تھی۔ بادشاہوں کے مزاج اور اشارے پر شعراء کام کر رہے تھے دہلی سے جو لوگ آئے بھی وہ اپنا اثر نہ ڈال سکے اس لئے کہ یہاں کی دنیا میں رنگینی و خوش مزاجی برس رہی تھی۔ عمق و تخیل کی زیادہ پروا نہ تھی۔ ناز و نیاز کی عام و روزانہ سرگزشت سے لوگ جی بہلاتے تھے اور غالباً ایسے تعیش کی فضا کا مطالبہ بھی یہی ہونا چاہیے۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ جو کچھ شعراء کہہ رہے تھے وہ زیادہ تر مشاہدات و تجربات پر مبنی تھا۔ بادشاہوں کا عشق اپنے اقتدار و دولت کی وجہ سے کبھی مشکل سے سپردگی کا پہلو پیدا کر سکتا ہے۔ وہ اپنے تعشق کے ہر مرحلہ کو مختلف و متعدد ذرائع و اثر سے طے کر لینے کے مواقع پا جاتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق کے اعلیٰ مدارج کا نمونہ عنقا کا حکم رکھتا ہے۔ رسمی طور پر جو چلا ہے کہیں لیکن حقیقت میں وہ دیر تک سینہ کوبی، کشمکش، انتظار، بیخودی، ضبط، کوچہ گردی، ستم ظریفی کی لذتوں سے فیضیاب نہیں ہو سکتے ان کے جذبات دیرپا اور ان کی آہیں پُراثر نہیں ہو سکتیں۔ وہ عشق میں کھو جانے کے مزے سے کہاں واقف ہو سکتے ہیں۔

قیصر باغ اور اس قسم کے اور جلسوں میں تفریحی عشق کے اکثر مناظر نظر آتے تھے انسان داہل دل ہونے کی وجہ سے شعراء بھی کچھ نہ کچھ اثر لیتے ہی تھے اور بادشاہوں کے

ذوق کا اندازہ کرکے شعر کہنا شروع کرتے تھے۔ آمیر کا دیوان دیکھئے تو آپ کو اکثر
اسی قسم کے اشعار ملیں گے۔ کبھی کبھی تو بیچین ہو کر کہہ پڑتے ہیں کہ ؎

آمیر افسردہ ہو کر غنچہ پر دل سوکھ جاتا ہے ۔۔۔ وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

آمیر ہی پر منحصر نہیں اس دور کے اکثر شعرا کے یہاں ایسی ہی چیزیں ملیں گی۔
سر بر آوردہ شعرا کا اثر سب ہی پر پڑتا ہے۔ غزل میں یہ رنگ عام ہو گیا۔ تخیل و تاثیر
کی جگہ لفاظی و مبالغہ نے لے لی۔ سامنے کی باتوں کو صاف اور سلیس زبان میں
ادا کرنے کے ذوق نے رعایت لفظی کے چسکے کو بہت زیادہ فروغ دیا۔ تنوع
مضامین کے لئے خارجی اشیاء پر طبع آزمائی کی گئی۔ دوپٹہ۔ زیورات، محرم، چوٹی
سب کو شاعری میں جگہ مل گئی۔ اگرچہ اس خارجیت نے ایک طرح کی حقیقت
نگاری بھی پیدا کردی جو بعد میں نظموں کے لئے راہیں کھولنے کا ذریعہ بن گئی مگر
رفتہ رفتہ ایک بے کیف و بے جان شاعری کا انبار جمع ہو گیا اور اس کثرت
کے ساتھ کہ ساری فضا پر رسمی شاعری کا گمان ہونے لگا۔ ان سب باتوں کے
ردّ عمل کا جدید اردو شاعری کی شکل میں نمایاں ہونا فطری امر تھا۔

سیاسی اثر کے ساتھ معاشرتی تبدیلی نے بھی ہماری شاعری کو بہت کچھ
بدل جانے پر مجبور کیا۔ واجد علی شاہ کی گرفتاری کے ساتھ ہی لکھنؤ پر انگریزی پھریرا
لہرانے لگا۔ اب تک جو لوگ اس دربار سے توسّل رکھتے تھے وہ بے ٹھکانے ہو گئے
شعرا بھی اپنا سہارا کھو بیٹھے اور ایسا کہ اب کوئی دروازہ اتنا وسیع نظر میں نہ
رہا۔ دہلی اور لکھنؤ دونوں دروازے بند ہو گئے۔ کچھ روز رام پور میں قسمت
آزمائی کرتے رہے لیکن وہاں بھی زیادہ دیر پناہ نہ مل سکی اور مل بھی سکی تھی تو

صرف ان ہی لوگوں کو جو پختہ کار ہو چکے تھے۔

نئے شعرا کو اب یہ اُمید نہ رہی کہ اگر ہم اچھے اشعار کہیں گے بھی تو کسی رئیس کی سرپرستی نصیب ہو جائے گی۔ سارے دروازے بند ہو چکے تھے یا بند ہو رہے تھے اب اگر کچھ صلہ یا دادِ سخن مل سکتی تھی تو متوسطین سے یا عوام سے پھر ایسی صورت میں ایسے اشعار کیوں کہے جائیں جن سے زیادہ تر رؤسا کا خوش کرنا مقصود تھا اسلئے کہ اس قسم کی شاعری میں نہ نام ہوگا اور نہ پیٹ بھرے گا۔ اس احساس نے نئے مذاق اور موجودہ ضروریات کی ترجمانی پر نئے لوگوں کو اُبھارا۔

ذہنی تبدیلی بھی ہماری جدید شاعری کو شاہراہ پر لانے میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔ جب کوئی قوم دوسری قوم پر غلبہ پاتی ہے تو ہمیشہ فاتح کا تتبع مفتوح قوم کرتی ہے۔ تمدن، ادب، خیالات، غرض ہر چیز کی تقلید قریب قریب فرض ہو جاتی ہے۔ اُردو شاعری اس وقت نئے انداز بیان نئے خیالات سے ادب کا دامن وسیع کرنے کے لئے بیچینی سے منتظر تھی۔ انگریزی سے شناسائی ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ ہمارے یہاں صرف ایک ہی میدان یعنی حسن و عشق تک تگ و دو محدود رہی ہے۔ مغربی ادب میں شعرا نے ہر طرف کائنات کی گل کاریوں پر نظر ڈالی ہے۔ منظر، اخلاق، رزم، عشق کے علاوہ دنیا کے دوسرے محسوسات، مذہب، سیاست، سماج، حب وطن، کاروباری زندگی کے متعدد پہلوؤں پر اہل سخن نے توجہ کی ہے۔ ادب کا بھی دامن وسیع ہوا اور مختلف جماعتوں کا دلچسپی کا سامان بھی ہو گیا۔ چنانچہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ ہماری زبان ہے۔ اس میں ہمارے خیالات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ ہمارے جذبات کا بھی احترام کیا گیا ہے۔ یقیناً یہ قومی زبان ہے۔ انداز بیان بھی ایک ہی نہیں ہے

کافی لوگوں کو اپنی انفرادیت نمایاں کرنے کا موقع مل گیا ہے اور یہاں تو صرف غزل وقصیدہ کا غلبہ ہے جس میں ہر شاعر کے جذبات اتنے ملتے جلتے ہیں کہ امتیازی شان پیدا کرنا پہاڑ توڑ کر دریا بہانا ہے۔

سیاسی، اقتصادی، سماجی، علمی و ادبی، مذہبی، فلسفیانہ اور دوسری تحریکات وقت کی ضرورت اور فضا کے مطالبات نے اردو زبان و ادب کے رہنماؤں کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے کوشش کی کہ ادب کو زندگی کے قریب تر لائیں، انھیں حالات اور خیالات نے حالی اور آزاد کو ہماری شاعری کی چارہ سازی پہ آمادہ کر لیا۔ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو انجمن اردو قائم کرتے وقت آزاد کا تاریخی لکچر جدید اردو شاعری کی تحریک کے اسباب اور نصب العین پر اچھی طرح روشنی ڈالتا ہے۔ حالی کے خیالات بھی پوشیدہ نہیں کہ وہ کیا کیا اردو شاعری میں کمی پاتے تھے اور کیا کیا اصلاحیں ان کے ذہن میں تھیں "مقدمۂ شعر و شاعری" میں کئی مقامات پر انھوں نے اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے۔ وہ پڑھ چکے تھے اور سن بھی چکے تھے کہ زبان سے دنیا نے سیاسی تحریکات میں کیسے کیسے کام کئے ہیں۔ تاریخی واقعات کی کئی مثالیں دی ہیں۔ عرب، یونان، انگلستان میں شاعری کو آلۂ کار بنا کر اس جگہ کامیابی حاصل کی گئی ہے جہاں اور دوسری قوتیں جواب دے چکی تھیں۔ وہ یہی کام اردو شاعری سے بھی لینا چاہتے تھے۔

شاعری کے کارناموں میں ایک خاص بات حالی کو نظر آئی جس کو اس طرح بیان کرتے ہیں: "پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاق فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے۔ قومی افتخار، قومی عزت، عہد و پیمان

کی پابندی، بے دھڑک اپنے تمام عزم پورے کرنے، استقلال کے ساتھ سختیوں کو برداشت کرنا اور اپنے فائدوں پر نگاہ نہ کرنی جو پاک ذریعوں سے حاصل نہ ہوسکیں۔ اور اسی قسم کی وہ تمام خصلتیں جن کے ہونے سے تمام قوم، عالم کی نگاہ میں چمک اُٹھتی ہے اور جن کے نہ ہونے سے بڑی سے بڑی قومی سلطنت دنیا کی نظروں میں ذلیل رہتی ہے۔ اگر کسی قوم میں بالکل شعر ہی کی بدولت پیدا نہیں ہوجاتیں تو بلاشبہ ان کی بنیاد تو اس شعر ہی کی بدولت پڑتی ہے۔"

آزاد و حالی کے ان خیالات سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ جدید اُردو شاعری کو وہ کس طرف لے جانا چاہتے تھے اور اس کا رجحان کدھر تھا۔ وہ لوگ صرف وجدانی کیفیت تک شاعری کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ وجدان کے ساتھ ساتھ دنیا میں جینے کا راز بھی اس کے ذریعہ سے بتانا چاہتے تھے۔ وہ شاعری کا پس منظر اب دربار یا بزم نشاط کے بجائے حقیقت و عوام کو بنانا چاہتے تھے۔ زبانی باتوں کے بجائے عملی دنیا میں اُردو کو لانا چاہتے تھے ان کی یہ کوششیں بارآور ہوئیں اور بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں نے اُردو شاعری کو تنگ دائرے سے نکال کر جامعیت و ہمہ گیری کی طرف متوجہ کردیا۔
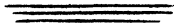
جدید اُردو شاعری

(۱۸۵۷ء اور اسکے بعد کا سماجی پس منظر)

۱۸۶۷ء کے بہت پہلے سے جدید اُردو کے احساسات لباسِ مجاز میں نظر آنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی سیاسی و اقتصادی تحریکات کا مطالبہ تو اُردو کی ابتدا ہی سے یہ تھا کہ اس کو پیامِ حیات بنا کر اہلِ ملک کو راہ راست پر آنے کی تلقین کی جاتی۔ انتشار کی تیرہ و تار وادیوں کے لئے چراغِ راہ سمجھ کر لوگ پروانہ وار ادھر آتے۔ اس لئے کہ اُردو ادب کے بنتے ہی مغلیہ سلطنت کا چراغ کچھ ایسا ٹمٹمایا کہ ہر طرف پریشانی و بربادی فضا میں چھا گئی۔ دلوں میں ہراس، آنکھوں میں اندھیرا، ہر شخص کو مستقبل قریب بھیانک نظر آرہا تھا۔ برائے نام جو سہارے رہ گئے تھے وہ خود اپنی بنیادی کمزوریوں اور بے پناہ سیاسی خطروں سے کانپ رہے تھے۔ ایسی صورت میں ترقی کرنے والی زبان فطرتاً لوگوں کو پھر سے ایک رائے اور ایک دل کر دینے کے لئے بیچین رہی ہوگی۔ لیکن چونکہ بربادی کی داستان ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی غلامی کی زنجیریں

پوری طرح جکڑی نہیں جا چکی تھیں اور تاریخ اس کے بغیر تشنہ رہی جاتی تھی۔ اس لئے ابھی سوتی دنیا کو جگانا غالباً قبل از وقت سمجھ کر تسکین کا دوسرا پہلو اختیار کیا گیا۔ یعنی حسن وعشق کی رنگین کہانیوں میں محویت پیدا کردی گئی، لیکن یہ عالم کب تک رہتا آخر تباہی کی داستان بھی مکمل ہوگئی۔ حسن وعشق کی داستان سے کچھ جی گھبرا گیا کچھ سماج کی کہانی بیان کرنے کا جذبہ بے اختیار ہوگیا لیکن ایک پیشوا کی ضرورت تھی جو ادبی دنیا میں سمجھ بوجھ کر قدم اُٹھائے بزرگوں کا احترام کرے زبان بھی ہموار ہو کیونکہ اس سے پہلے نظیر اکبرآبادی کا حشر دیکھ چکے تھے کہ انھوں نے اب سے بہت پہلے قومی شاعری کی بنیاد ڈالنی چاہی تھی مگر ان کی آواز صدا بہ صحرا، ہوکر بے اثری کا شکار ہوگئی اس انقلابی دور میں آزاد نے رہنمائی کا بیڑا اُٹھایا اور کہا ؎

عمر یست کہ افسانۂ منصور کہن شد — من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے کتاب ہندوستان کے باب زوال کو مکمل کر دیا کس مپرسی وطوائف الملوکی اپنی آخری حد بھی طے کر گئی۔ اب شعرا کے لئے اس زمین پر بھی قدم رکھنے کا سہارا نہ رہا جو تھوڑی دیر کے لئے مستقر بن گئی تھی۔ مغربی تہذیب کا ہندوستانی تمدن سے بھرپور تصادم ہوا حالانکہ ہندوستان پر اہل مغرب کا اثر ہلکے ہلکے عرصے سے ہو رہا تھا۔ اس کی دولت سے کبھی پرتگالی کھیلتے رہے کبھی ایسا معلوم ہوا کہ فرانسیسی حکومت قائم ہو جائے گی کبھی اہل برطانیہ کا غلبہ رہا جو آخر میں مستقل بھی ہوگیا۔ غرض اس بدنصیب ملک پر جس کو موقع ملا حسب استعداد طبع آزمائی کرتا رہا۔ ایک صدی قبل

ہی سے آثار بُرے نظر آرہے تھے مگر مغربی اقوام کی بساطِ سیاست پر ہندوستانی بندۂ تقدیر کی طرح اس امید پہ نظریں ڈال رہے تھے کہ شاید کوئی پانسہ کبھی ان کے موافق بھی پڑ جائے لیکن قسمت نے بھی دھوکا دیا اور آخر ۱۸۵۷ء میں جب پانی سر سے اونچا نظر آیا تو ڈوبنے والے کی طرح زندگی کے لئے آخری مرتبہ سخت سے سخت جدوجہد پر آمادہ ہو گئے اور ان کی اس تحریک کا نام چاہے آزادی کی پہلی جنگ رکھئے یا غدر کہئے یہ ایک ہنگامۂ عظیم کی صورت میں نظر آئی نتیجہ وہ ہوا جو ہم آپ سب کو معلوم ہے۔ اچھا ہو یا بُرا نراجی سیلاب تو کم ہوا۔ ہیجانی کیفیت تو دور ہوئی، ذرا سکون ہوا تو یہ نظر آیا کہ ہمارے مال و دولت، ملک و آزادی، سب سے ہم رخصت ہو چکے۔ مغربی تمدن سر پر منڈلا رہا ہے اور بغیر اپنا پورا اثر کئے جا نہیں سکتا۔

مغربی تہذیب و تمدّن کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ اب ہندوستانیوں کو صاف نظر آنے لگا کہ دنیا بدل گئی ہے۔ پُرانے طرزِ زندگی سے کام نہ چلے گا۔ نئے اصول مرتب کرنے پڑیں گے۔ وضع قطع، ادب، سب کو تبدیل کرنا پڑے گا۔ اُردو شاعری کا ہمیشہ سے یہ خاص انداز رہا ہے کہ حسبِ ضرورت اپنے مزاج کو تبدیل کر لے اس بار بھی وقت آتے ہی چولا بدل لیا قرعہ اندازی کی تو آزاد کا نام ناخدائی کے لئے نکلا۔ آزاد نے مخالفتوں کے اندیشہ سے بے نیاز ہو کر فوراً اپنا کام اس انداز سے شروع کر دیا جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آ چکا ہے۔

اس کو اتفاق کہئے یا بزرگوں کا فیض سمجھئے کہ ادبی رجحانات کے تبدیل کرنے والوں میں غالب و ذوق کے شاگردوں کے نام فہرست میں سب سے بلند

مقام پر نظر آتے ہیں۔ آزاد نے نئے رجحانات کی تشکیل کی۔ حالی و اسمٰعیل نے بڑھ کر ہاتھ بٹایا اور پھر ذوق کے ادبی گھرانے ہی کا ایک باکمال فرد عمارت بلند کرنے کے لئے پنجاب سے اُٹھا اور اس حسن و جامعیت کے ساتھ تعمیرِ نو کو سنوارا کہ سب کو حیرت ہوگئی طرزِ قدیم و طرزِ نو دونوں نے آفریں کی اور ادبی دنیا سے "اقبال زندہ باد" کی صدا آنے لگی۔

اِصلاحی رُجحانات

ابتدائی کوششیں حالات کی رفتار ایسی تھی کہ نئے رجحانات آہستہ آہستہ دنیا کے سامنے آتے رہے۔ ابتدا میں کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں دکھائی دیتی چنانچہ آزاد نے شروع میں زیادہ تر اپنی توجہ مناظر قدرت و عام اخلاقی مضامین تک محدود رکھی۔ نظمیں کہیں یا مثنویاں پیش کیں۔ سب میں صرف نئے رجحانات کو متعارف کرنے کا پہلو مدنظر رکھا۔ کوئی تبلیغی یا تنقیدی کام نہیں لیا۔ حالی نے بھی ابتدا میں اسی روش کو مدنظر رکھا۔ مناظرہ رحم و انصاف، مثنوی برکھارت حب وطن وغیرہ سے لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرتے رہے۔ جانتے تھے کہ گل و بلبل کے افسانوں کا اثر جاتے جاتے جائے گا۔ ذہنیت کا ایک دم سے تبدیل کرنا آسان کام نہیں۔ یہ نفسیاتی تحلیل بڑے کام آئی۔

جب لوگوں کو اثر پذیر ہوتے دیکھا اور یہ اندازہ ہوا کہ جدید شاعری کے رجحانات جڑ پکڑ رہے ہیں فوراً نظموں سے تبلیغی کام لینا شروع کر دیا اور مدّ و جزر

اسلام' لکھ کر مسلمانوں کو پوری طرح مسخر کرلیا۔ سوتی ہوئی قوم کی آنکھ کھل گئی اپنے بزرگوں کے کارنامے و مراتب دیکھ کر اپنی پستی کا احساس ہونے لگا اور اپنی پستی کو سوچ کر انجام کی بھیانک تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی۔

حالی نے موقع پاکر شدید جذبات کے ساتھ مسلمانوں کی موجودہ حالت پر تنقید کی۔ ادب کو بھی بُری طرح جھنجھوڑا گو ادبی تنقید میں ہمارے نزدیک کسی قدر مبالغہ سے کام لیا۔ اور تصویر کا صرف ایک ہی رُخ یعنی تاریک پہلو پیش کیا لیکن غالباً یہ فعل بالقصد رہا ہوگا اس لئے کہ مرض جس قدر کہنہ ہوتا ہے اتنی ہی تیز دوا کی ضرورت پڑتی ہے۔ بہرحال نئے رجحانات کو عام کرنا حالی کا کام تھا۔

جدید اردو شاعری نے ابتدا ہی سے اپنے رجحانات کی فہرست میں عملی پہلو کو سب سے زیادہ اہم جگہ دی۔ اخلاقیات' تمثیلات کے پردے میں ہندوستانیوں کو عمل و جدوجہد کی طرف نہ صرف توجہ دلاتی رہی بلکہ ان سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ محمد حسین آزاد۔ حالی۔ اسمٰعیل' متعدد نظمیں اسی نقطۂ نگاہ سے لکھتے رہے۔ مثلاً مولوی اسمٰعیل نے ہوا اور آفتاب کا ایک مناقشہ لکھا ہے جس میں دونوں نے ایک غریب مسافر کو تاکا اور باہم یہ شرط لگائی کہ[1]

جو لبادہ لے مسافر کا اُتار

بس اسی کے نام کا ڈنکا بجے	سر پہ دستارِ فضیلت وہ سجے

اگرچہ ہوا نے بازی جیتنے کے لئے بہت کچھ تیزی و تندی دکھلائی لیکن

باندھ لی کس کر مسافر نے کمر	تا ہوا کا ہو نہ کپڑوں میں گزر
تھک گئی آخر نہ اس کا بس چلا	ٹل گئی سر سے مسافر کے بلا

---

[1] شعر الہند صفحہ ۲۹۶-۲۹۷

لیکن جوں ہی ہوا ناکام رہ کر تھمی، آفتاب اس شان سے نکلا کہ

تمکنت چہرے سے اس کے آشکار　　چال میں اک بردباری اور وقار
وہ ہوا کی سی نہ تھی یاں دھوم دھام　　کر رہا تھا چپکے چپکے اپنا کام

بالآخر آفتاب کی حرارت سے مسافر کو پسینہ آگیا، اور اس نے پہلے لبادہ کے بند کھولے اُس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو

اب لبادہ کو لیا کاندھے پہ ڈال　　بدلی یوں نوبت بہ نوبت چال ڈھال

لیکن جب ٹھیک دوپہر ہوئی تو سایہ میں بیٹھ کر

دور پھینکا اس لبادہ کو اُتار　　واہ رے سورج لیا میدان مار

اس سے نتیجہ نکلا کہ کامیابی جس چیز کا نام ہے

اُس کا گُر ہے نرمی و آہستگی　　سرکشی کی رگ اُسی سے ہے دبی

اسی سلسلہ میں حالی کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔ اپنے دست بازو سے کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

تر دریا سے اپنے بل تیر کے پار　　کب تک تیرو گے ہو کے تونبوں پہ سوار
تم ڈوبنے کے یہ کر رہے ہو ساماں　　اوروں کا سہارا تکنے والو ہوشیار

اس وقت اُردو شاعری کا رجحان صرف بزرگوں کے فرسودہ راستے سے الگ ہونے ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ بچوں کی ذہنیت کو تبدیل کرنے میں بھی اُس نے بڑی جدوجہد کی۔ آزاد و اسمٰعیل دونوں نے بڑی محنت وخوبی سے نئے مذاق اصول کے ساتھ بچوں کے لئے نصاب تیار کئے۔ مولوی اسمٰعیل کا اس میدان میں تو کوئی دوسرا جواب اُردو نہیں پیدا کرسکی صرف نثر ہی نہیں بلکہ دلکش و پراثر انداز میں

مختلف مضامین وعنوانات کی وہ نظمیں بھی پیش کرتے رہے۔ انگریزی نظموں کا بھی ترجمہ کرتے رہے اور طبعزاد نظمیں بھی کہتے رہے۔ اسمٰعیل اردو کا رجحان دیہی شاعری کی طرف پھیرنا چاہتے تھے۔ کئی عمدہ نظمیں اس سلسلہ میں کہیں مثلاً برسات، گرمی کا موسم، صبح کی آمد، لیکن افسوس کہ اُردو کی توجہ اس زمانہ میں اس طرف زیادہ نہ ہوئی حالانکہ نظم طباطبائی نے بھی سر مارا، کئی نظمیں کہیں مگر یہ تحریک عام نہ ہو سکی۔

ادبی اصلاح

جدید اردو ادب کی نشوونما میں مغربی تہذیب و تمدن کا بہت کافی و نمایاں حصہ ہے۔ انگریزی ادب کا خاص طور سے شکر گزار ہونا چاہئے کہ جس نے اپنے کارنامے اور دوسری زبانوں کے دفتر رہنمائی کے لئے سامنے پیش کردئے۔ اگر یہ وسیلہ ہاتھ نہ آتا تو ہماری شاعری شاید اب تک نئے راستوں کی تلاش میں سرگرداں رہتی۔ اس نے آتے ہی اپنے بیش بہا خزانے کی طرف اردو کو اشارہ کردیا۔ اردو نے اپنی جوہر پسندی کی بنا پر فوراً فائدہ اُٹھانا شروع کردیا۔ خیال کے لحاظ سے انگریزی نظموں کا ترجمہ اردو میں شروع ہوگیا۔ فن کے اعتبار سے شکل وقافیہ وغیرہ کا بھی تجربہ اتارا جانے لگا۔ چنانچہ مولوی اسمٰعیل نے 'بلینک ورس' میں عمدہ نظمیں کہہ کر اس طرز کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ ان کے علاوہ دوسرے شعرائے بھی مثلاً آتی[?]، طباطبائی، شرر نے بھی اس اقدام میں حصہ لیا کبھی انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا گیا اور کبھی خود کسی موضوع پر اپنی طرف سے کچھ کہا گیا بہر حال، دونوں طرح سے اس کو اُردو میں ہردلعزیز بنانے کی تدبیریں ہوئیں۔ لیکن سعی مشکور نہ ہونے پائی۔ ورنہ شعرا نے اس کو دلچسپ بنانے میں کافی محنت کی تھی مولوی اسمٰعیل کی ایک نظم اس سلسلہ کی ملاحظہ ہو۔ کتنی دل کش ہے۔

تاروں بھری رات

ارے چھوٹے چھوٹے تارو — کہ چمک دمک رہے ہو
تمھیں دیکھ کر نہ ہووے — مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسماں پر — جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے — کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہُر اور لعل گویا

جوں ہی آفتابِ تاباں — نے چھپایا اپنا چہرہ
وہیں جلوہ گر ہوئے تم — یہ تمھاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں — بڑی نعمت اور راحت
اگر اتنی روشنی بھی — نہ میسّر آتی ان کو
تو غریب جنگلوں میں — یونہی بھولتے بھٹکتے
نہ تمیز راس وچپ کی — نہ طرف کی ہوتی اٹکل
نہ نشان راہ پاتے

وہ غریب کھیت والے — وہ امیدوار دہقاں
کہ کھڑی ہے جن کی کھیتی — کہیں کھیت کٹ رہا ہے
کہیں گہہ رہا ہے خرمن — نہیں آنکھ اُن کی جھپکی
یونہی شام سے سحر تک — ہیں تمام رات جاگے
نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ — نہ شمار وقت وساعت
مگر اے چمکنے والو! — ہو تمھیں انھیں سجھاتے

کہ گئی ہے رات اتنی

وہ جہاز جن کے آگے ہے وسیع بحر اعظم
اُنھیں ہولناک موجوں سے مقابلہ ہے کرنا
کوئی ہے چلا وطن سے کوئی آرہا ہے واپس
اُنھیں کچھ خبر نہیں ہے کہ کدھر ہے ان کی منزل
نہ تو مرحلہ نہ چوکی نہ سراغ راہ کا ہے
نہ کوئی دلیل و رہبر مگر اسے فلک کے تارو

تمھیں اُن کے رہنما ہو

اس وقت بلینک ورس، کا رواج دیرپا نہ ثابت ہوا۔ آیندہ نسلوں نے اس ادبی قیود ورسوم سے آزادی کی قدر نہ کی۔ اگر رواج ہو جاتا تو رجحان قابل قدر و مفید ثابت ہوتا۔

اُردو شاعری کا نیا رجحان عہد قدیم کا انجام دیکھ چکا تھا کہ حسن و عشق کے دائرے میں اُلجھ کر ادبی فرائض سے کتنا دور رہ گیا تھا۔ لہذا اس نے اپنے آپ کو کسی ایک شعبہ کی طرف زیادہ دیر تک روک رکھنا مناسب نہ سمجھا شروع شروع میں جب تک ضرورت سمجھی قدرتی مناظر سے لوگوں کو اپنی طرف مخاطب کرتا رہا اس کے بعد تبلیغی و تمدنی تحریکوں کی طرف متوجہ ہوا اور کارآمد موضوعات پر طبع آزمائی ہونے لگی۔

اب تک طرز بیان عموماً سادگی۔ تازگی۔ صداقت پر مبنی تھا لیکن تخئیل کی بلندی اور شاعرانہ عظمتیں کم تھیں۔ جو کچھ کہا جاتا تھا عموماً سطحی ہوتا تھا

اقبالؔ نے بڑھ کر فلسفیانہ رنگ دے دیا اب خیالات میں عمق اور بیان میں اُبھار بھی پیدا ہوگیا۔ یہ بدیہ کچھ ضروری بھی تھا اس لئے کہ اتنے اہم حکیمانہ اور علمی مضامین پے درپے چلے آرہے تھے کہ آسان زبان ترجمانی کرنے سے قاصر تھی۔ فارسی تراکیب و عربی تلمیحات سے مدد لینا ناگزیر تھا۔ اب سے پہلے اس قسم کی چیزیں زیادہ تر مذہبی کلام میں آتی تھیں اور بزم خاص تک محدود تھیں ان میں سے بعض کارآمد تشبیہات و تلمیحات، اصطلاحات، قومیت و ملت کی تعمیری تحریک میں آنے لگیں اور ان سے محفل عام بھی سجائی جانے لگی۔ مثلاً حسین، حیدر، فاروق، بلال، ابراہیم، حجاز، دجلہ، فرات، ہو اللہ واحد، ملت بیضا، فعنا لک خدکرلک، وغیرہ یہ سب اسمار و اجزار اپنی تمام خصوصیات و معنویات کے ساتھ تلمیح و تشبیہ کی طرح پر جوش و کارآمد موقع پر استعمال ہونے لگے۔ جیسے

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں گو کہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

. . . .

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

. . . .

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

اس رجحان سے یہ فائدہ ہوا کہ زبان کا ذخیرہ وسیع ہوگیا۔ دیکھنے میں یہ چیزیں تو صدیوں کی تھیں اور اردو ان سے نامانوس بھی نہ تھی مگر اب تک ایک

تنگ دائرے و مخصوص طبقہ تک محدود تھیں۔ اپنی قدامت و خصوصیات سے جو
وسیع مفہوم ان میں خود بخود پیدا ہو گئے تھے وہ کسی نئے لفظ یا فقرہ میں نہیں پیدا
ہو سکتے تھے۔ اقبال وغیرہ نے بڑی دور اندیشی سے یہ بیش بہا ذخیرہ اُردو کے خزانے
میں شامل کر دیا۔ چھوٹے سے چھوٹے لفظ میں اس قدر معنویت و تاثیر تھی کہ تبلیغ
میں ان سے زیادہ مدد شاید کسی آیت سے بھی نہ ملتی۔

ذہنیت کی تبدیلی

ذہنی آزادی بھی ہندوستان میں کافی آچلی تھی،
مذہب کا اب شاہانہ غلبہ کسی قدر ہلکا ہو چلا تھا۔
انگریزی تہذیب نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ قوتِ گویائی کو ذرا آزادی بھی
ملی تھی۔ کفر کے فتویٰ کی دھمکی اب زیادہ ہیبت ناک نہ تھی ادب پر بھی اس کا
اثر پڑا اور اچھا پڑا ایک بڑی بیش قیمت شے ہاتھ لگی۔ شکوہ کا وجود ان ہی
انقلابات کی وجہ سے ہوا اقبال نے نہایت بیباکی کے ساتھ اپنی مصیبتوں دشواریوں
کا گلہ، خدا سے کیا۔ بربادیوں کی تفصیل بتائی اور سب کا ذمہ دار بھی اسی کو ٹھہرایا اسلام
کا احسان بھی اُس پر جتایا اور پھر اس کی بے مہری کا گلہ بھی کیا ؎

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے ‏ ‏ نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا ہم نے ‏ ‏ تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

اس زبردست نظم پر یہاں تنقید منظور نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ نئے رجحانات
میں سے ایک رجحان یہ بھی تھا کہ جو کچھ کہنا ہو اور جس سے کہنا ہو خواہ وہ

کوئی ہو اگر جوشِ صداقت اور خلوصِ نیت ہے تو اس کی حشمت و سطوت سے دب کر خاموش نہ ہو جانا چاہیئے۔

اقبال کا شکوہ اس معرکہ میں غالباً پہلی نظم ہے۔ شعریت و انداز بیان کے لحاظ سے بھی بے مثل ہے اور آزادیٔ گفتار کا سنگ بنیاد بھی۔ اس سے پہلے جو آزادیٔ خیال نظر آتی ہے وہ عام طور سے علامات کی شکل میں دکھائی دیتی ہے یا جبر و قدر کے فلسفہ کی آڑ لیکر پیش کی جاتی ہے۔ اقبال کا مسلک یہاں پر بالکل الگ ہے وہ اپنے جذبات کو ضمنی یا ثانوی مرتبہ دے کر دبی زبان سے نہیں بیان کرنا چاہتے وہ اردو شاعری کی رسمیات کا سہارا نہیں لینا چاہتے بلکہ ایک چیز کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور اس کو اپنے خیال کا مرکز بنا کر نظم کرتے ہیں۔ یہیں سے اردو شاعری نے فریاد کا پہلو بدلنا سیکھا اور آیندہ چل کر بڑے سے بڑے حاکم و صاحب جبر و اختیار سے کلہ بہ کلہ گفتگو کرنے کی صلاحیت پائی۔

اس نئے رجحان نے صرف یہی نہیں کیا کہ نئے نئے موضوعات پر روشنی ڈالی بلکہ بعض ایسے موضوعات کو از سر نو درست کرنے کی کوشش کی جو عہد جدید کے نزدیک غلط طور پر دورِ قدیم میں پیش کئے گئے تھے۔ مثلاً پہلے 'حب وطن' کا مفہوم عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ وطن میں روڑے بن کر پڑے رہیں خواہ عزیز و اقارب سماج پر بار ہو جائیں۔ آزاد و حالی نے اس نظریہ کو بدلنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ حُبِّ وطن نام ہے اپنے ملک یا جائے سکونت کی بہتری و برتری کی فکر کرنے کا خواہ وہ کہیں رہ کر کی جائے۔ حالی اپنی مثنوی 'حب وطن' میں کہتے ہیں۔

نام کیا ہے اسی کا 'حُبّ وطن'
جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن

کبھی بچّوں کا دھیان آتا ہے
کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے

یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی
تو کبھی اہلِ شہر کی ہے لگی

نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار
پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار

کیا وطن کی یہی محبّت ہے
یہ بھی الفت میں کوئی اُلفت ہے

اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند
اس سے خالی نہیں چرند و پرند

... ...

آگے چل کر وطن کی محبت کا مفہوم کس خوبی سے سمجھاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ایک محب وطن کا کیا فرض ہے۔

قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے
قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے

قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

آزاد نے بھی وطن پرستی کے غلط مفہوم کی اہمیت کا اندازہ کر کے لوگوں کو سمجھایا کہ

حب الوطن ز ملک سلیماں نکوتراست
خارِ وطن ز سنبل و ریحاں نکوتراست

سلطان دل کا گرچہ یہی حکم عام ہے
اور متفق اسی پہ زمانہ تمام ہے

پر ملک مصلحت کا ہے کچھ انتظام اور
اس سلطنت کو چاہئے طرزِ نظام اور

حبّ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے
نکلے جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے

حب وطن نہ یہ ہے کہ پانی میں گر نہ ہو
ماہی کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو

حب وطن اسے بھی نہیں کہتے اہل ہوش
یادِ وطن میں ہوئے گھے جوش دگہہ خروش

حب وطن اسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں　　بچوں کے منہ کو چومتے آٹھوں پہر رہیں

اے دوست یہ تو دوستی سنگ و خشت ہے　　یہ دوستی تو خوب نہیں بلکہ زشت ہے

آگے بڑھ کر ناصحانہ انداز میں سمجھاتے ہیں کہ تمھارا فرض حب وطن کے سلسلہ میں کیا ہے۔ ایک اہلِ وطن کو کرنا کیا چاہیئے۔ کس طرح تم اپنا رویّہ بدل سکتے ہو وطن کی ترقی و بہبود کیونکر ہو سکتی ہے۔ آگے چل کر اقبال نے اس کو بھی صحیح نہ سمجھا۔ کسی ایک جگہ سے انس رکھنا ان کے نزدیک تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ ان کے نزدیک وطن کا تصوّر ترقی کی راہ میں حائل ہوتا ہے اور اس کی تخئیل کے لئے حدود معین کر دیتا ہے۔ بانگِ درا میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور　　ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے　　غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے　　اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی　　رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی　　دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اس قسم کے بعض اور مسائل قناعت، قسمت، خودی وغیرہ کے جو غلط مفہوم لوگوں کے پھیلائے گئے تھے۔ دورِ جدید نے ان کو درست کرنے کی فکر کی اور یہ سمجھایا کہ ہر ایک شخص کے ہاتھ اس کی قسمت ہے۔ عمل کرنا ضروری ہے۔ اپاہج ہونا قناعت یا تقدیر پر شاکر ہو کر بیٹھ جانے کے مرادف نہیں ہو سکتا۔ آتش کا یہ شعر آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ

قسمت کا جو لکھا ہے وہ آئے گا آپ سے — پھیلائیے نہ ہاتھ نہ دامن پسارئیے

اسی کے مقابلہ میں دورِ حاضر کے چند شعرا کے خیالات ملاحظہ فرمایئے ؎

کاہلی اور توکل میں بڑا فرق ہے یار — اٹھو کوشش کرو بیٹھے ہوئے کس دھیان میں ہو

(اکبر)

اہلِ ہمت منزلِ مقصود تک آ ہی گئے — بندۂ تقدیر قسمت کا گلہ کرتے رہے

(چکبست)

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

(شاد)

سنبھل سکے تو سنبھالو امید کی کشتی — خدا کو دیکھ چکے زورِ ناخدا معلوم

(اعجاز)

اس قسم کی تبدیلی و ترمیم قومیت کی تعمیر کے لئے ضروری تھی۔ ورنہ لوگ مذہب و خدا کی مرضی کا غلط تصوّر کئے ہوئے عمل کی دنیا سے دور، پست ہمتی کا شکار بنتے رہتے۔ ان کو عہد قدیم میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ دنیا فانی ہے، انسان اتنا مجبور ہے کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ جو کچھ ہوتا ہے سب کسی مصلحت اور کسی کی مرضی سے ؎

بے حکم اگر ذرّہ بھی ٹل جائے تو جانیں

ان توہمات کو دور کرنا جدید رجحان کا فرض اولین تھا اس لئے کہ اگر کسی قوم کی ذہنیت اتنی پست ہوگئی ہو کہ وہ اپنی نظروں میں بھی ہیچ ہو تو اس کا اُبھرنا معلوم، خود اعتمادی، اور اپنی اہمیت اگر نہیں ہے تو وہ راہ عمل میں قدم رکھنے سے پیش و پس کرتی رہے گی۔ یہاں تک کہ دوسری قومیں اس کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ جائیں گی دور جدید نے اقبال کی زبان سے اس نظریہ کو کتنے بلند طریقہ سے پیش کردیا ہے ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے — راہ تو، رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا — ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی — قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہوگیا — مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو — خوفِ باطل کیا؟ کہ ہے غارتگرِ باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

اب تلک شاہد ہے جس پر کوہ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ! تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

یہی نہیں اقبال خدا کی رضا کو بندہ کی رضا کا پابند بنا دینا چاہتے ہیں بلکہ اسے ہمتِ مردانہ کی اس منزل پر پہنچا دینے کے متمنی ہیں جہاں "یزداں" بھی شکار کیا جا سکے۔ اور اس سے آگے بڑھ کر تو اس رجحان میں اس سے بھی زیادہ شدت پیدا ہو جاتی ہے، جوش و مجاز وغیرہ نے حکومت و سرمایہ دار، خدا، مولوی غرضکہ ہر ایک صاحبِ اختیار پر اپنے نقطۂ نگاہ سے سخت سے سخت تنقید کی ہے۔

معاشرتی رجحان

ہر انقلاب عظیم کے بعد لوگوں کی ذہنیت کا تبدیل ہونا ضروری ہے۔ تبدیلی کبھی تو اچھائی کی طرف ہوتی ہے کبھی برائی کی جانب۔ کچھ لوگ سمجھ بوجھ کر کسی کی تقلید کرتے ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہوتے ہیں جو آنکھ بند کر کے پیروی شروع کر دیتے ہیں کبھی اس کا نام فیشن رکھتے ہیں کبھی ترقی سے تعبیر کرتے ہیں۔ کبھی جدّت تصور کرتے ہیں۔ ایسے عالم میں افراط تفریط کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ ایک خاص طبقہ ایسا ہوتا ہے جو انقلاب سے اثر قبول نہیں کرتا اور اپنی پرانی حالت کو بُری ہو یا اچھی ضعیدی سمجھ کر جہاں تھا وہیں رہنا چاہتا ہے۔ لیکن ایسے لوگ زیادہ ہوتے ہیں جو تقلید کرنا شروع کرتے ہیں اور اچھی بُری کسی بات پر رکنا گوارا نہیں کرتے اپنے نصب العین کو منزلِ مقصود ٹھہرا کر ہر حال میں وہاں تک پہنچنا فرض خیال کرتے ہیں یہی حال ہندستانیوں کا ہوا۔ انگریزی تہذیب سے اس قدر مرعوب و متاثر ہوئے کہ ہر چیز کو ہر وضع کو ہر روش کو اپنے لئے بھی مفید سمجھ کر بلا سوچے سمجھے خود کو انگریز اور ہندوستان کو انگلستان

بنانے کا تہیہ کرلیا۔ اس ارادہ و جذبہ پر کوئی حرف زنی کیا کرسکتا ہے اگر وہ واقعی باطن کی بھی تبدیلی ساتھ ساتھ کرتے جاتے مگر اندھیر تو یہ تھا کہ وہ صرف ظاہر کی تبدیلی تک اپنی تگ و دو ختم کردیتے تھے۔

ہندوستان کی مالی، معاشرتی، جغرافیائی، خصوصیات اس کی اجازت نہیں دتیں کہ ہم ہر بات میں مغرب کی رہنمائی قبول کرلیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اپنی کمزوریوں اور ضرورتوں کو دیکھ کر انگریزی طرز و طریقہ کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے۔ لیکن یہاں تو ایک سیلاب تھا جس میں ہر شخص بہا جاتا تھا۔ لہجہ، لباس، خرچ مذہب سے بیگانگی، ہندوستان کی ہر چیز کو ذلیل سمجھنے میں، انگریزوں کی تقلید کی جانے لگی۔ ہمارے جدید ادب نے قوم کو درست کرنے کا ذمہ لیا تھا۔ اس سے یہ بے راہ روی نہ دیکھی گئی۔ کورانہ تقلید سے بچانے کے لئے مختلف عنوان اختیار کئے۔ کبھی ناصحانہ انداز میں راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ کبھی ان کی پست ذہنیت و خود فریبی کا مضحکہ اڑا کر درست کرنے کی فکر کی غرض کہ اس کا رجحان اس طرف ہوا کہ لوگ بھٹکنے نہ پائیں۔ مغرب کی قابل قدر چیزوں کا اثر ضرور لیں، اندرونی کثافت کو دور کرنے کی فکر ضرور کریں اور جلد کریں۔ ظاہر کو بھی سنواریں لیکن اس تبدیلی کا جذبہ انگریز پرستی کی طرف مائل نہ کردے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خارجی پہلو تک ساری سعی ختم ہوجائے باطنی پہلو بالکل نظر انداز ہوجائے یا اس تقلید کے جوش میں ہندوستان کی خوبیاں بھی پامال ہوجائیں۔ آنکھ بند کرکے چلنے والے، جواہر پاروں کو بھی سنگ ریزے سمجھ کر سمندر پار پھینک دینے کی کوشش کریں۔ مختصر یہ کہ جو کچھ کیا جائے خود داری اور ذاتی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے۔

ہمارے شعرا نے اس پر نکتہ چینی کرنے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ بہت جلد ادھر توجہ کی۔ زبان کھلی تھی کہ اس کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ چونکہ خلوص سے کام کر رہے تھے اس وجہ سے اثر بھی ہوا۔ یہ رجحان قابل قدر و پُر اثر ثابت ہوا۔ حالی و اقبال کے علاوہ اکبر نے اپنے مزاحیہ انداز میں بڑے کارگر حربے استعمال کئے، مذاق کے پردے میں اصلاحی تحریک کو بہت کچھ کامیاب بنایا۔ چونکہ اشعار چٹکلوں کی طرح ہوتے تھے اس لئے فوراً زبان زد ہو جاتے اور بغیر کسی خاص فکر کے اُردو کی دنیا کے ہر گوشہ میں رائج ہو جاتے۔ چھوٹا بڑا تفریحاً یاد کرتا اور اثر لیتا اکبر کی شاعری کا رُخ زیادہ تر معاشرتی اور مذہبی اصلاح کی طرف تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ ہر شخص انگریزی وضع میں رہنا انگریزوں کی طرح زندگی بسر کرنا باعث فخر سمجھتا تھا۔ اکبر اس رویہ سے بیحد متاثر ہوئے۔ تمام عمر اسی کوشش میں رہے کہ یہ خبط کسی طرح دور ہو جائے۔ اس سلسلہ میں اکبر کے چند اشعار جا بجا سے ملاحظہ ہوں ؎

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے ‏ ‏ ‏ بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی ‏ ‏ ‏ یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

. . . .

عوض قرآں کے اب ہے ڈارون کا ذکر یاروں میں
جہاں تھے حضرتِ آدم وہاں بندر اُچھلتے ہیں

اعلیٰ مقصود چاہیئے پیش نظر ‏ ‏ ‏ کوشش تری گر ہو لطف ذاتی کیلئے
فرہاد پہاڑ پر عمل کرتا تھا ‏ ‏ ‏ شیریں کے لئے کہ ناسپاتی کے۔

انگلش ڈرس انور کا جو کل بزم میں دیکھا — اکبر نے کہا یہ تو خرابی کے ہیں آثار
معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیّر — تبدیلیِ صورت کے رہے گر یہی اطوار
خالق کی عبادت سے حجاب آنے لگے گا — شرماؤ گے اسلام کا کرتے ہوئے اظہار
بیگانہ و وحشی ہو گے عزیزانِ وطن سے — بنگلے میں نہاں ہو گے کہیں چھوڑ کے گھر بار
فاتح سے مساوات کی اُٹھیں گی اُمنگیں — وہ زیست جو آسان تھی ہو جائے گی دشوار
آپس میں بھی تم لوگ موافق نہ رہو گے — ایک ایک کو دیکھے گا بہ اکراہ و بہ انکار
آخر کو رہو گے نہ ادھر کے نہ اُدھر کے — انگریز بھی کھنچتے رہیں گے قوم بھی بیزار

. . . .

چھوڑ لٹریچر کو، اپنی ہسٹری کو بھول جا — شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ — کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

. . . .

لیلیٰ نے سایہ پہنا، مجنوں نے کوٹ پہنا — ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا
حسن و جنوں بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن — ہے لطفِ بحرِ ہستی فیشن کے ساتھ بہنا

. . . .

[illegible] مسلموں کے رات انگلش لیڈیاں آئیں — پئے تکریم مہماں بن سنور کر بیبیاں آئیں
طریقِ مغربی سے ٹیبل آیا کرسیاں آئیں — دلوں میں ولولے اُٹھے ہوس میں گرمیاں آئیں

. . . .

لڑیں کیوں ہندوؤں سے ہم یہیں کے ان سے پنپے ہیں
ہماری بھی دعا یہ ہے کہ گنگا جی کی بڑھتی ہو

مگر ہاں شیخ جی کی پالیسی سے ہم نہیں واقف
اسی پر ختم کرتے ہیں کہ جو صاحب کی مرضی ہو

اسی زمانہ میں مغرب زدہ طبقہ جب تک "پانیر" یا کسی اور انگریزی اخبار میں کوئی بات نہ دیکھ لیتا تھا یقین نہیں کرتا تھا۔ ہندوستانی اخبارات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ دیسی چیزوں کی بھی وقعت نہ ہونے کے برابر تھی جو کچھ قابل قدر مال ہو سکتا تھا وہ صرف یورپ ہی میں ہو سکتا تھا۔ کس مزے سے اس خام خیالی کو طنزیہ پیرایہ میں اکبر نے نظم کیا ہے ؎

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں ۔۔۔ بات وہ ہے جو "پانیر" میں چھپے

. . . .

اس مس پہ کون میرے سوا ہو فریفتہ ۔۔۔ گاہک ہیں ہی ہوں ہند میں لندن کے مال کا

. . . .

راہِ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے ۔۔۔ واں نہ پہنچے اور ہم سے چھٹ گئے

. . . .

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے ۔۔۔ تکلف کیا ہے لدلئے موٹر یہ زر کے زور سے
غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ تکلیفیں اُٹھا ۔۔۔ روکتے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے

. . . .

عزیزانِ وطن سوچیں سول سروس سے کیا حاصل
یگانوں میں رہو بیگانہ ہو کر اس سے کیا حاصل

اسباب طرب یہاں وہاں سے لائیں　　ہر طرح کا فرنیچر دکاں سے لائیں
قائم نہ رہے ادب تو کیا اسکا علاج　　انگریز کا رعب ہم کہاں سے لائیں

اپنے شکریہ کی اہمیت کس خوبی سے ایک قطعہ میں بتائی ہے ؎

انجن آیا نکل گیا زن سے　　سن لیا نام آگ پانی کا
بات اتنی اور اس پہ یہ طومار　　غل ہے یورپ کی جانفشانی کا
علم پورا ہمیں سکھائیں اگر　　تب کریں شکر مہربانی کا

حالی و اقبال کے یہاں یہ اصلاحی فریضہ متانت و سنجیدگی سے ادا ہوا۔ حالی نے سیدھے سادے دردناک انداز میں مسلمانوں کو ان کی ابتر حالت اور خوفناک انجام سے آگاہ کیا۔ "مدوجزر اسلام" میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

سمجھتے ہیں شائستہ جو آپ کو یاں　　ہیں آزادیٔ رائے پر جو کہ نازاں
چلن پر ہیں جو قوم کی اپنے خنداں　　مسلماں ہیں سب جن کے نزدیک ناداں
جو ڈھونڈوگے یاروں کے ہمدرد اُن میں
تو نکلیں گے تھوڑے جواں مرد اُن میں

نہ رنج اُن کو افلاس کا اُن کے اصلا　　نہ فکر ان کو تعلیم اور تربیت کا
نہ کوشش کی ہمت نہ دینے کو پیسا　　اڑانا مگر مفت اک اک کا خاکا
کہیں ان کی پوشاک پر طعن کرنا
کہیں ان کی خوراک پر نام دھرنا

عزیزوں کی جس بات میں عیب پانا　　نشانہ اسے پھبتیوں کا بنانا
شماتت سے دل بھائیوں کا دکھانا　　یگانوں کو بیگانہ بن کر چڑھانا

نہ کچھ درد کی چوٹ ان کے جگر میں
نہ قطرہ کوئی خون کا چشم تر میں

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے　　　پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے　　　کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں ان پہ خندہ زناں ہیں

کوئی ان سے پوچھے کہ لے ہوش والو　　　کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
بُرا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو　　　نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو

بچوگے نہ تم اور نہ ساتھی تمھارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

نئی روش و تہذیب کے متعلق اردو کا رجحان زیادہ تر نکتہ چینی کا رہا ہے خرابیوں پر تیزی کے ساتھ انگشت نمائی ہوتی رہی ہے۔ کم و بیش اس وقت کا ہر شاعر نئی روشنی والوں پر چیں بہ جبیں نظر آتا ہے۔ اور اصلاح کے لئے زبان کھولنے پر مجبور معلوم ہوتا ہے۔ چکبست نے بھی کافی زور و خلوص کے ساتھ اس طرف توجہ کی۔ ضروری اور مناسب اصلاح کی طرف برابر اشارہ کرتے رہے۔ امتیازی شان ان کے یہاں یہ ہے کہ صنف نازک کو بھی مخاطب کرکے بے راہ روی کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرتے جاتے ہیں اور صنف نازک کو بھی سیلابِ تقلید کے تھپیڑوں اور انجام سے پکار پکار کر ناصحانہ انداز میں آواز دیے جاتے ہیں۔ ان کی نظم پھول مالا سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

قوم کی لڑکیوں سے خطاب

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

... ...

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز
خود جو کہتے ہیں زمانہ کی روش کو بدنام
ساتھ دینا نہیں ایسوں کا زمانا ہرگز
خود پرستی کو لقب دیتے ہیں آزادی کا
ایسے اخلاق پہ ایمان نہ لانا ہرگز
رنگ و روغن تمھیں یورپ کا مبارک لیکن
قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز

... ...

رخ سے پردہ کو اٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز
تم کو قدرت نے جو بخشا ہے حیا کا زیور
مول اس کا نہیں قارون کا خزانا ہرگز
دل تمھارا ہے وفاؤں کی پرستش کیلئے
اس محبت کے شوالے کو نہ ڈھانا ہرگز
پوجنے کے لئے مندر ہے جو آزادی کا
اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

... ...

خاک میں دفن ہیں مذہب کے پرانے پاکھنڈ
تم یہ سوتے ہوئے فتنے نہ جگانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
ان کی تعلیم کا مکتب ہے تمھارا زانو
پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز

... ...

پرورش قوم کی دامن میں تمھارے ہوگی
یاد اس فرض کی دل سے نہ بھلانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمھارے نہ ہو اس وقت کا راگ
ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رلانا ہرگز

... ...

ہم تمھیں بھول گئے اسکی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز
کس کے دل میں ہے وفا کس کی زباں میں تاثیر
نہ سُنا ہے نہ سنوگی یہ فسانا ہرگز

اقبال نے اصلاحی معرکہ میں سب سے الگ راستہ اختیار کیا۔ صرف ناصح کی طرح اچھا بُرا کہہ دینے پر اکتفا نہیں کی۔ مزاحیہ انداز میں ہنسا کر رلانے کی فکر بھی نہیں کی۔ بلکہ ایک ہوشمند فلسفی اور باکمال شاعر کی طرح اپنی ہی نصیحتوں کو دلائل اور نشیب و فراز کے اصول سے پُراثر بنا کر غیبی آواز میں تمام ایشیا کے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں ان کے کلام نے حقیقت میں بانگ درا کا کام کیا۔ حالی نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اکبر نے جمود، کورانہ تقلید سے نفرت پیدا کرنے کی فکر کی۔ اقبال نے راہ عمل پر گامزن ہونے کے لئے آمادہ کیا۔
اکبر و حالی اس سلسلہ میں زمین تیار کر چکے تھے۔ لوگ اپنی برائیوں کو سننے لگے تھے۔ داستان کا رنگ محفل پر چھایا جا رہا تھا۔ اقبال نے اپنے نشتروں سے دکھتی رگ کو درست کرنے میں بڑے حسن سے کام لیا۔ لوگوں کو متوجہ پاکر پیغمبرانہ انداز میں گفتگو شروع کردی۔ اپنے کو بھی اسی عام سطح پر دکھانے کی کوشش کی۔ جہاں سب اور مسلمان کھڑے تھے۔ لوگوں میں اس طرح گھل مل گئے کہ سب یہ سمجھے ہم ہی میں سے یہ بھی کوئی ہے۔ نہ تو اپنے کو بہت بلندی پر رکھ کر ہم کو حقیر

سمجھتا ہے، نہ ناصح کی طرح سخت لہجہ ہے اور نہ ہجو سے ہمارا مذاق اُڑاتا ہے یہ تو سوز
وگداز کا پتلا ہے جو کچھ کہتا ہے اپنا سمجھ کر کہتا ہے اور خوب کہتا ہے۔

اقبال نے کلام کو پر اثر و دلکش بنانے کے لئے غزل کا تغزل، قصیدہ کا
زور۔ مرثیہ کی سادگی۔ مثنوی کا تسلسل اپنی نظموں میں جذب کر لیا تھا اور اس پر
خیالات کی کثرت، فارسی تراکیب و تشبیہہ کی چاشنی فلسفہ کے استدلال نے دل و دماغ
و ذہن کے مسخر کرنے میں جادو کا کام کیا۔ ان کے کلام کے سننے و سمجھنے والوں کا بھی دائرہ
سب سے زیادہ وسیع ہو گیا اردو ادب کے انداز بیان میں تنوع مضامین، مذاق سخن
کے اُبھار میں بھی بڑی مدد ملی۔ شاعری کی عام سطح اونچی نظر آنے لگی۔

آیئے جا بجا سے اقبال کے کلام کا نمونہ اس سلسلہ میں دیکھ لیا جائے تاکہ
یہ گفتگو ذہن نشین ہو جائے ؎

گیا ہے تقلید کا زمانہ مجاز رخت سفر اُٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

... ...

میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

... ...

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب کا نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

... ...

'خضر راہ' میں اقبال کو جو جوابات خضر نے دیے ہیں ان میں سے بعض بعض اشعار ملاحظہ ہوں کتنے لطیف اشارے ہیں اور کتنی معنویت، اقبال ہی کے دماغ سے یہ باتیں نکل سکتی تھیں اور وہی ان خیالات کو اپنے انداز سے نظم کر سکتے تھے؎

آبتاؤں تجھ کو رمز آیۂ "ان الملوک" — سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں — توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

... ...

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

... ...

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام — دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک
باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار — زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک

... ...

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

... ...

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات ایشیا والے ہیں اس نکتہ سے ابتک بیخبر

... ...

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر
جو کریگا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

... ...

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

کتنا کارگر آلہ جواب شکوہ میں اقبال نے تیار کیا ہے۔ جو کچھ کہنا تھا خود نہیں کہا۔ عالم بالا سے تنقید کی بجلیاں مسلمانوں کے خرمن بے حسی پر گرائی ہیں غیب کی زبان سے وہ سب کچھ کہلوا دیا ہے جس کی ضرورت تھی اور لطف یہ ہے کہ صرف اپنے کو مخاطب قرار دیا ہے۔ خود اگر کہتے تو یہ خوبی و اثر نہ پیدا ہوتا ناصح مشفق کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آجاتے۔ اقبال خود جمہور اسلام میں شامل ہیں لیکن شاعر کی حیثیت سے جو کچھ الہام ہوا ہے اس کو مسلمانوں تک پہنچانے کے لئے اُردو کو واسطہ بنا لیا ہے جا بجا سے اس نظم کو بھی دیکھ لینا مفید مطلب ہوگا۔

... ...

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو

ہونکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچوگے جو مل جائیں صنم پتھر کے

. . . .

جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں

. . . .

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

. . . .

ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اُسے قوت بازو پر تھا ہے تمھیں موت کا ڈر اس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیوں کر ہو
اعتراض کر کے صرف جوش دلانا مقصود تھا، مایوس کر کے مضمحل و بزدل بنانا الہامی شان سے بعید تھا امید بھی دلانی ضروری تھی اور رہنمائی اس سے زیادہ۔

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

....

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا　　تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا　　غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا
نخلِ شمع استی و در شعلہ و دَر ریشۂ تو
عاقبت سوز بود سایۂ اندیشۂ تو

....

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا　　رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ، تو ذرّے سے بیاباں ہو جا　　نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے

بہر حال یہ اصلاحی رجحان زبان و قوم دونوں کے لئے اتنا مفید ثابت ہوا کہ اگر یہ تحریک یہیں رک جاتی تب بھی اردو اس کو نہایت قابل قدر عنصر سمجھتی لیکن خوش قسمتی سے یہ چیز ابتدائی دور ہی تک نہیں رہی جب تک اقبال زندہ رہے ادھر توجہ ہوتی رہی۔ بلکہ آگے چل کر یہی چیز اور زیادہ تیز ہو گئی اور تبلیغ کا دوسرا انداز ہو گیا۔ جس کا ذکر ہم انقلابی شاعری کے ساتھ کریں گے۔

اس سلسلہ میں ہم کو مذہبی تحریک کا بھی جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آیئے ایک نظر اس وقت کی مختلف مذہبی کشمکش پر بھی ڈال لیں۔ اور اردو کے اس

رجحان کا بھی اندازہ کرلیں۔

مذہبی تحریک انگریزی حکومت کے آتے ہی ایک خیال عام ہوچلا تھا کہ سب لوگ عیسائی بنائے جائیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی ہر ایک فرقے نے اپنے مذہبی عقائد کی تلقین و اشاعت میں سرگرمی سے کام شروع کردیا۔ جس کا سلسلہ عرصۂ دراز تک قائم رہا۔ ہندوؤں کے ایک طبقہ (برہمو سماج) کی مذہبی اصلاح راجہ رام موہن رائے کے ہاتھوں سے شروع ہوئی۔ ان کے بعد اس کام کو بابو کیشب چندر سین، نے سنبھالا۔ بنگال سے نکل کر برہمو سماج ہندوستان میں پھیل گیا۔

ہندوؤں کے دوسرے فرقہ یعنی آریہ سماج کی بنیاد سوامی دیانند سرسوتی کے ہاتھوں پڑچکی تھی۔ اب یہ اپنے شباب پر تھا۔ مذہب کے ساتھ ساتھ یہ فرقے سماجی خرابیوں کو بھی نظر میں رکھتے تھے مثلاً شراب خوری وغیرہ کی روک تھام کی کوشش کرتے رہے۔

مسز اینی بسنٹ نے 'تھیوسوفیکل' تحریک کو ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ رائج کرنے کی کوشش کی، بنارس میں مذہبی نشر و اشاعت کے لئے ہندوؤں نے بھی ایک کالج قائم کیا۔ مسلمانوں میں بھی ہر طرف مولوی و مجتہد اسی کام کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک طرف پرانے مسلمان مولویوں کا گروہ تھا دوسری طرف سر سیّد اپنے رفیقوں کو لے کر ایک نئی روش اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ جذباتی عنصر اور کورانہ تقلید مذہب میں کم ہوجائے۔ جہاں تک ممکن ہو عقل و منطق سے کام لیا جائے۔ ان دو اسکولوں میں کافی بحث و

جنگ رہی۔ رسالے بازی بھی ہوئی۔ مکالمے۔ مباحثے سب ہی کا مظاہرہ ہوا۔ بالآخر ہمارے خیال میں سرسید کو حسب دلخواہ کامیابی ہوئی۔ عیسائی مذہب کا کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ اس کی اشاعت بہت زوروں کے ساتھ تمام ہندوستان میں ہو رہی تھی۔ وہ ہر مذہب سے اُلجھنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ ان سب مذاہب کی سرگرمی ایک طرف تھی اور دوسری طرف مغربی اثر ہر طبقہ و فرقہ کو مذہب کی جکڑ بند سے الگ کرنا چاہتا تھا۔ مذہبی رسوم و قیود کو آزادیٔ خیال کے لئے ایک رکاوٹ سمجھنے لگا تھا۔ پرستاران مذہب و ملت فروغ دین پر بھی اتنا زور دیتے تھے جتنا کہ اصول دین پر سرسید اور دوسرے دوراندیش رہنمایان مذہب تھوڑی سی ترمیم چاہتے تھے کہ لوگ اپنے مذہب سے بیزار نہ ہوں۔

نوجوانوں نے انگریزی تعلیم سے یہ اثر لیا کہ مولویوں، پنڈتوں، پادریوں کی ہر بات کو اس احترام کے ساتھ نہیں سننا چاہتے تھے جو اس سے قبل ان خدا پرستوں کو نصیب تھا۔ اس رویہ پر سب کے سب چراغ پا تھے اور سمجھتے تھے کہ مذہب ختم ہو گیا۔ لڑکے بے دین ہو گئے۔ ہندوستان میں کفر و الحاد کا چرچا ہونے لگا۔ اُردو نے بھی اس تحریک سے دلچسپی لی۔ شعراء میں سب سے زیادہ اکبر نے توجہ کی۔ وہ پُرانے آدمی تھے۔ مذہب میں ترمیم گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ جہاں کہیں نمایاں لغزش ہوئی یا اُنھوں نے طرز معاشرت و طرز تخیل میں قدامت سے ہٹی ہوئی آزادی پائی فوراً بےچین ہو گئے اور اپنے انداز میں کچھ کہنا شروع کر دیا۔ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ دل پر ایک خاص چوٹ لگی ہے ؎

جب علم گیا تو شوقِ عزت معدوم   دولت رخصت تو ذوق و زینت معدوم
مسجد سے یہ آئی گوشِ اکبر میں صدا   مذہب جو مٹا تو زورِ ملت معدوم

. . .   .

اس بزم سے سب کے سب اُٹھے جاتے ہیں   تسکیں کے جو تھے سبب اُٹھے جاتے ہیں
اک قوت مذہبی عقیدوں سے تھی   وہ بھی تو دلوں سے اب اُٹھے جاتے ہیں

. . .   .

گر جیب میں یاں زر نہیں تو راحت بھی نہیں   بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار   مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

. . .   .

توحید ان کے دلوں میں محفوظ نہیں   اللہ کے ذکر سے یہ محظوظ نہیں
اس فرقۂ نو کو میں نے دیکھا اکبر   اسلام ان کی نظر میں ملحوظ نہیں

. . .   .

اسلام کی بو وہاں نہیں ہے مطلق   مسجد بھی ہے مولوی بھی ہیں ٹاٹ بھی ہے
دریا میں نہیں ہیں جوہرِ تیغ اکبر   گو آب بھی اس دھار میں ہے کاٹ بھی ہے

. . .   .

صاحبزادے نشہ میں ہیں اور بیٹ کنور جی کی ہے ٹھن
ہیں مولوی صاحب قبلہ بھی چپ پنڈت جی مہراج بھی چپ

. . .   .

نیچری وعظ مہذب کو لئے پھرتے ہیں   شیخ صاحب ہیں کہ مذہب کو لئے پھرتے ہیں

ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں | ہم تو اک شوخ شکرلب کو لئے پھرتے ہیں

. . . .

تیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں | کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

. . . .

نئی تعلیم میں تقوے کا وہ اکرام کہاں | ناز بیجد ہیں مگر غیرت اسلام کہاں

. . . .

مفتی شرع نہ ہوں لیڈر اسلام تو ہیں | بوئے مسجد نہ سہی کیمپ کے گلفام تو ہیں

. . . .

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں | عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

. . . .

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے | تو پھر اس کی کیا خوشی ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

اکبر کے نقطۂ نظر میں آپ اردو شاعری کا رجحان بھی پاتے ہوں گے اور نئی روشنی والوں کا بھی۔ کیونکہ شاعر کے تاسف و طنز میں مغربی تعلیم سے اثر لینے والوں کا مذہبی نقطۂ نگاہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ مذہب کے اب غلام نہیں رہنا چاہتے تھے۔ بیجا رسوم محض جذبات کو اپنے اوپر مسلط کرنے میں وہ انسانی ذہن کی توہین سمجھتے تھے۔ اس ہوا میں فرائض بھی بھول گئے۔ نماز روزہ وغیرہ کو بھی آزادی کے غلط تصور پر نثار کر دینا چاہتے تھے۔ مغربی تمدن کی تقلید میں مسجد جا کر غریبوں کے ساتھ فریضہ ادا کرنا ناگوار تھا۔ وضو کرنا قمیص و سخت کالر کو

خراب کرنا سمجھتے تھے۔ انگریزوں کی تقلید میں ذہنیت اتنی تیزی سے بدل رہی تھی کہ خود کو 'صاحب بہادر' سمجھنے لگے تھے۔ غریبوں پہ کراہت سے نظر ڈالتے تھے۔ اس مغرب زدگی پر اکبر کے سوا دوسرے شعرا نے بھی ماتم کیا ہے مثلاً جوابِ شکوہ میں خدا کی طرف سے اقبال کہتے ہیں ؎

زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
پردہ رکھتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی تمھارا تو غریب

امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غربا کے دم سے

برقِ طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے

ایک دوسری جگہ مذہب کے متعلق میرزا بیدل کے ایک شعر پر تضمین کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جنکو ہستی غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش
"با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش"

ممکن ہے اس موضوع پر اتنی مثالوں سے آپ گھبرا گئے ہوں لیکن اقبال کے یہاں سے بغیر ایک مثال پیش کئے ہوئے نہیں رہا جاتا۔ اس میں مرحوم نے بڑے مزے سے حالی کے جذبات کی بھی ترجمانی کردی ہے۔

فردوس میں ایک مکالمہ

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز
حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدی شیراز
اے آں کہ ز نورِ گہرِ نظم فلک تاب
دامن بہ چراغ و مہ و اختر زدہ باز
کچھ کیفیتِ مسلم ہندی تو بیاں کر
واماندۂ منزل ہے کہ مصروفِ تگ و تاز
مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اس کی رگوں میں
تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمیِ آواز
باتوں سے ہوا شیخ کی حالی متاثر
رو رو کے لگا کہنے کہ اے صاحبِ اعجاز
جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی
ظاہر ہے کہ انجامِ گلستاں کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

یہ ذکر حضور شہ یثرب میں نہ کرنا سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں یافت ازاں پشم کہ رشتیم

تعلیمی تحریک

غدر کے بعد ہندوستان میں مغربی تعلیم کا خیال بہت زوروں میں پھیلا۔ کچھ اس وجہ سے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے جاہ و اعزاز نصیب ہونگے۔ اور کچھ اس سبب سے کہ سائنس وغیرہ کے مطالعہ سے خیال میں بلندی معلومات میں وسعت ہوگی۔ ممکن ہے کہ ملک کی ترقی و بہبود کا بھی باعث ہو۔ گورنمنٹ نے بھی ابتدا میں خاص توجہ کی۔ منجملہ اور باتوں کے ایک غرض یہ بھی تھی کہ گورنمنٹ کے دفاتر چلانے کے لئے کچھ ایسے لوگ تیار ہوجائیں جو انگریزی زبان میں کارروائیوں کا اندراج کرسکیں۔ عدالتوں میں کام کو معاملات سمجھا سکیں۔

اسکول و کالج برابر قائم ہونے لگے گورنمنٹ کا رخ دیکھ کر والیان ملک نے دلچسپی لی۔ بعض بعض امرا نے بھی سررشتہ تعلیم کو امداد دی۔ یونیورسٹیوں کا بھی وجود ہوا ساتھ ہی ساتھ قومی درسگاہوں کا بھی خیال رہا۔ کچھ عربی مدارس اور سنسکرت کے پاٹھ شالے بھی قائم ہوئے۔ مسلمانوں نے انگریزی تعلیم دوسری قوموں کے مقابلہ میں ذرا دیر سے شروع کی۔ سرسید نے بڑی جد و جہد سے لوگوں کو اس کی جانب متوجہ کیا۔ اب مسلمانوں کا فوری جوش اس تیزی سے بڑھا کہ قومی درسگاہ یعنی علیگڈھ کالج کے لئے چندہ کا سیلاب آگیا۔ سرسید کے ساتھ ساتھ حالی بھی چندہ کے لئے جاتے۔ اکثر مقامات پہ

نظمیں پڑھتے۔ علم، تعلیم کے فوائد سمجھا کر اپنا کام نکالتے۔ مسلمانوں کو یقین ہو چلا کہ قومی اعزاز کی کنجی مغربی تعلیم ہی ہے۔

علیگڈھ کالج کے لئے مسلمانوں کے بچے جوق جوق آنے لگے۔ قومی تعلیم کے سلسلہ میں اس کالج کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ علم و اخلاق، وسیع النظری کے جوہر پیدا ہونے کے لئے تمام قوم کی نظریں نونہالان کالج پر پڑنے لگیں۔ اُن کی تہذیب و تربیت آئندہ نسلوں کے لئے سرچشمہ قرار پائی۔ مغربی تمدّن کا اثر اس انقلابی دور میں کچھ ایسا پڑا کہ بزرگان دین کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کچھ تو وہ واقعی اپنے مولویانہ زاویۂ نگاہ سے ان کی طرز معاشرت و اخلاق پر نظر ڈال رہے تھے اور کچھ مذہب سے بیگانگی یہاں پر برتی بھی جاتی تھی حالانکہ نماز و روزہ کی پابندی کے لئے کالج میں سختی بھی تھی۔ لیکن خیال پر پہرہ بٹھانا سرسید کا کام نہ تھا۔ جوان طلباء بوڑھوں کی طرح تسبیح بکف و مصلّی بردوش نہیں ہو سکتے تھے۔ اس پر عام بدگمانی پیدا ہوئی۔ کالج اور سرسیّد پر اعتراضات کی بارش ہونے لگی۔ سرسیّد عقلی دلائل سے مولویوں کو جوابات دیتے رہے مگر وہ بھلا ایسے جو[illegible] سے کب مطمئن ہو سکتے تھے۔

علیگڈھ کالج پر نظر ڈالنے والوں کے دو گروہ تھے۔ ایک موافق تھا اور دوسرا مخالف، موافقین میں حالؔی وغیرہ تھے۔ حالؔی کے خیالات پوشیدہ نہیں ایک جگہ کہتے ہیں :-

یہ کالج قوم کو آپ اپنے بل چلنا سکھاتا ہے	سہارا غیر کا چھوڑیں یہ ایک ایک کو سجھاتا ہے
نہ چھوڑیں دین کا دامن رہیں دنیا میں عزت سے	سبق سب قوم کے بچوں کو یہ دونوں پڑھاتا ہے

معزز کس طرح بنتے ہیں گُر اسکے بتاتا ہے　　نہیں پاتا کبھی عزت کی خواہش سے کوئی عزت

. . . .

. . . .

یہ باہم مذہبی فرقوں کو ہے شیر و شکر کرتا　　یہ روٹھوں کو مناتا ہے یہ بچھڑوں کو ملاتا ہے
کھلاتا ہے یہ کھانا ایک دسترخوان پر سب کو　　نمازیں پنجگانہ ایک مسجد میں پڑھاتا ہے
وفا کا بیج بوتا ہے تعصب دل سے کھوتا ہے　　مسلمانوں کو گڈ سبجکٹ بننا یہ سکھاتا ہے

نہ چھوڑے گا۔ یہ باقی قوم میں دیکھے گا جو خامی
خدا کی برکتیں ان پر جو اس کالج کے ہیں حامی

مخالفین شعراء میں غالباً سب سے پہلے اکبر کی نظر کالج پر ناقدانہ پڑی۔ یہاں کی تعلیم و تربیت، اخلاق وغیرہ پر انھوں نے اپنی شاعری میں تبصرہ شروع کیا۔ اب سے پہلے تعلیم کی جگہ عموماً مسجد و مندر تھی۔ اس میں ایک تقدس کا پہلو بھی پیدا ہو گیا تھا۔ مغربی طرز میں یہ پہلو بھی جاتا رہا اور حصول علم کتاب تک محدود ہو گیا۔ اسلئے اعتراضات کو ہمہ گیر بننے کا زیادہ موقع ملا۔ کالج کی ذہنیت کا جو اثر یہاں کے طلباء پر پڑا تھا اور ان کے کردار میں جو خرابیاں شاعر کو نظر آئی ہیں وہ اسی کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ کبھی اعتراض کرتا ہے اور کبھی نصیحت یہ دونوں عنوانات ملاحظہ ہوں ؎

سوچو کہ آگے چل کر قسمت میں کیا لکھا ہے　　دیکھو گھروں میں کیا تھا اور آج کیا رہا ہے
ہشیار رہ کے پڑھنا اس جال میں نہ پڑنا　　یورپ نے یہ کہا ہے یورپ نے وہ کہا ہے

خدا علی گڈھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے

بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے امیر زادے شریف زادے

لطیف و خوش وضع چست و چالاک و صاف پاکیزہ شاد و خرم

طبیعتوں میں ہے انکی جودت دلوں میں انکے ہیں نیک ارادے

کمال محنت سے پڑھ رہے ہیں کمال غیرت سے بڑھ رہے ہیں

سوار مشرق کی راہ میں ہیں تو مغربی راہ میں پیادے

فقیر مانگے تو صاف کہدیں کہ تو ہے مضبوط جا کما کھا

قبول فرمائیں آپ دعوت تو اپنا سرمایہ کل کھلا دے

بتوں سے ان کو نہیں لگاوٹ مسوں کی لیتے نہیں وہ آہٹ

تمام قوت ہے صرف خواندن نظر کے بھولے ہیں دل کے سادے

نکلتے ہیں کر کے غول بندی بنام تہذیب و دردمندی

یہ کہہ کے لیتے ہیں سب سے چندے ہمیں جو تم دو تمھیں خدا دے

انھیں اسی بات پر یقیں ہے کہ بس یہی اصلِ کار دیں ہے

اسی سے ہوگا فروغ قومی اسی سے چمکیں گے باپ دادے

مکان کالج کے سب مکیں ہیں ابھی انھیں تجربے نہیں ہیں

خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر ہے کیسی منزل ہیں کیسے جادے

دلوں میں ان کے ہے نور ایماں قوی نہیں ہے مگر نگہباں

ہوائے منطق ادائے طفلی یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے

فریب دے کر نکالے مطلب سکھائے تحقیر دین و مذہب
مٹا دے آخر کو وضع ملت، نمود ذاتی کو گر بڑھا دے
یہی بس اکبر کی التجا ہے جناب باری میں یہ دعا ہے
علوم حکمت کا درس ان کو پروفیسر دیں سمجھ خدا دے

... ...

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

... ...

مسجد کا ہے خیال نہ پروائے چرچ ہے — جو کچھ ہے اب تو کالج و ٹیچر پہ خرچ ہے
عزت کا ہے نہ اوج نہ نیکی کی موج ہے — حملہ ہے اپنی قوم پہ لفظوں کی فوج ہے
اس طرز تربیت پہ ہیں اغیار خندہ زن — لاحول باپ کی ہے تو ماؤں کی نوج ہے

... ...

انگریزی طرز تعلیم پر اظہار افسوس کرتے ہیں تو کس خوبی و صداقت کے ساتھ[1]

دکھائی فلسفۂ مغربی نے وہ مردی — کہ پردہ کھل گیا اس قوم میں زنانوں کا
پری کی زلف میں الجھا نہ ریش واعظ میں — دل غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا
وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لئے — خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

... ...

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جنکو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مذہب اور مولوی پہ گالی ہولی — اسپیچ پہ انجمن میں تالی ہولی
دروازہ منصفی ہے ہم پر کیوں بند — ہر بات تو اے جناب عالی ہولی

یہ بھی کہہ دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اکبر صرف علیگڈھ کالج ہی کو محل اعتراض نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کے باہر بھی جہاں کہیں مغربی تعلیم کا غلط اثر لیکر لڑکے نکلتے، ان کی طنزیات سے بچ نہیں سکتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ ان کی تنقید مکان وافراد وجنس سے الگ ہو کر عام انگریزی تعلیم کے اثرات پر مبنی ہے۔ مثلاً

چل بسے وہ جنھیں مقدور تھا خودداری کا — نہ وہ تقویٰ نہ وہ تعلیم نہ وہ دل کی امید
دلولے کے نکلنے لگے کالج کے جواں — شرم مشرق کے عدو شیوۂ مغرب کے شہید
نئے انداز عبادت ہیں نئی صورت عیش — رمضاں ساعت کرکٹ ہے تھیئٹر میں ہے عید
نئی تہذیب نئی راہ نیا رنگ جہاں — دور گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید
بحث میں آہی گیا فلسفۂ شرم وحجاب — زہرہ ممبر ہوئیں ووٹر تھے جناب خورشید
دبی آواز کہا بھی جو کسی نے کہ جناب — کچھ مناسب نہیں اس وقت میں ایسی تمہید
شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب ووقار — کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید
نعرے تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند — لڑکیاں بول اٹھیں خود بہ طریق تائید
جب حکومت نہیں باقی تو یہ غمزے کیسے — کون کونے میں کرے بیٹھ کے مٹی کو پلید
تم نے شلوار کو پتلون سے بدلا اے شیخ — پھر مرے واسطے محرم رہے کیوں حبل ورید
خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دئے دیتے ہو — ہم سے کہتے ہو کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

. . . .

درِ نظارہ مقفل رہے کب تک ہم پر — کیوں نہ غنچوں کے لئے بادِ صبا کی ہو کلید

اقبال نے بھی جو کچھ موجودہ تعلیم اور اس کے اثر کے متعلق اکبر کے انداز میں
کہاہے۔ آیئے اسے بھی دیکھتے چلیں ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِّ نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

. . . .

دیکھئے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک
شیشۂ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنوں نشترِ تعلیم جدید
میرا سرجن رگِ ملت سے لہو لیتا ہے

. . . .

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں
پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ

. . . .

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو

. . . .

اُردو شاعری کا یہ تعلیمی رجحان نامکمل رہ جائے گا۔ اگر یہاں ان نظموں کا تذکرہ نہ کیا جائے جو علم و تعلیم کی منفعت پر لکھی گئی ہیں۔ حالی۔ اسمٰعیل۔ سورج نرائن مہر وغیرہ اس سلسلہ میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے تعلیم کی اشاعت کے لئے علم

کے مختلف و متعدد خواص و نتائج اپنی نظموں میں دلچسپ طریقے سے دنیا کے سامنے پیش کئے۔ جاہل یا علم سے گریز کرنے والے کا برا انجام دکھا کر لوگوں کو پڑھنے پڑھانے کی طرف توجہ دلائی۔ حالی نے تو بیانگ پکار کر کہدیا تھا کہ:۔

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام ان کا مٹا دوں گا

جستہ جستہ اشعار و مختصر قطعات تو اکثر شعرا نے کہے ہیں۔ ان کا ذکر چھوڑ کر بھی علم و تعلیم کے فوائد پر مسلسل نظمیں پیش کرنا خالی از طوالت نہ ہوگا اس لئے ہم صرف چند اشعار پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہے تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں — مشرق کو وہ فیض تجھ سے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہ نخشب کی طرح — رہتی ہیں شعاعیں تری محدود وہیں

... ... — ... ...

چھوڑو کہیں مال و دولت کا خیال — مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی — اندیشۂ فوت ہو نہ خوف زوال

... ... — ... ...

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال — غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا ہے زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح — جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

سیاسی رُجحان

چاہئے تو یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی ہندوستان میں ایک پُرزور عالمگیر سیاسی تحریک آزادی و فلاح کے لئے شروع ہو جاتی لیکن سیاسی دقتوں اور سماجی پیچیدگیوں میں ہندستانیوں کا شیرازہ اتنا منتشر ہو چکا تھا کہ منظم کرنے کے لئے کافی وقت کی ضرورت تھی۔ قومیت پر وہ زوال آچکا تھا کہ ہر طبقہ مذہب کو قومیت کی بنا سمجھتا تھا۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، غرض کہ ہر مذہب کا آدمی اپنے کو اسی روشنی میں مختلف اقوام کا فرد خیال کرتا تھا۔ عرصہ تک محض اسی اصول پر فرقہ بندی ہوتی رہی۔

جدید اردو شاعری نے اپنا بھی رجحان ابتدا میں اس قسم کا رکھا۔ زیادہ تر توجہ مسلمانوں ہی کے سنبھالنے کے لئے رہی اور شاید یہ ابھی نہیں ہوا اس لئے کہ ان کے ہاتھ سے سلطنت ابھی ابھی گئی تھی۔ کچھ حکومت کا خمار۔ کچھ شان ریاست کا اثر دونوں نے مل کر نئے زمانہ کی مطابقت سے اُن کی طبیعت کو اسقدر معذور

رکھا تھا کہ چند ہی دنوں میں ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی"۔ مدوجزر اسلام" میں حالیؔ نے اس ناگفتہ بہ حالت کی کافی اچھی تصویر پیش کی ہے۔ مذہبی احکام کا اتنا غلط تصور ان کے یہاں تھا کہ انگریزی تعلیم کو بھی بدعت سمجھا گئے۔ سرسید کی مساعی جمیلہ اگر نہ ہوتیں تو خدا جانے کب تک مسلمان خواب خرگوش کے مزے ہندوستان میں لیتے رہتے۔

حالیؔ و شبلیؔ نے اپنی شاعری کا مرکز مسلمانوں کی اصلاح، سرسید ہی کی تحریک سے بنایا تھا۔ مسدس حالیؔ ان ہی صحبتوں کا نتیجہ ہے۔ جدید اردو شاعری نے ابتداءً اپنا سیاسی رجحان اصلاحی تحریک تک محدود رکھا۔ ہندوستان نے بھی کوئی ہمہ گیر سیاسی تجویز عمل میں لانے کی جدوجہد نہیں کی۔ کانگریس کا وجود کوئی پچیس سال بعد یعنی ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ اس وقت کانگریس کا اس وقت سے مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہاں اب گویا اس کی کوشش شروع ہوئی کہ ہندو، مسلمان، عیسائی سب یک دل ہوکر ایک نصب العین مقرر کریں اور ملک کی بہبود کے لئے ہمہ تن ایک ہوکر کوشش کریں۔ یہ خیالات ابھی بہت خاص طبقہ تک محدود تھے۔ عوام کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ شروع میں جب مسٹر ہیوم نے کانگریس کو وجود میں لانے کا خیال قائم کیا تھا تو اُن کا انتشار زیادہ تر سماجی و فطری معاملات کی درستی تک تھا۔ مگر صورت حال بدل گئی اور رفتہ رفتہ یہ جماعت خالص سیاسی ہوگئی۔

سب سے پہلی بار ۱۹۰۵ء میں زندگی کی کشمکش سے پریشان ہوکر ہندوستانیوں کو خیال آیا کہ اگر ہم اپنے ہی ملک کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کریں تو تجارت میں بھی

ترقی ہو اور غریبوں کو محنت سے چار پیسے بھی زیادہ ملنے لگیں۔ دو وقت نہ سہی ایک وقت کی روٹی کا سہارا ہو جائے اور ممکن ہے کہ سلطنت برطانیہ بھی ہماری عرضداشت سنے۔ اس خیال کا بڑا عملی میدان کپڑے کی تجارت تھی۔ اس شعبہ پر بہ نسبت اوروں کے کچھ زیادہ اثر پڑا۔ ہماری شاعری نے بھی حسب معمول اپنے ماحول کے جذبات کی ترجمانی شروع کردی۔ اگرچہ یہ کوئی ایسا رجحان نہ تھا جو براہ راست ادب پر اثر انداز ہوتا۔ لیکن مجموعی احساس تبدیلی میں اسے بھی شامل سمجھنا چاہیئے۔

اکبر نے آغاز تحریک سودیشی میں کہا ؎

داخل مری دانست میں یہ کام ہے پُن میں — پہنچائے گا قوت شجر ملک کی بُن میں
تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر — کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دُھن میں

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

کامیابی کا سدیشی پہ بہر اک در بستہ ہے — جو پخ طوطا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہے

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

دُھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دیہاتی — بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

لیکن اس تحریک میں نہ ہندوستان ہی نے عام طور سے دلچسپی لی اور نہ اُردو کا رجحان اس طرف زیادہ ہوا۔ اُردو نے شروع میں ملکی کام یہ کیا کہ ہندوستان اور ہندوستان کے قابل قدر، پہاڑ، دریا، مقام، اشخاص، موسم پر متعدد اور مختلف نظمیں لکھ کر لوگوں کے دلوں پر اس کی عظمت اور محبت کی مہر ثبت کرادی۔ دلچسپ طریقوں اور نظموں سے یہ ذہن نشین کرادیا کہ ہندوستان تمھارا وطن ہے اس کی عظمت و عزت

تم پر فرض ہے۔ اسی کی قسمت کے ساتھ تمھاری زندگی کا بھی فیصلہ ہے۔

خاکِ ہند، برسات، برکھا رت، حبِّ وطن، ہمالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت وغیرہ اسی خیال پر مبنی ہیں۔ اس سلسلہ میں نمونہ کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے — دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے — اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُرضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی
اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری — چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری — چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِ کہن میں

. . . .

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا — آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا — تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

اس سلسلہ میں اردو شعرا نے ہندو مسلم اتحاد کو بھی پیشِ نظر رکھا اور قوم کی

شیرازہ بندی کے لئے اس پر زور دیا کہ ہم سب ایک ہی ہیں۔ اس ضمن میں تھوڑے سے اشعار پیش کر دینا بیجا نہ ہوگا؎ اکبر

ہندو مسلم ایک ہیں دونوں یعنی دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن، ہم زبان، ہم قسمت کیوں نہ کہدوں کہ بھائی بھائی ہیں

. . . .

رعایا کو مناسب ہے کہ باہم دوستی رکھیں حماقت حاکموں سے ہے توقع گرم جوشی کی

. . . .

وہ لطف ہندو و مسلماں میں ہیں کہاں اغیار ان پر گزرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا زباں کی بحث ہے سخت مضر یہ نسخۂ گاؤزباں

. . . .

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

قومیت کے جذبات سے متاثر ہو کر ایک جگہ اکبر نے کتنی دور اندیشی کی صلاح دی ہے؎

خواہش ہے اگر تجھ کو غنی بننے کی دولت کی ہوس اور دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ہندی کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

حالی کی بھی ایک رباعی ملاحظہ فرمایئے؎

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

اقبال کا وہ مشہور شعر سب کو یاد ہے ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس سلسلہ میں ان کا نیا شوالہ، قابل دید ہے شاید اتنے خوبصورت اور بیباکانہ انداز میں اس سے پہلے اتفاق و اتحاد کی تلقین نہ کی گئی ہوگی۔ یہ نظم چھوٹے بڑے سب کی زبان پر ہے یا کم سے کم سنی ہوئی ہے۔ اس لئے چند ہی اشعار پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

. . . .

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

. . . .

اردو شاعری کا سیاسی رجحان سلف گورنمنٹ کے مطالبہ ۱۹۰۶ء کے ساتھ کچھ بڑھا اور پھر جیسے جیسے سیاسی تحریک آگے بڑھتی گئی ویسے ہی یہ رجحان بھی رفتہ رفتہ تیز ہوتا گیا۔ اصل میں ہماری شاعری نے ۱۹۱۶ء کے ہوم رول کی تحریک میں لطافت خلوص اور جوش کے ساتھ حصّہ لیا۔ اس سے پہلے نہ تو سیاسی فضا پر زور تھی اور نہ یہ تحریک عام ہوئی تھی اور نہ بظاہر کوئی خاص ملکی مفاد ظہور میں آیا تھا۔ معمولی اصلاحات اور کچھ قانون کی سختی ہیں کمی تمام دردسری کا نتیجہ نظر آتا تھا۔ کونسلوں کے ممبر ہونے کی خواہش لوگوں میں وبا کی طرح عام تھی۔ ابھی چونکہ لیڈروں نے کوئی ایسی قربانی بھی

نہیں کی تھی کہ ان کی قیادت پر سب کو اعتماد ہوتا اس وجہ سے زیادہ خیال یہ تھا کہ نام و نمود کے لئے لوگ ممبر ہونا چاہتے ہیں۔ اردو شاعری نے بھی اس طرف بہت سرسری نظر سے دیکھا۔ اپنے خاص انداز میں کونسلوں اور ممبروں کے متعلق کبھی کبھی اکبر کچھ کہہ جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور سے لیڈروں کے متعلق کیا رائے تھی۔ ہم اکبر کے چند اشعار پیش کرکے اس سلسلہ سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں ؎

کمر باندھی بھی یاروں نے جو راہِ حبِّ قومی میں
وہ بولے تو نہیں چلتا وہ بولے تو نہیں چلتا

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

کمیٹیوں سے نہ ہوگا کچھ بھی غرض اگر مشترک نہ ہوگی
خیالِ ملت نہ ہوگا جب تک مفید ہرگز یہ بات نہ ہوگی

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

کونسل میں اگر پرسش نہ ہوئی مغموم نہ تم اے یار رہو
اللہ بلانے والا ہے مرنے کے لئے تیار رہو

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

ڈیلی گیٹوں نے جو شملے میں بہم کی ہے صلاح
بعد عمدہ کھانے کے ایسی ڈکاریں ہیں مباح

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

سنٹرل بھی ہو کمیٹی اور پراونشیل بھی ہو
حامی پبلک بھی ہو نزد جناب کونسل بھی ہو

بابوؤں کی طرح لیکن غل سے کچھ مطالبہ ہو
کردیں بس توضیح جزو کل سے کچھ مطلب نہ ہو

عزت ملی ہے شرکتِ کونسل کی شیخ کو
غازہ مل گیا ہے رخِ فاقہ مست پر

ہنگامہ یہ ووٹ کا فقط ہے — مطلوب ہر ایک سے دستخط ہے
ہر سمت مچی ہوئی ہے ہلچل — ہر در پہ یہ شور ہے کہ چل چل
ٹم ٹم ہو کہ گاڑیاں کہ موٹر — جس پر دیکھو لدے ہیں ووٹر
شاہی ہے یہ یا پیمبری ہے — آخر کیا شے یہ ممبری ہے
نیٹو ہے نمود ہی کا محتاج — کونسل تو ہے اُنکی جن کا ہے راج

سلف گورنمنٹ اور اس کی دلچسپی و اثر کے متعلق بھی اکبر نے اسی طرح ہلکے ہلکے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ مثلاً ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا — اچھے اچھے ہیں ووٹ کے شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ — اس کو سمجھیں فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی — سلف گورنمنٹ آگے آئی

. . . .

پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی — ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی
قوم پہ ممبری کا فیر ہوا — کل جو اپنا تھا آج غیر ہوا
شیخ جی مر گئے کمیٹی میں — غل مچا خاتمہ بخیر ہوا

. . . .

تقلیل غذا میں ہو پیپر منٹ یہی ہے — کر ضبط ہوس سلف گورنمنٹ یہی ہے

. . . .

کام اس ملک میں ہو سلف گورنمنٹ سے کیا
زہر کو ہضم کرے کوئی پیپر منٹ سے کیا

مجھ سے ہے عذر غیر کو کونسل کا ووٹ ہے
واللہ اس ستم کی مرے دل پہ چوٹ ہے

ترکیب ضلع کل نہ نبھی دل پہ چوٹ ہے
سب سے بچے تو لیجئے کونسل کا ووٹ ہے

ہوم رول کی تحریک

اس نمونے کے پیش کرنے سے صرف اردو شاعری کے سیاسی رجحان کا ارتقا بیان کرنا تھا ورنہ حقیقت میں انہماک و بیباکی اور زیادہ متانت تو اس رجحان میں جیسا ابھی کہا جاچکا ہے ۱۹۱۵ء سے آیا۔ یہ زمانہ ہوم رول کی تحریک کا تھا۔

ہوم رول کی تحریک نے چکبست کی شاعری کو اور چکبست کی شاعری نے ہوم رول کی تحریک کو عوام تک پہنچانے میں باہمی امداد کا حق ادا کردیا۔ یہ زمانہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں نہایت اہم ہے۔ اپنی غلامی کا احساس اور آزادی کا خیال پورے ہندوستان کو کم و بیش ہوچکا تھا۔ کانگریس میں مسز اینی بسنٹ کے شریک ہونے سے ہوم رول کے مطالبہ کو بڑی قوت مل گئی۔ انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ ہوم رول کے دفاتر قائم کئے گئے تاکہ پروپگنڈا کرکے دلوں کو مسخر کیا جائے۔ ہر دو جگہ تحریر و تقریر سے اس تحریک کو پر زور بنایا جا رہا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں متحد ہوکر آوازیں بلند کر رہی تھیں کہ ہندوستان کو آزاد کردیا جائے جس طرح دوسری نوآبادیات کو اپنے ممالک کے انتظام کا حق حاصل ہے اسی طرح ہم کو بھی ہندوستان میں ملنا چاہئے۔ اب رہنمایان ہند بھی اس تحریک کے سلسلہ میں قید ہونے لگے دلوں میں جوش اور جوش میں تازگی آنے لگی۔

چاروں طرف فضا میں آزادی کا احساس دیکھ کر اُردو نے بھی قومی زبان ہونے کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھا کہ اس تحریک کی اشاعت میں حصّہ لے۔ چکبست اس کام کے لئے بہت موزوں نظر آئے۔ ان کو ہوم رول کے میدان میں آگے بڑھادیا۔ چکبست نے اس انتخاب پر اپنی شاعرانہ صلاحیت سے داد دی۔ ان کا پیمانۂ دل قومی جذبات سے لبریز ہورہا تھا۔ موقع مناسب پایا جذباتی رنگ دے کر اتنی دلکش نظموں میں دنیا کے سامنے ہوم رول کے مطالبات پیش کئے کہ عوام و خواص دونوں میں ان کی شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ ان کے اشعار ہر سیاسی و نیم سیاسی مجلس کے لئے باعث زینت ہوئے۔

سیاسی دنیا کی حکیمانہ اور واعظانہ گفتگو عوام کے لئے کم سے کم اس زمانہ میں خشک و غیر دلچسپ تھی۔ چکبست کی نظموں نے اس قسم کے احساسات کی تاریکی میں جگنو کی روشنی کا کام دیا۔ تھوڑی سی رنگین و دلچسپ باتیں بھی ان نظموں کے بھیس میں ایسے لوگوں کو مل جاتیں تو ان کی اُلجھن کم ہو جاتی۔ گنگناتے کچھ اشعار پڑھتے جاتے خود بھی اثر لیتے دوسروں کو بھی متاثر کرتے۔ اس رجحان نے دوسرے شعرا کو بھی اس سیاسی تحریک میں دلچسپی لینے پر مائل کیا۔ چھوٹے بڑے شعرا کچھ نہ کچھ اپنے طور پر ملک کے مذاق کا اندازہ کرکے اخباروں، رسالوں اور جلسوں کی اپنے کلام سے زینت بڑھاتے رہے۔ یوں تو چکبست کے علاوہ اور شعرا مثلاً ظفر علی خاں، اکبر وغیرہ بھی وقتاً فوقتاً سیاسی نظمیں کہتے رہے لیکن ہوم رول کے سلسلہ میں سب سے سربرآوردہ چکبست ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کا سیاسی معیار بالکل وہی ہے جو اس وقت کے لیڈروں کا تھا یعنی حکومت ہند

سے آزادی کا مطالبہ کرنا اور برٹش حکومت کی وفادار رعایا رہنا۔ اور وقت ضرورت جا و بیجا گورنمنٹ کی مدد کرنا۔ لیکن اگر ہندوستانیوں پر آزادی کے سلسلہ میں ظلم ہو تو شکوہ و فریاد سب سے بلا تکلف کام لینا مثلاً ؎

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار　　ہمالیہ سے اُٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار　　ہوئی ہیں خاک کے پردہ میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

. . . .

ہے آج کل کی ہوا میں وفا کی بربادی　　سُنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی　　اُڑا ہے باغ سے بو ہو کے رنگ آزادی
ہمارے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے
جو آج کل ہے محبت وطن کی عالمگیر　　یہی گنہ ہے یہی جرم ہے یہی تقصیر
زباں ہے بند قلم کو پنہائی ہے زنجیر　　بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر
ہے دل میں درد مگر طاقتِ کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

. . . .

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی　　تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی　　غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا　　رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا　　دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

چکبست کی ایسی نظموں میں خالی جوش و نمائش نہیں بلکہ انقلاب کی دلچسپ اہمیت اور ہمت افزائی بھی موجود ہے۔ اپنے وطن کی تعریف بھی کرتے ہیں، اور پھر غیرت دلانے کے لئے اپنی بیکسی اور وطن کی بربادی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ غرض متعدد عنوانات سے میدان عمل میں لوگوں کو لانے کی کوشش کرتے ہیں ؎

اہل وطن مبارک تم کو یہ بزم اعلا　　جس میں نئی امید دل کا ہے نیا اجالا
دنیا کے مذہبوں سے یہ رنگ ہے نرالا　　مسجد یہی ہے اپنی اور ہے یہی شوالا
ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے
اپنے دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے

شیدائے بوستاں کو سرو سمن مبارک　　رنگین طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک　　ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

اس خاکِ دلنشیں پہ بادل سا چھا رہا ہے ‏ ‏ طوفان بیکسی کا ہم کو ستا رہا ہے
لیکن یہ دورِ حسرت دنیا سے جا رہا ہے ‏ ‏ مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آ رہا ہے
برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہونگے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

اسی سلسلہ میں چکبست کے متعلق یہ بھی لکھ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اس تحریک سے دلچسپی لی تھی۔ بلکہ اس تحریک سے دلچسپی لینے والوں سے بھی ایک خاص قسم کی عقیدت کا اظہار وقتاً فوقتاً خلوص اور جوش سے کرتے رہے۔ ان کے کہے ہوئے مرثیے اس امر کی شہادت کے لئے بہت کافی ہیں۔ جب کبھی کسی خاص رہنما کا انتقال ہوتا تھا تو اس کا ماتم نہایت جوش کے ساتھ اپنی شاعری میں کرتے تھے۔ مرثیہ کہتے وقت مرنے والے کے کردار خصوصیات پر یہ یک وقت تنقیدی اور جذباتی نظر ڈالتے تھے۔ اس کے کارناموں کو سراہتے تھے۔ اور اس کے اُٹھ جانے سے جو ملک و قوم کا نقصان ہوتا ہے اُسے بہت درد کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں چکبست آپ اپنی مثال ہیں۔ اردو شاعری میں اس لحاظ سے ان کا کوئی حریف نہیں نظر آتا۔

زندہ و مردہ ہندوستانی قومی لیڈروں کی شان میں چکبست ایسی نظمیں کہتے رہے جس سے ممدوح کی عظمت اور مدّاح کی اُنسیت و خلوص کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ گوکھلے اور تلک کے مرثیے، اینی بیسینٹ اور گاندھی کی عظمت

ہیں پیامِ عقیدت ہمارے اس خیال کے بیّن ثبوت ہیں۔ ان کی یہ سلسلہ جنبانی رفتہ رفتہ ایک رجحان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے نوجوان بھی اس قسم کی نظمیں کہنے لگتے ہیں۔

غزل وقصیدہ وغیرہ

اُردو کا سیاسی رجحان ۱۹۱۸ء کے بعد ایک دوسرا رُخ اختیار کرتا ہے جسے ہم آگے چل کر پیش کریں گے لیکن اب تک کی جدید شاعری کے رجحانات کی بحث بغیر دوسرے اصناف سخن پر تنقید کئے ہوئے ختم کرنا بحث کو تشنہ رکھنا ہے۔ اس لئے غزل و قصیدہ اور رباعی کی ترقی یا تنزل کا بھی بیان کر دینا ضروری ہے تاکہ رجحانات کی نشوونما یا کشمکش کا اندازہ ہو سکے۔

اس دور میں بھی یعنی ۱۹۱۸ء کے پہلے تک غزل، قصیدہ، اپنے پورے زور کے ساتھ ادبی میدان میں چل رہے تھے۔ لیکن رجحانات میں تھوڑی سی تبدیلی نظر آنے لگی تھی۔ جو طبقہ پرانے اسکول کا مطیع و پیرو تھا وہ بالکل اسی راستہ پر چل رہا تھا جہاں سودا، ذوق، ناسخ، غالب، مومن، آتش وغیرہ نے چھوڑا تھا۔ اس وقت کے سربرآوردہ اور قابل ذکر شعراء جلال، منیر، ریاض، امیر، داغ، امانت، کلب علی خاں، آمیر، اکبر، عشق، نساخ، بیان یزدانی، تسلیم، آتش، محمد جان شاد، نظم طباطبائی، شاد عظیم آبادی، حالی، اصغر، آسی، وحشت، ثاقب، سائل، صفی، حسرت، عزیز وغیرہ تھے جن میں سے بجز چند کے اور سب پرانے کاروان ادب کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ اس وقت بھی ان کی غزل گوئی کا رجحان کم و بیش وہی تھا جو ابتدا ہی سے چلا آرہا تھا

موجودہ رُجحانات کا تجزیہ

جنگِ عظیم کے اثرات ۱۹۱۸ء تاریخ عالم میں نہایت اہم سال ہے۔ صرف ہندوستان نہیں بلکہ تمام دنیا میں ذہنی، اقتصادی، سیاسی، انقلابات کا سیلاب آگیا۔ اسی سال یورپ کی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ ہزیمت خوردہ ممالک بری طرح سے پامال ہوئے ان کے حدود داثر کم کر دیے گئے۔ آمدنی کے ذرائع بھی بہت کم ہو گئے۔ تاوان جنگ میں ملکی و قومی اثاثہ بھی لے لیا گیا۔ نئے نئے ممالک پیدا ہو گئے ظفریاب ممالک کو فتح یابی سے اپنی ذات پر مغالطہ ہوتا گیا۔ خود پسندی و خودستائی کے علاوہ تمام عالم کو اپنے زیرنگیں کر لینے کی صلاحیت محسوس کرنے لگے۔

ہندوستان کے لئے بھی یہ سال نہایت تاریخی تھا۔ مختلف و متعدد انقلابات رونما ہو رہے تھے۔ صوبۂ بمبئی کے کیرا ضلع میں قحط پڑا کاشتکاروں نے لگان معاف کرانے کی درخواست دی مگر بے سود مہاتما گاندھی نے ضلع چمپارن (صوبہ بہار) کے کاشتکاروں کے لئے جو کامیابی حاصل کی تھی اس کی بنا پر کیرا، میں بھی کاشتکاروں کی ہمت افزائی کی۔ لگان بند کرا دیا۔ ستیاگرہ کی ابتدا کر دی اور کامیابی بھی ہوئی یہیں سے کاشتکاروں کو بلکہ اوروں کو بھی اپنی قوت کے اندازہ کرنے کا سبق ملا۔ احمد آباد کے کارخانوں میں بھی سرمایہ داروں اور مزدوروں کے مقابلہ میں آخر الذکر کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی کانگریس کا اثر مزدور پیشہ جماعت میں زیادہ پھیل گیا ۱۹۱۷ء میں کانگریس نے سالانہ اجلاس کے

موقع پر یہ تجویز منظور کر لی تھی کہ ۱۹۱۶ء میں سلطنت برطانیہ کو ایک ایسا قانون (Bill) پاس کر دینا چاہیے کہ ایک محدود مدت میں نوآبادیات کے اصول نظام کے مطابق ہندوستان کو بھی آزادی دی جائے[1] اب کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت نے سلطنت برطانیہ کو اس قسم کے قانون کے لئے مجبور کرنا چاہا۔

اس مطالبہ میں کچھ امید کا شائبہ بھی تھا کیوں کہ ہندوستانی فوجوں نے یورپ وغیرہ جا کر سلطنت برطانیہ اور اس کے حلیفوں کی اس شان سے امداد کی تھی کہ جس کی داد تمام یورپ دے رہا تھا لہٰذا عام خیال یہ تھا کہ شاید اس کے صلہ میں ہندوستانیوں کو کسی شکل میں آزادی عطا کر دی جائے۔ مانٹیگو۔ چیمسفورڈ رپورٹ جون ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی جس میں ہندوستانیوں کو نظام سلطنت میں کافی حقوق دیئے گئے تھے۔ اور اس کا اثر کچھ اچھا پڑا۔ حالانکہ کانگریس کو اب اپنی قوت کا زیادہ احساس تھا مگر اس نے بھی چار و ناچار قبول کر لیا۔ لیکن رولٹ بل[2] نے پھر ہندوستانیوں کو صدمہ پہنچایا۔ تمام ملک میں صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ یہ انقلابی حالات ایک طرف اور ایک سال کے بعد جلیان والا باغ کا دردناک قتل عام ایک طرف، اس نے ہندوستانیوں کے جذبات کو بری طرح صدمہ پہنچایا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگ گئی۔ اتفاق سے خلافت کا مسئلہ بھی اسی زمانہ میں تمام سیاسی ہنگاموں کے زیر سایہ ایک مہتم بالشان حادثہ بن کر

---

[1] THE HISTORY OF THE CONGRESS - صفحہ ۲۰۳

[2] 〃 〃 〃 صفحہ ۲۶۶، صفحہ ۲۷۱

سلطنت برطانیہ کے سامنے پیش تھا مسلمانوں کو جو صدمے پہنچے تھے اس کے لحاظ سے وہ اب ہندوؤں کے دوش بدوش سلطنت برطانیہ کی مخالفت میں کام کر رہے تھے۔

سیاسی بیداری خلافت کی مختصر رُوداد یہ ہے کہ جنگ عظیم کے زمانہ میں لائڈ جارج وزیر اعظم سلطنت برطانیہ نے فرمایا تھا کہ "ہم اس لئے نہیں لڑ رہے ہیں کہ "ترکی" کو ایشیائے کوچک کے مشہور و زرخیز ممالک سے محروم کر دیں" لیکن جنگ ختم ہونے پر "سرپرستی" کے لئے فرانس اور انگلستان نے کل مقبوضات جو ترکوں کے زیرنگیں تھے آپس میں تقسیم کر لئے۔ مسلمانوں کا کہنا یہ تھا کہ جزیرۃ العرب معہ (MESOPOTAMIA) عراق، عرب، شام اور بیت المقدس کے ایک خلیفہ کے زیر حکومت رہنا چاہئے۔ اس مطالبہ اور وعدہ کی یاد دہانی کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی جد وجہد شروع کی، وائسرائے کی خدمت میں عرضداشت پیش کی، انگلستان بھی وفد بھیجا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اسکا ردِ عمل مسلمانوں میں ایک خاص سیاسی جوش کی صورت میں پیدا ہوا۔

۱۹۱۸ء کے بعد ہی ہندوستان کے سیاسی میدان میں مہاتما گاندھی کا پھریرا لہرانے لگا۔ کانگریس پر ان کی قیادت کی مہر ثبت ہوئی فضا میں "گاندھی جی کی جے" کے نعرے گونجنے لگے اور بقول جواہر لال نہرو صاحب "گاندھی جی کی سیاست تقریر کی نہ تھی بلکہ عمل کی تھی" کانگریس کے خیال میں سلطنت برطانیہ آئینی جد وجہد سے متاثر نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا گاندھی جی نے دوسری صورتیں اختیار

گیں۔ ایک انجمن ستیہ گرہ سبھا، کے نام سے اس لئے قائم کی کہ قانون شکنی کرکے اور لوگ جیل جائیں۔ ۶/ اپریل ۱۹۱۹ء پہلی مرتبہ تمام ہندوستان میں ہڑتال اور ستیہ گرہ کے لئے منتخب کیا گیا ایک نئی اور حیرت انگیز فضا تمام ملک میں پھیل گئی۔ جذبات وتاثرات سے آسمان و زمین معمور نظر آئے۔ شہر و دیہات یکساں اثر لے رہے تھے، دور دہ مقامات پر بھی سیاسی آثار نمایاں تھے۔ غالباً ہندوستان کی زندگی میں پہلا اتفاق تھا کہ دیہات و شہر دوش بدوش سیاسی میدان میں چل رہے تھے۔

۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر "ترک موالات" کی تحریک شروع کی۔ اس کی بنیاد تشددات پنجاب اور مسلہ خلافت پر تھی۔ ہندو و مسلمان دونوں شریک مطالبات ہو گئے۔ سرکاری خطابات واپس کئے جانے لگے۔ عدالتیں اور کونسلیں بائیکاٹ کی جانے لگیں۔ قانون شکنی کے سلسلہ میں لوگ قیدخانہ جانے لگے۔ ایثار و مصائب برداشت کرنے کی روح عام طور سے پیدا ہو گئی۔ کردار میں صداقت و استقلال پہلے سے زیادہ نمایاں ہوئے سیاسی احساسات اور وطن پرستی کا سیلاب تمام ہندوستان میں رونما ہوا۔ اس تحریک کے سلسلہ میں اکثر لوگوں کو لاٹھی اور گولیوں کے سامنے سر جھکانا یا سینہ سپر ہونا پڑا۔

جنگ عظیم کے زمانے ہی میں غلہ کپڑا اور دیگر ضروریات زندگی کی گرانی نے لوگوں کی اقتصادی حالت ابتر کر دی تھی اس کے بعد بھی کم و بیش ابتک وہی عالم رہا صنعت و حرفت کی حالت یہ تھی کہ کارخانے زیادہ تر (۷۰ فیصدی) انگریزی سرمایہ سے چل رہے تھے۔ دوران جنگ میں برطانوی جہازات افواج

واسلحہ جات وغیرہ سے جانے ہیں معروف تھے اور تمام ممالک اشیاے خام کے حاجت مند تھے۔ لہٰذا ہندوستان کی صنعت وحرفت کو ترقی کرجانے کا کافی موقع ملا۔ ہندوستانی سرمایہ داری کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی حشرات الارض کی طرح کارخانے پیدا ہو گئے۔ مزدوروں کی مانگ بہت بڑھ گئی مگر ان کے آرام کا خیال نہ کیا گیا کام کرنے کے گھنٹے ویسے ہی طولانی تھے جیسے جنگ عظیم کے پہلے اجرت کی بھی کم وبیش وہی شرح تھی۔ مزدوروں نے اپنی ضرورتوں اور مانگ کے لحاظ سے اُجرت میں اضافہ کا مطالبہ کیا۔ اپنی دوسری تکلیف کا بھی مداوا چاہا لیکن ابتدا میں سرمایہ داروں پر کوئی اثر نہ ہوا مزدوروں نے ہڑتال شروع کردی کارخانے بند ہوگئے۔ اپنے شدید نقصانات کا خیال کرکے کارخانوں کے مالکوں نے مزدوروں کی عرضداشت پر توجہ کی اور ہڑتالیں کچھ کامیاب ہونے لگیں۔ اب مزدوروں کو بھی اپنی قوت کا احساس ہوا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر ہڑتالیں اور جماعتیں باقاعدہ منظم کرلی جائیں تو متحدہ قوت، زیادہ بہتری کی صورت پیدا کرسکتی ہے۔ ۱۹۱۹ء میں مزدور پیشہ جماعتوں کی تنظیم شروع ہوئی ہڑتال کمیٹیاں قائم ہوگئیں جن کی وجہ سے ہڑتالیں زیادہ کامیاب ہونے لگیں۔

۱۹۱۸ء میں انفلوانزا کی بیماری ہندوستان کے لئے ایسی عالمگیر اور مہلک ثابت ہوئی کہ کوئی ۸۰ لاکھ آدمی مرگئے۔ مزدور طبقہ میں اس وبا کا حملہ کچھ زیادہ تیز رہا۔ اتنے مرے کہ کارخانوں میں ہر طرف مزدوروں کی مانگ ہونے لگی۔ مزدوروں نے موقع سے فائدہ اٹھاکر کارخانے والوں کے سامنے اور مطالبات پیش کئے مگر اس وقت تک اس جماعت کے پیش نظر صرف 'اجرت' کا مسئلہ تھا۔ اسی سلسلہ

میں اسکا بھی ذکر کر دینا چاہیے کہ جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی گولہ بارود کے کارخانے بند ہو گئے ہزاروں آدمی بیکار ہو گئے۔ سب کو نوکری کی فکر لاحق ہوئی اپنی پریشانیوں میں گورنمنٹ سے کافی بدظن ہو گئے۔

مزدوروں کی تحریک اتنی تیزی اور اثر کے ساتھ چل رہی تھی کہ صوبہ بمبئی کی گورنمنٹ کو ۱۹۲۱ء میں لیبر آفس اور ۱۹۲۲ء میں فکٹری ایکٹ بنانا پڑا۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کی جنگ کا سلسلہ برابر چلتا رہا۔ کبھی جھگڑا ہو جاتا اور کبھی میل، غرض کارخانوں میں نہ کام کرنے والوں کو اور نہ کام کرانے والوں کو چین نصیب ہوتا جس کو موقع ملتا فریق مخالف کو دبانے کی کوشش کرتا۔ ۱۹۲۳ء میں احمد آباد کے کارخانوں نے اجرت کم کر دی اس بات کی تاب مزدور کہاں لا سکتے تھے فوراً ایک اتنے وسیع پیمانے پر ہڑتال شروع ہو گئی کہ غالباً اس سے بڑی ہڑتال اس وقت تک کوئی نہ ہوئی تھی۔ تمام شہر اور بیرون شہر میں ہل چل مچ گئی۔ اسی طرح ۱۹۲۴ء میں سالانہ بھتے کے لئے ایک دوسری ہڑتال ہوئی۔ ہر ایک میں مزدور جماعت کامیاب ہوتی رہی اس کشمکش کو دیکھ کر بالآخر مرکزی حکومت کو ٹریڈ یونین ایکٹ بنانا پڑا۔ لیکن اس سے بھی باہمی اختلافات میں زیادہ فرق نہ ہو سکا۔

۱۹۲۸ء کی ہڑتال، مزدور تحریک میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے انجمن گرانی کامگار نے اس ہڑتال میں حصہ لیا۔ اور اتنے وسیع پیمانہ پر ہڑتال ہوئی کہ جس کا شہرہ صرف ہندوستان نہیں بلکہ تمام دنیا میں ہوا۔ اب مزدوروں کے لبوں اور جھنڈوں پر بالاعلان اشتراکی ترانے و نصب العین عام طور سے نظر آنے لگے گویا ابتک جو حجاب تھا وہ بالکل دور ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جان پر کھیلنے کو تیار

ہیں۔ بغاوت کے جرم میں اس تحریک کے خاص خاص لیڈر جہاں کہیں بھی ملے گرفتار کئے گئے۔ جملہ ۳۱ آدمی گرفتار ہوئے جن میں سے تین انگریز بھی تھے مقدمہ فیصلہ کرنے کے لئے میرٹھ تجویز ہوا۔ تخمیناً ۴ سال تک مسلسل مقدمہ ہوتا رہا فیصلہ کی نوبت بہت دیر میں آئی۔ اس درمیان میں مزدوروں نے اپنے مصائب کی اشاعت ساری دنیا میں اس قرینہ سے کی کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ... مزدوروں کی انجمن تھی سب نے ہمدردی کی، ہندوستان میں بھی ہر طرف اس مقدمہ کا چرچا رہا۔ سیاسی ذہنیت کو اور ابھرنے کا موقع ملا۔ اس سلسلہ میں جو لوگ گرفتار ہوئے تھے وہ خاص علمی قابلیت کے مالک تھے۔ پڑھے لکھے نوجوانوں میں اکثر اپنے خیالات کی اشاعت بھی کر چکے تھے اس وجہ سے بھی اور اس لئے بھی کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں سے نکل کر اکثر لوگ اپنی سند کو بیکار اور زندگی کو تلخ و دشوار گذار پاتے تھے کہیں نوکری یا گذر اوقات کے لئے قدم رکھنے کا ٹھکانا نہیں دیکھتے تھے۔ لہذا تنگ آمد بجنگ آمد کے اصول پر نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے مزدوروں کی موافقت اور سرمایہ داری کی مخالفت میں حصہ لینا شروع کر دیا اور اقتصادی بے چینی نے اپنا سیاسی ٹھکانا قومیت کی انتہائی منزل پر پایا۔

اشتراکیت کی نشو و نما ہندوستان میں

موجودہ زمانے میں اردو شاعری کی سیاسی ذہنیت زیادہ تر اشتراکیت کی طرف مائل ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اشتراکیت

کی نشوونما کا نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا جائے تاکہ اس ذہنیت کے پس منظر وارتقار کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ ممکن ہے کہ تنقید و مفہوم میں بھی سہولت پیدا ہو جائے۔

جنگ عظیم ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ روس میں کارل مارکس کے نظریہ پر عمل ہونا شروع ہوگیا۔ زار روس کی بے اعتدالیوں اور سختیوں کا اتنا بڑا اثر رعایا پر ہوا تھا کہ روسیوں کو یقین کر لینا پڑا کہ جب تک گورنمنٹ رعایا کی نہ ہوگی کوئی فلاح کی صورت نہیں پیدا ہو سکتی۔ وہ ایسی حکومت چاہتے تھے جو رعایا کی پوری نمائندگی کرے اور ہر چیز کی ذمہ دار ہو جائے۔ ملک کی ساری دولت حکومت کی سمجھی جائے اور حکومت رعایا کی، معاشرت کے لئے قواعد وضوابط منظم کر دے اور جملہ اخراجات کی ذمہ دار ہو جائے تاکہ کسی فرد بشر کو زندگی بسر کرنے میں تکلیف نہ ہو جہاں تک ممکن ہو بلا کسی حفظ مراتب کے معاشی زندگی میں مساوات کا پہلو قائم رکھا جائے یہ خیالات اتنی تیزی سے پھیلے کہ تمام ملک میں اس اصول کے لئے فضا پیدا ہو گئی اشتراکیت کا ہر طرف زور رہا، روس کیا بلکہ اس کے گرد و نواح میں بھی مارکس کے نظریہ کا اثر پڑا۔ ۱۹۱۸ء تک روس کا یہ سیاسی و اقتصادی انقلاب منظم ہو چکا تھا۔ ان خیالات کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے روسیوں نے انتہائی بیدردی سے بھی دریغ نہ کیا۔ زار روس اور اس کے خاندان کے چھوٹے بڑے ہر ایک کو اس بری طرح قتل کیا کہ دنیا میں کم ایسے واقعات پیش آئے ہوں گے۔ اس کے چند دن بعد ہندوستان میں خلافت کی تحریک زوروں پر ہوئی خلافت کمیٹی میں ایک تجویز یہ منظور ہوئی

کہ مسلمانوں کو احتجاج کے طور پر ہندوستان چھوڑ کر ترکی، افغانستان، تاشقند وغیرہ چلا جانا چاہیے کچھ لوگ اس پر عمل بھی کرنے لگے۔
ہجرت کرنے والوں میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو روس کی سرحد یا اس کے قریب تک پہنچ گئے اس میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو وہاں کے اشتراکی نظریہ سے متاثر ہوئے۔ ہندوستان کی حکومت پر بھی اس حربہ کو استعمال کرنا ضروری سمجھا۔ کچھ دنوں بعد جب خلافت کی تحریک اور ہجرت کا زور کم ہوا تو جانے والوں میں سے اکثر مہاجرین ہندوستان واپس آئے اور اپنے ساتھ روسی خیالات بھی لیتے آئے۔ جو لوگ زیادہ متاثر ہوئے انھوں نے خفیہ طور پر ان خیالات کی اشاعت شروع کر دی لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے اور راولپنڈی میں مقدمہ چلا۔ یہ ہندوستان کا سب سے پہلا COMMUNIST CONSPIRACY-CASE تھا۔
لوگ جیل میں بند ہو گئے مگر خیالات اسیر نہ ہو سکے۔ دوسروں کے دل و دماغ پر اثر کرتے ہی رہے گورنمنٹ نے رفع شر کے خیال سے پھر ایک مرتبہ چند نوجوانوں کو کمیونسٹ ہونے کے جرم پر گرفتار کیا اور ۱۹۲۳ء میں کانپور میں مقدمہ چلا کر سخت سزائیں دی۔
یہی وہ زمانہ تھا جس میں مزدوروں کی تحریک و شورش آئے دن ہندوستان کے کسی نہ کسی گوشہ میں پر اثر طریقہ پر ظاہر ہوتی رہتی۔ اشتراکی خیالات کی عملی ترجمانی کا اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا۔ مزدوروں کی جماعت میں اشتراکی اس طرح گھل مل گئے کہ پہچاننا دشوار ہو گیا۔ قانون کی زد سے بچتے ہوئے اپنے خیالات عوام میں بھی

پھیلانے لگے ترک موالات اور سول نافرمانی کی تحریکیں یکے بعد دیگرے بے اثر ہو چکی تھیں نوجوان اور پڑھے لکھے اس رویہ سے کچھ مایوس ہو چلے تھے۔ سوچتے تھے کہ کوئی دوسرا حربہ آزادی حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ قیدخانوں میں سیاسی قیدیوں کو جب فرصت ملتی تو اس قسم کا تذکرہ رہتا مختلف طریقے سوچے گئے اشتراکی نظریہ سب سے زیادہ کارگر معلوم ہوا۔

باہر نکل کر ان قیدیوں نے اشتراکیت کی اشاعت تمام ہندوستان میں کی اور کافی لوگوں کو متاثر کیا اس سے پہلے بھی محدود دائرے میں غیر منظم طور پر کام ہو رہا تھا۔ لیکن جب جواہر لال نہرو صاحب روس کے خیالات و حالات کا مطالعہ کر کے ہندوستان واپس آئے تو اس تحریک میں کچھ اور تیزی آگئی ۱۹۲۹ء میں جب وہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تو لاہور میں انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں اشتراکیت کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اور ۱۹۳۶ء میں جب لکھنؤ میں کانگریس کے دوبارہ صدر ہوئے تو انھوں نے اسے عام کرنے کی باقاعدہ کوشش کی۔ ۱۹۳۵ء میں کانگریس کے اندر ہی ایک جماعت "کانگریس سوشلسٹ" کے نام سے قائم ہوئی گویا اب باقاعدہ ایک ایسی جماعت بن گئی جو کسی نہ کسی شکل میں اشتراکیت کو ہندوستان لانا چاہتی تھی۔ اور یہ جماعت نہ صرف کانگریس میں بلکہ اس کے باہر بھی اس کی سرپرستی میں اپنے خیالات کی اشاعت چاہتی تھی تاکہ تمام ملک اثر لے سکے۔

قومی جذبات سے متاثر ہو کر ہندوستان کے طلبار کی انجمن "اسٹوڈنٹس فیڈریشن" کے نام سے جناح صاحب کی زیر صدارت ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی۔ اس نے بھی رفتہ

رفتہ اپنی جوانی کا ثبوت دیا اور انتہائی سیاسی نظریہ یعنی اشتراکیت کا اثر قبول کیا۔

اشتراکیت کا اثر صرف ہندوستان یا روس ہی پر نہیں پڑ رہا تھا بلکہ تمام دنیا اس سے متاثر ہو رہی تھی جرمنی میں ہٹلر کا عروج گویا فسطائیت کا شباب تھا۔ وہاں کے جبر و استبداد نے علم و اہل علم سب کو پریشان کر دیا۔ اپنے نظریہ کے خلاف وہاں کی حکومت نے جس چیز یا شخص کو پایا قابل آتش یا گردن زدنی سمجھا جمہوری نظام کو خطرہ میں دیکھ کر تمام دنیا کے بڑے بڑے زبردست علم داں جمہوریت دوست ۱۹۳۶ء میں فرانس کے دارالسلطنت پیرس میں اس لئے جمع ہوئے کہ فسطائیت کے خلاف آوازیں بلند کریں اور ادب سے زندگی و سکون کے پہلو پیدا کریں اس سے اثر لے کر لندن میں چند نوجوان ہندوستانی ادیبوں نے ایک انجمن ترقی پسند مصنفین بنانے کا ارادہ کیا جس کا منشا یہ تھا کہ ادب کو محض جذبات نگاری و فن کاری کے لئے وقف نہ کیا جائے بلکہ زندگی کے قریب تر کر دیا جائے مزدور، کاشتکار، مفلس، مظلوم کی سرگزشت بیان کر کے دنیا کو ان کا ہمدرد بنایا جائے اور ان کی اہمیت جتا کر خود ان کو ابھارا جائے تاکہ اپنی حالت درست کر سکیں اس کے برخلاف سرمایہ داری توہمات، ظلم، جبر و استبداد، فسطائیت، نازیت وغیرہ کے خلاف نظم و نثر میں مضامین لکھے جائیں۔ ہر چیز کو کارآمد طریقہ سے اس کے اصل مفہوم میں پیش کیا جائے۔ ان ہی سب خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں بھی ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو پہلی بار کل ہند انجمن ترقی پسند قائم کی گئی اس کا پہلا جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین، نے اردو زبان کے لئے بھی جابجا انجمنیں قائم کی ہیں جن کے رسالے اور تصنیفات لئے نظریہ کے تحت میں شائع ہوتی رہتی

ہیں۔ ہمارے موجودہ نثر و نظم لکھنے والے اکثر اسی انجمن سے تعلق رکھتے ہیں اپنی شاعری یا نثر نگاری کا انداز اسی انجمن کے رویہ کے مطابق رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اس سلسلہ میں پریم چند، جوش، احمد علی، سجاد ظہیر، مجاز، علی سردار جعفری، احسان دانش فراق، احتشام، سبط حسن، مجنوں گورکھپوری، اختر رائے پوری، وامق فیض احمد، راشد، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ممتاز، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی، راہی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

یہ تھے وہ سیاسی و اقتصادی حالات جن سے تمام ملک پر اثر پڑ رہا تھا اردو شاعری نے حسب معمول زمانہ شناسی سے کام لیا۔ ملکی تحریکات کی حمایت میں زبان کھولی اور اتنی تیزی سے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی کہ ہندوستان کی دوسری زبانیں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ کاشتکار، مزدور، سرمایہ دار، حکومت اس دور کے خاص موضوع قرار پائے۔ لیکن ان عنوانات پر رجحانات ستر کرنے سے قبل اردو شاعری ۱۸۵۷ء کی ہر سیاسی تحریک و دلچسپی میں حصہ لیتی رہی جیسے جیسے ملک کی سیاسی رفتار بڑھتی رہی ویسے ہی وہ بھی اپنی زبان تیز کرتی گئی۔ یہاں تک کہ آج عام طور سے نوجوانوں کا رجحان اشتراکی و سیاسی ہے۔

سیاسی رُجحان
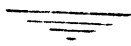
تحریک آزادی اردو کا سیاسی رجحان ۱۹۱۸ء کے بعد بالعموم ہندوستان کی ہر سیاسی قابل قدر و ہر دلعزیز تحریک سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ ابتدا میں خلافت، جلیان والا باغ کا قتل، ہندو مسلمان کا اتحاد، سائمن کمیشن کا مقاطعہ، آزادی کا مطالبہ، اور اس قسم کے دوسرے موضوعات پر طبع آزمائی ہوتی رہی گویا قوم کو نئی زندگی کی جد وجہد کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ شاعری کی رگ و پے میں سوراج کی لہریں دوڑائی جا رہی تھیں زبان میں نئے الفاظ و نئے خیالات برابر چلے آ رہے تھے۔ نثر و نظم دونوں میں سیاسیات کی جھلک پوری طرح سے جوش کے ساتھ نمایاں ہونے لگی جو صرف نقالی نہیں بلکہ جذبات کی اصل حالت کا بھی پتہ دے رہی تھی لوگوں کو امور ملکی سے عام دلچسپی ہو گئی مختلف سیاسی اغراض و مقاصد کا مطالعہ ہونے لگا نئے نئے نظریات پر رائے زنی ہونے لگی، شاعری میں جوش، زور، ابھار خیالات، ایثار کا ایک دریا موجزن ہو گیا اس زمانے کے رجحانات کو واضح کرنے کے لئے ہم مختلف موضوعات کے اشعار نمونہ کے لئے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جلیان والا باغ میں جرنیل اوڈائر نے ہندوستانیوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس تصویر کا ایک خاکہ ظفر علی خاں صاحب کی زبان سے سنیئے ؎

میں نے امرتسر میں اک دن اپنے خواجہ سے کہا　　　پیٹ کے بل رینگ لیجیے بندہ پرور آپ بھی

ایک تہ آماس کی تا زیست پر جائے چڑھ　　　کھائیے ہر روز صبح و شام ہنٹر آپ بھی

ناک سے کچھ دن زمیں پر کھینچتے رہیے لکیر　　　پھیریے کونچی سفیدی کی بدن پر آپ بھی

بعد مغرب جائیے مسجد کو اور اس جرم میں　　　پیٹھ پر کھنچوائیے چابک سے مسطر آپ بھی

. . . .

سجدہ ٹوپی کو نہ کیجیے اور اس کے ساتھ ساتھ　　　ورد حبّ من مّسد کا پڑھیے فرفر آپ بھی

چلئے سولہ میں دن ہیں ہاپنتے اور کانپتے　　　پاؤں میں کچھ روز ڈالے رہیے چکر آپ بھی

لیجیے جا کر جیل میں اور کھائیے ارہر کی دال　　　مہماں رہیے ذرا سرکار کے گھر آپ بھی

پھر یہ کہیے مارشل لا حشر تک قائم رہے　　　ورنہ ہوں گے منکر جرنیل اوڈائر آپ بھی

اسی طرح کی ایک دوسری نظم جرنیل اوڈائر کی یاد میں ہے اس کے بھی دو چار اشعار ملاحظہ ہوں۔

ولایت میں کھلا جب نامہ اعمال ڈائر کا　　　طراز نامہ تھا نام گرامی اوڈ ڈائر کا

ہلاکو کو عبث تاریخ میں بدنام کرتے ہیں　　　بچارے نے نہتوں پر دیا کب حکم فائر کا

مسلماں اور ہندو کو بھی ہے ناز اپنے سینے پہ　　　اسے گر غرہ ہے بارود گولی کے ذخائر کا

گاندھی جی نے اس زور شور سے ترک موالات کی تحریک ۱۹۲۰ء میں شروع کی کہ تمام ہندوستان میں ہل چل مچ گئی ساری فضا جوش و خروش سے معمور ہو گئی ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی تھی۔ گویا ایک خاموش جنگ ہندوستانیوں اور حکومت میں چھڑ گئی تھی۔ جنگ کے مصائب کے ساتھ ساتھ جوش استقلال، آزمائش، فتح شکست کی باہمی کشمکش سے جو جذبات مسرت، اضطراب و مایوسی کے پیدا ہوئے ہیں وہ شاعری کی

جان اور ادب کے ایمان بننے کے لئے بہت کافی ہیں ہر حساس ادیب اور جاندار آدمی ان جذبات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اگر قلم میں زور اور دل میں خلوص اور صداقت ہو تو کلام قوم کے لئے پیام بن کر قبول عام کا شرف بھی حاصل کر لیتا ہے اردو شاعری نے اپنے جاندار ہونے کا ثبوت تو دیا مگر یہ واقعات ایسا شاعر نہ پا سکے جو ان جذبات کو ابدیت سے ہمدوش کر دیتا۔

ترک موالات اور اہنسا، عدم تشدد، سول نافرمانی، سب کی طرف ہماری شاعری نے رخ کیا اور اس کا عام سیاسی رجحان ان ہی تحریکات کو نظم کرنا تھا۔ لیکن کوئی عمق یا خاص شعریت نہ پیدا ہو سکی اور یہ رجحان اوسط درجہ کی شاعری تک محدود رہا۔ شعراء میں جن لوگوں نے اس طرف پیش قدمی کی ان میں سے ظفر علی خاں صاحب کے کلام کے نمونے سے رجحان اور شاعری دونوں کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں گاندھی جی اور ان کی تحریکات کے متعلق فرماتے ہیں۔

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا	باطل سے حق کو دست و گریبان کر دیا
سر رکھ دیا رضائے خدا کی حریم پر	خنجر کو پھر حوالۂ شیطان کر دیا
ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر	آزادیٔ حیات کا سامان کر دیا
دشمن میں اور دوست میں ہونے لگی تمیز	کتنا بڑا یہ ملک پہ احسان کر دیا
دیکر وطن کو ترک موالات کا سبق	ملت کی مشکلات کو آسان کر دیا
شیخ اور برہمن میں بڑھایا وہ اتحاد	گویا انھیں دو قالب و یک جان کر دیا
اوراق جبر و جور و جفا کو بکھیر کر	شیرازہ سلطنت کا پریشان کر دیا
ظلم و ستم کی ناؤ ڈبونے کے واسطے	قطرہ کو آنکھوں آنکھوں میں طوفان کر دیا

تن من کیا نثار خلافت کے نام پر　　سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دیا
پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس　　گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

ترک موالات اور خلافت کی تحریک نے جو لوگوں میں امنگ اور قوت ضبط و ایثار پیدا کر دی تھی اس نے اردو شاعری کے سیاسی رجحانات میں کافی دخل کر لیا تھا۔ یہ خیال عام ہو چلا تھا کہ ہم جتنے مصائب برداشت کریں گے اتنا ہی آزادی حاصل کرنے کے جذبات کو تقویت ہو گی اور حکومت جتنی سختیاں کرے گی اتنا ہی اس کی بنیاد کمزور ہوتی جائے گی۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک دن ہماری قوت برداشت ہم کو اس مرتبہ پر پہنچا دے گی جہاں سے حکومت کا پرچم اتنا کم دکھائی دے گا کہ ہماری مظلومیت فاتحانہ انداز میں مسکراتی حقارت کی نظر ڈالتی بغیر توجہ کے اپنی منزل کی طرف بڑھ جائے گی۔

اسلامی ممالک کو غیروں کے قبضہ میں دیکھ کر خلافت کے سلسلہ میں ظفر علی خاں صاحب نے مئی سنہ ۲۲ء میں جو نظم کہی ہے اس میں یورپ کی شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

تیشۂ یورپ سے جڑ انصاف کی کٹ ہی گئی　　انقطاع رشتۂ مہر و وفا ہو ہی گیا
خوش ہو اے یورپ بر آئی تیری صدیوں کی امید　　ملک قسطنطنیہ سے آخر جدا ہو ہی گیا
تختۂ مشقِ جفا توحید والے کیوں نہ ہوں　　غلبہ شرق و غرب میں تثلیث کا ہو ہی گیا
کفر نے اسلام کا بیڑا کیا ہے گرچہ غرق　　ساتھ ہی اس کا بھی لیکن فیصلہ ہو ہی گیا
موت دیتی ہے مسلماں کو پیامِ زندگی　　منکشف اسلام پر رازِ بقا ہو ہی گیا
خونِ مسلم صرفِ تعمیرِ جہاں ہونے کو ہے　　اک نئی دنیا کا ساماں برملا ہو ہی گیا

اے مسلمانو اکر دو دار الاماں کا عزم تم　　ہم کو حکم خواجۂ ہر دو سرا ہو ہی گیا

ایک دوسری نظم "خروش مسلم" کے عنوان سے ہے جس سے جوش ایثار دونوں جذبات پہ روشنی پڑتی ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہے سودا جب سے لیلائے خلافت کا مرے سر کو　　جنوں نے حشر کا میدان بنایا ہے مرے گھر کو

. . . .

زمیں تھرا اٹھی آوازۂ اللہ اکبر سے　　خروشِ مسلمِ شوریدہ شرماتا ہے تندر کو

جلایا اس نے مردوں کو باذن اللہ قم کہہ کر　　جگایا اس نے ایک آواز میں ہندوستاں بھر کو

لگا دی سب کے دل میں ایک ساتھ اس نے لگن اٹھ کر　　ملایا اس نے مالابار کی سرحد سے خیبر کو

ظفر علی خاں کی ایک چھوٹی سی نظم "فانوس ہند کا شعلہ" اس سلسلہ میں اور دیکھ لیجیے تو جنگ آزادی کے جذبات کا اندازہ اور اردو کے سیاسی رجحان کی کچھ وضاحت ہو جائے۔

زندہ باش اے انقلاب اے شعلۂ فانوس ہند　　گرمیاں جس کی فروغ شعلِ جاں ہو گئیں

بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی خاموشیاں　　تو نے صور اپنا جو پھونکا محشرستاں ہو گئیں

جن بلاؤں سے گھرے رہتے تھے صبح و شام ہم　　تیرے آتے ہی وہ انگریزوں کی درباں ہو گئیں

جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون کی　　قصر آزادی کی آرائش کا ساماں ہو گئیں

مرحبا اے نو گرفتارانِ بیدادِ فرنگ　　جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہو گئیں

زندگی ان کی ہے دین انکا ہے دنیا انکی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہو گئیں

اقبال نے خلافت کے سلسلہ میں چند اشعار کہے ہیں۔ ان کو بھی سن لیجیے اور

دیکھیے کہ انداز بیان اور نظریہ میں کتنا فرق ہے ؀

دریوزۂ خلافت

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

"مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی"

خلافت اور ترکِ موالات کے زمانے میں جو ہندو مسلم اتحاد ہو گیا تھا اس کا ردِ عمل بھی غالباً فطری تھا۔ مگر بہت جلد ظہور میں آیا جب سیاسی تحریک میں ضعف پیدا ہوا اور گاندھی جی نے ترکِ موالات کی تحریک کو خیرباد کہا تو وہ قوت اپنا مظاہرہ کئے بغیر نہ رہ سکی جو حکومت کے خلاف لوگوں میں پیدا ہو گئی تھی اس مادہ کا اخراج بھی ضروری تھا۔ ہندو مسلمان مذہبی امور پر خود لڑنے لگے۔ مذہب کی وجہ سے تو کم لڑنے کے لئے زیادہ لڑے مسلمانوں میں تنظیم و تبلیغ کا زور، اور ہندوؤں میں شدھی و سنگٹھن کا شور ایک دوسرے کے ضد و مقابل سمجھا جانے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ فساد ہر جگہ بلوہ، غرض ۱۹۱۸ء کے بعد جو اتفاق و اتحاد کا سیلاب آیا تھا وہ نہ صرف بہہ گیا بلکہ اپنی یادگاریں کچھ ایسے گڑھے پیدا کر گیا کہ دونوں قوم کے مذہبی پرستار اس کو نجات کا راستہ سمجھے۔ مذہب کے نام پر انسان کی قربانیاں کی

گئیں۔ اور ان ہی گڑھوں میں قومی خون بھر اگیا۔ الہ آباد میں بر کت اللہ قتل کیے گئے[1] دہلی میں سوامی شردھانند اور اس قسم کے خدا جانے کتنے اور فرزندان وطن جوش ملت کے شکار ہوئے۔ اس قتل و خون کی وجہ سے ہند و اور مسلم اتحاد کو سخت نقصان پہنچا۔

اس افتراق کا بھی اثر اردو شاعری کے رجحان پر پڑا متعدد نظمیں اور غزلیں ان مقتولوں کی عظمت اور مذہبی جوش کی حمایت میں اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئیں معمولی دل و دماغ کے اکثر شعرا نے مذہب کی اس تحریک کو اپنا موضوع بنایا لیکن ایسے کلام کا جو کچھ ذخیرہ ملتا ہے وہ عموماً سطحی اور غیر مفید ہے۔ نہ ادب کے لئے کوئی اضافہ تھا اور نہ قوم وملت کو کسی صحیح راستہ پر لے جانے کے لئے چراغ راہ۔

اتنا ضرور ہوا کہ چند ہندی کے نامانوس اور نئے الفاظ جو اصطلاحی تھے وہ اردو میں تھوڑے دن کے لئے جگہ پا گئے سربرآوردہ لوگوں نے اس قسم کے موضوعات پر بہت کم توجہ کی۔ صرف ظفر علی خاں کا کلام کبھی کبھی اس موضوع پر مل جاتا ہے جس میں کبھی ان جذبات و تحریکات کا ماتم ہوتا ہے کبھی شدھی و سنگٹھن کے خلاف صدائے احتجاج۔ ہم جا بجا سے ان موضوعات پر بہارستان سے اشعار پیش کرتے ہیں ؎

"گاندھی"

بردولی کے بعد

گاندھی کے اس بسائے ہوئے گھر کو آہ آہ دست فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا

---

[1] ۱۹۲۴ء الہ آباد میں دسہرہ کے زمانہ میں۔

لب و لہجہ میں قنوطیت کے بجائے رجائیت کا غلبہ ہوا۔ با لاعلان لوگوں کو میدان عمل میں ملوکیت کے خلاف دعوت دی گئی۔ الفاظ مبہم نہ تھے۔ مضامین صاف تھے آواز میں تلواروں کی جھنکار تھی۔ اس طبقہ کی طرف رخ تھا جس کو افلاس نے مزدور، کسان اور غریب کا لقب دیا تھا۔ مدح تھی مگر امراء و سلاطین کی نہیں۔ یہ شاعری اس قسم کی ذہنیت فراموش کر چکی تھی کہ ع

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

اب بدلا ہوا زمانہ تھا ہر تجمل حسین خاں، کے جبر و استبداد کا پردہ ہماری سیاسی شاعری چاک کر رہی تھی۔ اب ان لوگوں کی قصیدہ خوانی ہو رہی تھی جو باوجود کار آمد ہونے کے بھی کس مپرسی کے شکار تھے۔ روس کے انقلاب نے ہندوستان کے مزدوروں کو بھی ہمت دلائی۔ اب ان کی بھی اہمیت کچھ ہو گئی۔ گزشتہ صفحات میں مزدور تحریک کی ارتقا کی دھندلی سی تصویر دکھائی گئی ہے۔ وہ آئینۂ سیاست میں تھی اب آئینۂ شاعری میں بھی ذرا اس کا عکس ملاحظہ فرمائیے۔ غالباً یہ روس ہی کے انقلاب کی طرف اقبال نے اشارہ کیا تھا کہ ؎

آفتابِ تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا　　آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

اس قابل قدر نظم (خضر راہ) میں خضر، کی زبان سے اقبال نے سرمایہ و محنت کے متعلق جو کہلایا ہے وہ اس قدر عمدہ ہے کہ یہاں اس کے چند اشعار بغیر پیش کئے ہم رہ نہیں سکتے۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے　　خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر　　شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ — خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے — سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ان اشعار سے پہلے اسی نظم میں رازِ سلطنت و انجام حکومت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

زیرِ بحث موجودہ اردو شاعری کے لب و لہجہ میں تیزی اور پکار میں شدت کی ابتدا اقبال سے ہوئی۔ اور ایک کارآمد تلخی و غیظ و غضب کا اضافہ جوش کی ذات سے ہوا انھوں نے الفاظ کے رنگیں پردوں میں بھی جذبات کی نشتریت چھپانا ننگ و عار سمجھا۔ میدان شاعری میں للکار کر ایک آواز دی جس میں

دلوں کو ملا دینے کی قوت تھی، پر پرواز کو سمیٹنے سے پہلے اُڑ جانے کی تحریک تھی۔ وہ اشارے و کنائے سے میدان عمل میں بلانے کا قائل نہیں کمینگاہوں سے چھپ چھپ کر کمک پہنچانے میں بزدلی کا عنصر پاتا ہے اسکا قول ہے

یا اوڑھ لے اے زہرہ جبیں مقنع چادر　　یا کھینچ لے اے مرد خدا میاں سے تلوار

. . . .

یا رقص کی محفل میں بجا تال سے گھنگرو　　یا جنگ کے میدان میں سنا تیغ کی جھنکار

غرض اس دور میں ہماری شاعری کے سیاسی رجحان میں شدت و وسعت پیدا کرنے کے ذمہ دار جوش ہیں۔ مزدور، کسان وغیرہ کے متعلق انھوں نے شدومد سے جذبات نظم کئے ہیں کہ شاعری کو حق خدمت گزاری سے سبکدوش کرادیا۔ ان کو دیکھ کر یارنگ زمانہ سے متاثر ہو کر دوسرے نوجوان شعرا نے بھی مظلوم و غریب پیشہ وروں پر طبع آزمائی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس موضوع پر ایک اچھا خاصا ذخیرہ اکھٹا ہو گیا۔ اردو شاعری کی گزشتہ بے التفاتی و بے اعتنائی کی تلافی ہو گئی۔ حیات عامہ کا پورا نقشہ نظر آنے لگا مفلس و نادار عورت و مرد کا تذکرہ اس خوبی سے ہوا کہ ہر ایک کی نظر التفات انکی طرف پڑنے لگی۔

اس قسم کی شاعری میں ایک خاص اعتماد کا عنصر ہے انسانی قدرت کی وسعتوں پر کافی توجہ ہے جس کا مقصد ہندوستانیوں کو بزدلی اور احساس کمتری کے شدید جذبہ سے الگ کرنا ہے جد وجہد کے میدان میں لانے کے لئے خود اعتمادی کا پیدا کرنا ضروری ہو گیا فریق مخالف کی چیرہ دستیوں کا مبالغہ کے ساتھ ذکر کرنا

بھی مقابلہ کے۔ لئے ہمارے شعرا کو خاص چیز نظر آئی اس کو بھی کام میں لائے۔ انقلاب و بغاوت اور آزادی کی اہمیت و ماہیت کو سمجھنا بھی مفید مطلب سمجھی کہ اس دور میں ان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی تاکہ جوش وجانبازی کے جذبات پیہم متحرک ہوتے رہیں۔ الطاف مشہدی کے "لمحات آزادی" سے چند شعر اس سلسلہ میں ملاحظہ ہوں ؎

فرشتوں کی پاکیزہ ہستی سے بڑھ کر گھٹاؤں کے سایوں کی مستی سے بڑھ کر

لب دل نشیں کے تبسم سے پیارے حسیں بربطوں کے ترنم سے پیارے

نگاہوں کے پرکیف جاموں سے میٹھے وطن کے حسینوں کے ناموں سے میٹھے

سلیمیٰ کی زلفوں کی ناگوں سے پیارے محبت کے آوارہ راگوں سے پیارے

مہ و مہر کے سیم گوں گھر سے دلکش ستاروں کے پرنور بستر سے دلکش

مری عاشقی کی کہانی سے شیریں بہاروں کی اٹھتی جوانی سے شیریں

وہ اوقات گزریں جو آزادیوں میں وہ لمحات گزریں جو آزادیوں میں

ایک اور خصوصیت اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے کارل مارکس کے نظریہ کے مطابق ہر چیز کو اس کے اقتصادی مفاد کی کسوٹی پر جانچا گیا ہے وجدانی جذباتی خصوصیات کو زیادہ جگہ نہیں دی گئی۔ اگر اس قسم کی چیزیں حیات انسانی کے اس پہلو کو تقویت پہنچاتی ہیں جن کا تعلق معاش سے ہے تو قائم رکھے جانے کے قابل ہیں۔ ورنہ ایک اسکول کے نزدیک وہ بیکار قابل سوختنی ہیں۔ سلام مچھلی شہری کی ایک نظم "مجبوریاں" ہمارے اس مفہوم کو کسی قدر واضح کرتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن — ابھی ان کو غلام آباد میں میں گا نہیں سکتا
مجھے نفرت نہیں ہے حسن جنت زار سے لیکن — ابھی دوزخ میں اس جنت سے دل بہلا نہیں سکتا
مجھے نفرت نہیں پازیب کی جھنکار سے لیکن — ابھی تاب نشاط رقص محفل لا نہیں سکتا
ابھی ہندوستان کو آتشیں نغمے سنانے دو — ابھی چنگاریوں سے اک گل رنگیں بنانے دو

اس تمام بیان کو واضح کرنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مثال میں اشعار پیش کئے جائیں۔ آنے والے انقلاب کی تصویر و انجام کو جس شاعرانہ عظمت و لطافت سے بیان کیا گیا ہے وہ قابل دید ہے۔ ہندوستان جب قصر آزادی کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو جوش نقیبانہ انداز میں محسوسات کو پیش کرتے ہیں کہتے ہیں ؎

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی؟ زیر و زبر رکھتے تھے جو روح ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیا ان کو خبر تھی، سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی، ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقدیریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

ہندوستانی کاشتکار کی عظمت، اہمیت، نکبت اور بدترین مصیبت کی داستانیں پڑھنا ہو تو جوش کے "کسان" کو دیکھئے اور ذرا دیر کے لئے یہ بھی سوچئے کہ اردو شاعری نے کس خوبی سے اس فرض کو انجام دیا ہے سرمایہ داری کے مظالم کو ادبی لطافت کے ساتھ اتنا ہیبت ناک و پُراثر بنانا آسان نہیں۔

کسان

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار
کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں   کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں

. . . .

ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل
کون ہل، ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گل   قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل

. . . .

طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں   ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بوِ گلشن پناہ   نازپروردہ لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

. . . .

جس کی جاں کاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ تاک   جس کے دم سے لالہ و گل بن کے اتراتی ہے خاک

. . . .

خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں   لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جس کا مس خاشاک میں بنتا ہے اک چادرِ مہین
جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمین
ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں   اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر   جس میں آ جاتی ہے تیری کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے   دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکی حرماں سیاہ فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پہ ہے نگاہ

. . . .

سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا، کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل، اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے
تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار جن کے آگے خنجر چنگیز کی مڑتی ہے دھار
بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ کیا چبا ڈالے گی او کمبخت ساری کائنات

. . . .

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بیتاب ہیں

اس سلسلہ میں اقبال نے فرمان خدا، کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر اپنے احساسات کو جس خوبی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس کو بھی ملاحظہ فرما کر نئے ولولۂ حیات اور نئے نظریہ کے تحت میں ذہنیت کا اندازہ فرمائیے ۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقین سے کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق را بسجودے، صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے — آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو

موجودہ سیاسی رجحان صرف نوجوانوں کو جوش دلاکر جدوجہد کی ترغیب ہی نہیں دیتا بلکہ مستقبل کے لئے سکون و عروج کا بھی وعدہ کرتا ہے یہ احساس مجاہدین آزادی کے لئے وہی کام کرتا ہے جو کبھی فردوس وحور کی امید مسلمانوں کے ساتھ کرتی تھی لڑنے والوں کو زیادہ دنوں تک مایوس نہیں رکھا گیا ایثار و آزمائش کا سلسلہ عرصہ تک پریشان کن نہیں دکھایا گیا کوششیں بہت جلد بار آور ہوتی ہوئی پیش کی گئی ہیں مثلاً اپنی ایک نظم "مستقبل" میں جوش کس مزے کے ساتھ لکھتے ہیں ؎

مژدہ اے دل کہ نیا اب سر و ساماں ہوگا — جس کو دشوار سمجھتا ہے وہ آساں ہوگا
ایک بار اور صبا لائے گی پیغام وصال — ایک بار اور علاج غم ہجراں ہوگا
ایک مبہم سا نشاں ہوگا نشانِ آلام — ایک بھولا سا فسانہ غم دوراں ہوگا

. . . .

قدم فقر پہ جھک جائے گی شاہی کی جبیں — دست افلاس میں دولت کا گریباں ہوگا

. . . .

آج جس بزم پہ طاری ہے جلال فرعون — کل وہیں دبدبۂ موسیٔ عمراں ہوگا
آج جس رعب سے ہے روئے امارت پہ شکوہ — کل وہ مزدور کے چہرے سے نمایاں ہوگا

رجائیت کے سلسلہ میں چند اور اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

وہ دیکھو صبح کا غرفہ کھلا زنجیرِ شب ٹوٹی　　　وہ دیکھو پوپھٹی غنچے کھلے پہلی کرن پھوٹی

(جوشؔ)

وہ زیرِ افق صبح کی ہلکی سی سپیدی　　　ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے

پیشانیٔ افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے　　　اٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

(علی سردار جعفری)

مجازؔ نے ایک نظم 'انقلاب' میں ہندوستان کی 'کایا پلٹ' ہونے کی جو مختلف حالتیں بتائی ہیں۔ آخر میں ایک شعر کہہ کر انجام سکون، خوش حالی پر ہی کیا ہے اس کے بھی چند اشعار دیکھیے کس خوبی سے انقلاب سے اثر پذیر ہونے والی طبیعت کو ہلچل و انتشار کے طوفان میں منتشر دیکھ کر یک بیک دو مصرعوں میں اطمینان امن و چین کا ترانہ سنا کر روح میں بالیدگی پیدا کر دی ہے۔

مطرب کے پر اثر نغموں کو قومی کام میں ایک رکاوٹ سمجھ کر سحر موسیقی کو دور کرنا چاہتے ہیں زمانہ کی موجودہ فضا کے لئے اسے غیر مفید بتاتے ہوئے آخر میں کہتے ہیں ؎

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب
آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے

. . . .

بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دَنّاتے ہوئے
اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے
بھوک کے مارے ہوئے انساں کی فریادوں کے ساتھ
فاقہ مستوں کی جلو میں خانہ بربادوں کے ساتھ
ختم ہو جانے کو ہے سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام

. . . .

توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
حشر در آغوش ہو جائے گی دنیا کی فضا
سُرخ ہونگے خون کے چھینٹوں سے بام در تمام
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
اور اس رنگ شفق میں باہزاراں آب و تاب

بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر
دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
غرق ہونگے آتشیں ملبوس میں منظر تمام
آسماں پر خاک ہوگی فرش پر رنگ شفق
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

سیاسی شاعری کی دنیا میں مجاز، علی سردار، سلام فیض، جذبی، مخدوم وغیرہ ایسے نوجوان شاعر ہیں جنھوں نے اشتراکیت اور جدلیاتی فلسفہ مادیت کے اصول و نکات کو اچھی طرح سمجھا ہے اور ان کو اپنے کلام میں سمو دیا ہے اور یہ خصوصیت ان کی شاعری کو انفرادیت و بلاغت عطا کرتی ہے۔ ان لوگوں کے کلام میں جو ایک اصولی اہمیت ہے وہ بھی قابل لحاظ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی ان میں سے کچھ کے یہاں وہ فن کارانہ پختگی نہیں پیدا ہو سکی ہے جو شاعری

کو ابدیت سے ہم آغوش کرتی ہے۔

اردو شاعری کے اس سیاسی رجحان کی ایک خصوصیت یہ بھی قابل دید ہے کہ جوش و خروش کی حالت میں اشتراکی شعرا اپنے کو ان اوصاف سے متصف کرتے ہیں جو رومانی شعرا کو معشوقوں میں نظر آتے تھے بلکہ یہ صفتیں لب و لہجہ و انداز بیان کی تبدیلی سے بالکل نئی خصوصیات اختیار کر لیتی ہیں۔ نسائیت یا نزاکت کے بجائے ان میں مردانگی و جانبازی کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں اور یہ بدلی ہوئی ذہنیت ایسی فضا پیدا کر دیتی ہے جو اپنی ندرت و لطافت کی وجہ سے دلوں پر سپاہیانہ انداز میں قبضہ کر لیتی ہے۔ ایک باغی کا ترانہ اختر جمال کی زبان سے سنیے تو مفہوم غالباً زیادہ واضح ہو جائے ؎

میرا ایماں ہے بغاوت میرا مسلک انقلاب ۔۔۔ آگ کے شعلوں میں ہے لپٹا ہوا میرا شباب
پرفشاں میری نظر میں سیکڑوں تیر شہاب ۔۔۔ بجلیوں کی رو میں لرزاں میرے دل کا پیچ و تاب
میری تقریروں میں بل کھاتے ہیں خونی اژدہے ۔۔۔ دشمنوں کا منہ جھلس دیتے ہیں میرے قہقہے

. . . .

کانپتے ہیں میری ہیبت سے بتان آزری ۔۔۔ میرے قدموں کے تلے ہے تخت و تاج قیصری

ان نظموں میں تبختر و غرور ضرور ہے مگر بیجا نہیں اس لئے کہ اب تک عاجزی و بیچارگی اور کم مایگی کے لہجہ کا غلبہ رہا ہے اور اب غالباً اس انداز بیان سے اس کی تلافی ہو جائے ایسی نظموں میں مسکینیت کے ساتھ دکھ درد نہیں عیاں ہوتا بلکہ طلب حقوق کے انداز میں اپنی اہمیت و صداقت کا اعلان ہوتا ہے۔

اس قسم کی سیاسی شاعری نے خون، تلوار جنگ، جہنم، مقتل، موت

وغیرہ کا اتنا تذکرہ کیا گیا ہے کہ پوری فضا بھیانک نظر آنے لگی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکیت خود خون کی پیاسی ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس نظریہ کے معتقدین خود خون ریزی و جنگ و جدل کے سخت ترین مخالف ہیں ان کا مقصود صرف اتنا ہوتا ہے کہ جنگ آزادی میں بغیر اپنا خون بہائے ہوئے سُرخ روئی نہیں نصیب ہوتی اور اب چونکہ تمام ملک جانبازی کے لئے تیار ہے لہٰذا ضروری ہے کہ جان کی قربانی ہو اور خون کی ندیاں بہہ نکلیں کیوں کہ کسی قوم کو بغیر سر کٹائے آزادی نصیب نہیں ہوئی۔

کبھی کبھی یہ چیزیں یعنی تلوار، جنگ، مقتل وغیرہ تشبیہ و استعارہ کی طرح بھی موجودہ شعرا نے استعمال کی ہیں کیونکہ بقول غالب سے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ ضرورت سے زیادہ ان چیزوں کو اشعار میں جگہ دی گئی۔ امنگ پیدا کرنے کے لئے یہ حربے ضروری سہی مگر اب کا میدان، میدانِ جنگ نہیں ان خوفناک مناظر کا متحمل ہونا اردو ادب کے لئے آسان و مفید بھی نہیں اس سے انکار نہیں کہ اس دور میں بعض ایسے پہلو بھی موجودہ اردو شاعری میں آرہے ہیں جن سے ایک خاص کمی پوری ہونے کا امکان ہے انقلاب کے علاوہ دوسرے خوفناک مناظر کی طرف بھی ہمارے بعض شعرا کی توجہ گئی ہے۔ احسان دانش نے خاص طور پر مکروہ بھیانک اور تکلیف دہ مناظر کو ادبی لطافتوں کے ساتھ پیش کرکے ایک بڑا کام کیا ہے۔

اک اور خرابی اس سلسلہ میں آگئی ہے کہ جس طرح غزل کے میدان میں جب وہ لوگ آئے جن کے پاس نہ دل تھا نہ دماغ، بجز رسمی خیالات اور تقلیدی طرز بیان، بازاری و عام مضامین کے اور کوئی چیز اپنی نہ لا سکے نہ ادب کو فائدہ پہنچا سکے اور نہ شاید اپنے کو اسی طرح موجودہ دور میں بھی سیاسی ذہنیت کا چربہ اتارنے والے تقلید پر اتر آئے کسان مزدور، سرمایہ داری، مفلسی، انقلاب وغیرہ کے متعلق اپنے طور پر طبع آزمائی کرنے لگے اور وہی سطحی باتیں سوقیانہ مضامین عام طرز بیان جس میں نہ کیف ہے اور نہ جان، بیکار بلکہ خرافات اشعار کا ان موضوعات پر ایک انبار ہو گیا۔ جیسے کسی زمانے میں غزل گوئی رسمی چیز ہو گئی تھی ویسے ہی ان بے دل و دماغ موجودہ شعرا کے ہاتھوں سیاسی شاعری بھی فیشن میں داخل ہو گئی جس میں تبلیغی عنصر غالب نظر رہتا ہے۔

اس قسم کے سیاسی رجحان کا یہ پہلو بھی قابل تنقید ہے کہ اس میں وقتی چیزیں زیادہ آ رہی ہیں۔ ان کے کارآمد ہونے میں شک نہیں۔ مگر ایسی چیزوں میں ابدیت کا پیدا کرنا دشوار ہے اور یہ کمی ایسی ہے کہ باوجود ہمہ گیری کے محض اس موضوع کے مبادیات تک طبیعت کو محدود کرنے والوں کو حیات جاودانی حاصل نہ کرنے دے گی۔ اس وجہ سے کہ ہندوستان کے سماجی و اقتصادی نظام کے تبدیل ہو جانے کے بعد ان میں سے اکثر چیزیں مثلاً مفلسی، کاشتکار کی پریشانی، مزدور کی ابتر حالت، غلامی، خود بخود غیر دلچسپ ہو جائے گی۔ آزادی کے زمانے میں ان چیزوں کا تصور کرنا ہی آسان نہ ہوگا۔ اس قسم کے اشعار کا

ذخیرہ صرف ایک تاریخی یاد داشت ہو کر رہ جائے گا تخلیقی ادب یا دیرپا اثر کا پیدا ہونا دشوار ہو جائے گا۔ ناصحانہ انداز و خود ستائی شاعری کی لطافت و عظمت کو مجروح کر دے گی۔

اس سیاسی رجحان کے سلسلہ میں شاعری کے سماجی رجحان پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے اور اس پر اظہار رائے کا بھی موقع یہی معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بغیر اقتصادی اور سماجی حالات کے بیان کئے ہوئے سیاسی تحریک پوری طرح نظر نہیں آسکتی۔

اِصلاحی رجحان

سماجی اصلاح

دورِ جدید سے پہلے اردو شاعری میں دنیوی زندگی اور اس کے متعلقات پر عمل کرنے کے بہت کم اشارے پائے جاتے تھے۔ کبھی غزلوں میں یوں ہی سا مفلسی کا تذکرہ ہو گیا کبھی کسی مثنوی میں بھولے بھٹکے کسی ایک مخصوص کردار کے سلسلہ میں زبوں حالی کا ذکر آجاتا تھا یا آپ بیتی کی صورت میں میرؔ یا غالبؔ ایسے لوگ مثنوی یا قطعہ میں کچھ کس مپرسی و افلاس کا بھی نقشہ پیش کر دیتے تھے۔ سوداؔ کے شہر آشوب، کی ایسی نظمیں قدیم اردو شاعری زیادہ نہ پیش کر سکی جن میں ہمہ گیری وعام معلومات کا ذخیرہ بھی ہو۔

دورِ جدید نے بھی ابتدا میں اس کی طرف توجہ زیادہ نہیں کی قوم کی خستہ حالی کی طرف لوگوں کو توجہ ضرور دلائی۔ اس کی اصلاح کی صورتیں پیش کیں مگر اس میں بھی فرقہ وارانہ ذہنیت کام کر رہی تھی۔ زیادہ تر اپنے ہی قوم و قبیلہ کی طرف شعرا کے اشارے ہوتے اور زیادہ انداز بیان ناصحانہ ہوتا اور شاعری

تبلیغی ۔ یہ توجب سے سیاسی رجحان میں تبدیلی ہوئی اس وقت سے شعرا نے بلا امتیازِ مذہب و ملت پست طبقوں کی بے بسی و افلاس کو نظم کرنا اپنا فرض سمجھا کسان، مزدور وغیرہ کے علاوہ ان غریبوں کی حالت پر بھی توجہ کی جو باوجود بے انتہا کارآمد ہونے کے بھی ابھی تک بے توجہی و کس مپرسی کے شکار رہتے جن کو مشکل سے دنیا آدمی سمجھنے کے لئے تیار ہوتی تھی۔

اقوام و افراد سے گذر کر شعرا نے پورے جتھے اور کارآمد طبقے کی حالت کا نقشہ بے کم و کاست پیش کر دینے کی کوشش کی ہے جو اپنی جگہ پر نہ صرف نوعیت کے اعتبار سے بلکہ شاعری کے لحاظ سے بھی قابل قدر ہے۔ ہم جابجا سے مختلف شعرا کے کلام وضاحت کے لئے مختصراً پیش کرتے ہیں۔ جوش گرمی اور دیہاتی بازار میں کہتے ہیں ؎

دوپہر، بازار کا دن، گاؤں کی خلقت کا شور — خون کی پیاسی شعاعیں روح فرسا لو کا زور

. . . .

شور، ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی، غبار — بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار

کھیوں کی بھنبھناہٹ، گڑ کی بو، جھونکی دھاک — خربزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھانس

دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی بد — کملیوں پر سرخ چاول، ٹاٹ کے ٹکڑوں پر جو

گرم ذروں کے شدائد، جھکڑوں کی سختیاں — جھکڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں

ماؤں کے کاندھے پہ بچے گردنیں ڈالے ہوئے — بھوک کی آنکھوں تلے پیاس کے پالے ہوئے

خانہ بدوشوں کی زندگی کا منظر مجاز کی آنکھوں سے دیکھئے اور حقیقت

کا لطف اٹھایئے ؎

بستی سے تھوڑی دور چٹانوں کے درمیاں — ٹھہرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں
ان کی کہیں زمیں ہے نہ ان کا کہیں مکاں — پھرتے ہیں یوں ہی شام و سحر زیرِ آسماں
دھوپ اور ابر و باد کے مارے ہوئے غریب
یہ لوگ وہ ہیں جن کو غلامی نہیں نصیب

اس کارواں میں طفل بھی ہیں نوجواں بھی ہیں — بوڑھے بھی ہیں مریض بھی ہیں ناتواں بھی ہیں
میلے پھٹے لباس میں کچھ بیویاں بھی ہیں — سب زندگی سے تنگ بھی ہیں سرگراں بھی ہیں
بیزار زندگی سے ہیں پیر و جواں سبھی
الطافِ شہریار کے ہیں نوحہ خواں سبھی

ہاتھوں پہ سخت کوشیِ پیہم کی داستاں — آنکھوں میں حزن و یاس کی گھنگھور بدلیاں
چہروں پہ تازیانۂ افلاس کے نشاں — ہر ہر ادا سے بھوک کی بے تابیاں عیاں
پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں
روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں

اٹھے ہیں جس کی گود سے آزر وہ قوم ہے — توڑے ہیں جس نے چرخ سے اختر وہ قوم ہے
پلٹے ہیں جس نے دہر کے دفتر وہ قوم ہے — پیدا کئے ہیں جس نے پیمبر وہ قوم ہے
اب کیوں شریکِ حلقۂ نوعِ بشر نہیں
انساں ہیں آخرش یہ کوئی جانور نہیں

آخر زمانہ ان کو ستائے گا کب تلک — کب سے جلا رہا ہے جلائے گا کب تلک
کب سے مٹا رہا ہے مٹائے گا کب تلک — ان کے لہو کو جوش نہ آئے گا کب تلک

مایوسیوں کی تہ میں جنوں خیزیاں بھی ہیں
افلاس کی سرشت میں خوں ریزیاں بھی ہیں

سماجی و تمدنی زندگی کے وہ پہلو جو مذہب کے نام پر اختیار کر لئے گئے ہیں حالانکہ مذہب کی روح سے کوسوں دور ہیں جس میں ارضی خداؤں کا خوش رکھنا ضروری ہے خواہ سماوی خدا ناخوش ہی ہو جائے۔ اس قسم کے غلط خیالات پر تنقید کرنا ہماری موجودہ شاعری کے خاص رجحانات میں شامل ہو گیا ہے۔ جوش کی مشہور نظم "متولیان وقف حسین آباد سے خطاب" کے چند اشعار اس ضمن میں پیش کرنا بے محل نہ ہوگا ؎

سن سکو تو چند نالے ہیں دل ناشاد کے — اے گرامی ممبرو وقف حسین آباد کے
مشعلوں کی جگمگاہٹ کی ہوا کرتی ہے شور — ہر محرم کی نویں اور آٹھویں تاریخ کو
وہ اداس اور تشنہ دو راتیں سر جھکائے نرت — جن کے سناٹے کی اندر گم تھی روح کائنات
جن کی روح میں درہم و برہم تھا دنیا کا نظام — جن کی خاموشی میں غلطاں تھا شہادت کا پیام
جن کی ہلچل سے تلاطم تھا دل آفاق میں — جھلملاتی تھی وفا کی شمع جن کے طاق میں
جن کی ظلمت کو منور کر رہے تھے دل کے داغ — گل ہوا تھا جن کی آندھی میں مدینے کا چراغ

پرفشاں تھے جن کے سناٹے جرس کے واسطے
تم نے ان راتوں کو چھانٹا ہے ہوس کے واسطے

مشعلوں میں جس جگہ خون شہیداں کا ہو رنگ — سیر کرنے کو بلائے جائیں واں اہل فرنگ
کیا حمیت ہے کہ اپنوں کے لئے ہو ٹکٹ تھام — روپ میں بھی غیر کے آئے کوئی تو اذن عام
یہ تملق یہ خوشامد یہ زبوں اندیشیاں — غم کدہ مسلم کا ہو نصرانیوں کا بوستاں
دیدۂ ناہید ہو جس بزم میں افسانہ گو — اس جگہ دی جائے دعوت چشمک مریخ کو

. . . .

جنگ و بربط کا تسلط ہو دیارِ آہ میں
اہلِ ماتم لاش کو رکھیں نمائش گاہ میں
دیدۂ عشرت اٹھے صد پارہ لاشہ دیکھنے
ہنسنے والے آئیں رونے کا تماشہ دیکھنے
جوئے خوں اور اس پہ تیراکی کا میلہ الحذر
غیرتِ اسلام! تجھ کو کھا گئی کس کی نظر

روحِ مومن کو عطا یا رب خدا! ادراک ہو
یہ نہیں تو صور پھنک جائے کہ قصہ پاک ہو

مذہب کے پردہ میں جو لوگ شکم پروری کی فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنے کو ہمہ اخلاق، ہمہ تقدس، وضع قطع سے ثابت کرنے کی فکر کرتے ہیں ان کی بھی قلعی کھولنا موجودہ دور کے بعض شعرا کے لئے اس وجہ سے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ تصنع اور حقیقت کو بے نقاب کر دینا شاعری کا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ خانقاہ کا منظر جوش کی زبان سے سنکر اس رجحان کا اندازہ فرمائیے۔

الاماں خانقاہ کی دنیا
معصیت کی گناہ کی دنیا
دوڑتا ہے یہاں ٹھہر کے سمند
یاں توکل ہے حرص کا پابند
یاں قناعت سے عارفانِ خدا
کام لیتے ہیں سکہ سازی کا
ہر ادا میں ہے تاجرانہ کمال
ہر بُنِ مو ہے ایک دستِ سوال
یاں خودی کا لقب ہے "یا دخدا"
"ترکِ دنیا" کے بھیس میں دنیا
دل سے ہے بند رسم و راہ یہاں
صرف جیبوں پہ ہے نگاہ یہاں
جمع کرتے ہیں یاں زر و گوہر
جاہلوں کو اجل سے دھمکا کر
ہاتھ آتا ہے روز گنجِ خطیر
"ذکرِ دوزخ" ہے اس جگہ جاگیر
یہیں اہلِ صلوٰۃ و اہلِ وضو
چوس لیتے ہیں احمقوں کا لہو

یاں بہت سے کمال آتے ہیں ہاتھ چلتے ہیں، حال آتے ہیں
ڈھول کی گت پہ رقص ہوتا ہے نغمہ چاندی میں ہاتھ دھوتا ہے
یاں زر و مال دینے آتے ہیں لوگ اولاد لینے آتے ہیں
رہیں ایک دھج سے مستانہ یاں برستا ہے ابرِ نذرانہ
از پئے حرص و آز نامسعود سر بزانو ہیں یاں رکوع و سجود
ہر حکایت ہے یاں زر و گوہر خلد ملتی ہے یاں کرائے پر
سجدۂ گرسنہ کا ہر دانہ کہہ رہا ہے غذا کا افسانہ
یاں دعاؤں کی فیس ملتی ہے زر ملے تو زبان ہلتی ہے
یاں مجالس میں بہرِ زرداری جلتی ہے شمعِ حسنِ بازاری
ایک دریائے ناز بہتا ہے امردوں کا ہجوم رہتا ہے
پھول چڑھتے ہیں خارزاروں پہ سجدے ہوتے ہیں یاں مزاروں پہ
ہے یہاں کفر خیز و شرک پناہ نعرۂ لا الٰہ الا اللہ
یاں کے ذرے نہیں نگینے ہیں یاں مقابر نہیں، دفینے ہیں
جامۂ فقر ہو چکا ہے رکیک مانگتی ہیں یہاں عبائیں بھیک
صورتیں غرقِ خود نمائی ہیں داڑھیاں کاسۂ گدائی ہیں

کون بہتر ہے، ایزدِ باری
ان کا تقویٰ، کہ میری میخواری

آج کل ہندوستان کی سماجی زندگی مفلسی کے علاوہ بیکاری کے ہاتھوں جس قدر ابتر ہے اس کا صحیح احساس صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر گذرتی

ہے۔ طرح طرح کی سیاسی و تمدنی تحریکات پر بیکاری اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ گذشتہ صفحات میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ تعلیم یافتہ بیکاروں نے مزدوروں کا ساتھ دے کر اشتراکیت کو ہندوستان میں تقویت پہنچائی۔ اسی طرح بہت سے شعبہ جات ہیں جن میں پڑھے لکھے بھوکے نوجوان مفلسی کی وجہ سے تنگ آکر شدت پسندی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ اس میں شک بھی نہیں کہ بیکاری اور وہ بھی تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری ذہن کو نئے نئے راستے دکھاتی ہے خود لوگ بیکار ہوتے ہیں مگر ان کا ذہن بیکار نہیں ہوتا بلکہ کسب معاش کے لئے طرح طرح کی فکریں کرتے رہتے ہیں۔ ہر سامان زینت و آرائش دیکھ کر ان کے دلوں میں ٹیس اٹھتی ہے۔ سرمایہ داری سے وہ تنفر پیدا ہوتا ہے کہ شاید کسی بھلے چنگے آدمی کو جذام سے بھی نہ ہوتا ہوگا۔ اس احساس کا نتیجہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے منجملہ ہماری شاعری بھی اس کا ایک مظہر بن گئی ہے۔

ہندوستان میں تعلیم یافتہ بیکار کے خیالات و جذبات کی ترجمانی موجودہ شاعری نے مجازؔ کی زبانی جس خوبی سے کی ہے اس کا نمونہ دیکھ کر آپ بھی لطف اٹھائیں تو عجب نہیں۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مگر بے لوث نکتہ چینی سے دنیا کو انسان بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس جد و جہد کے لئے جو شخص ناقص نظر آتا ہے یا جو اس راہ سے بہکا ہوا ملتا ہے اس کو وہ دامنِ ہستی کے لئے ایک بدنما دھبا اور غدار سمجھ کر رائے زنی کرتے ہیں آپ کو جوش کی اس نظم سے اس کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا جس کا عنوان "نازک اندامانِ کالج سے خطاب" ہے ؎

چھین لی تم نے نسائیت سے ہر شیریں ادا — مرحبا اے نازک اندامانِ کالج ! مرحبا

جنگ سر پر اور یہ محبوبیت چھائی ہوئی — ناز سے نیچی نگاہیں، چال اٹھلائی ہوئی

انکھڑیوں میں عشوۂ ترکانہ در کھوئے ہوئے — سینٹ کی خوشبو میں روحِ ناز پروئے ہوئے

خال و خد سے جذبہ ہائے صنفِ نازک آشکار — غازی چہروں میں زن بننے کے ارماں بیقرار

الحذر ! یہ جنبشِ مژگاں کا شیریں ارتعاش — غیرتِ آبا کا دل ہے جس کی رو میں پاش پاش

الاماں ! یہ زینتیں ہوتے ہیں گو اترے ہوئے — ذوق ہے گھنگرو کا، "گیٹس" پاؤں میں پہنے ہوئے

ریشمی رومال سے ہے فرقِ نازک پر بہار — اوڑھنی پر دیدنی ہے راہ کا گرد و غبار

نازکی کا مقتضا، پتلی چھڑی باندھے ہوئے — شوق کنگن کا کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے

جنگ اور نازک کلائی، ہیچ ہیں تقدیر کے — مڑ نہ جائے گی نگوڑی بوجھ سے شمشیر کے ؟

پاؤں رکھتے ہو دمِ گلگشت کس کس ناز سے — اے میں قرباں ! رن میں نکلو گے اسی انداز سے

دیر سے توپوں کے منہ کھولے ہوئے ہے روزگار — سینۂ گیتی میں ہے جس کی دھمک سے خلفشار

شغلِ زینت سے تمھیں فرصت مگر ملتی نہیں
کیا تمھارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں ؟

سن لو جو موزوں نہیں مردانہ سیرت کے لئے
زندگی ان کی وبا ہے آدمیت کے لئے

مرد کہتے ہیں اسے اے مانگ چوٹی کے غلام
جس کے ہاتھوں میں ہو موفانی عناصر کی لگام

مرد کی تخلیق ہے زور آزمانے کے لئے
گردنیں سرکش حوادث کی جھکانے کے لئے

مرد ہے سیلاب کے اندر اکڑنے کے لئے
بحر کی بپھری ہوئی موجوں پہ چڑھنے کے لئے

مرد کہتے ہیں اسے اے بندگان طمطراق
جو جلال برق و باراں کا اڑاتا ہو مذاق

جنگ میں ہو بانکپن جسکی شجاعت کا گواہ
رزم کے میداں میں کج کرتا ہو ہنستے ہنستے کلاہ

دوڑتا ہو شعلہ خو بجلی کا دامن تھامنے
مسکراتا ہو گرجتے بادلوں کے سامنے

مضحکہ کرتا ہو خون آشام تلواروں کے ساتھ
کھیلتی ہوں جسکی نیندیں سرخ انگاروں کے ساتھ

تم مگر اس زندگی کے کھیل سے رہتے ہو دور
آفریں اے عصر حاضر کے جوانان غیور!

ہے تمھارا ارتقا پروردۂ سعیِ زوال
الاماں تعلیم کالج کا اجل پرور مآل

جیب میں کوڑی نہیں اور اسقدر شان و شکوہ
سر جھکائے شرم سے اے فاقہ مستوں کے گروہ

یوں تمھارے منھ کے اندر ہو فرنگی کی زبان
خوف ہر گز گونگا نہ ہو جائے کہیں ہندوستان

یہ لباس مغربی جلووں کو چمکاتا نہیں
تم کو اس بہروپیے پن سے حجاب آتا نہیں

کیا غضب ہے تم سے بوئے ایشیا آتی نہیں
سچ کہو کیا واقعی تم کو حیا آتی نہیں ؟

زندگی طوفان ہے اور ناؤ ہو تم باپ کی
آہ جیتی جاگتی بدبختیو ماں باپ کی

اس تنقید حیات و اظہار حقیقت کے سلسلہ میں شعرا کی سماجی و علمی وسیع النظری نے ادبی اصلاحات بھی اپنے دائرے میں لے لیا۔ داخلی

ادبی اصلاح

انداز سے جو کچھ اب تک ترمیم ہوتی رہی اس کے بعض پہلو آپ کے سامنے آچکے لیکن ان کے علاوہ خارجی انداز میں ادب کو راہ راست پر لانے کی جو کوششیں ہوتی رہی ہیں ان کی بھی ایک مثال دیکھ لیجیے۔

اس زمانے میں مشاعروں اور شاعری کی کثرت، عوام کی نظر میں ان کی اہمیت شعرا کا مطمح نظر، ظریف کی ایک نظم "شہر آشوب" میں بڑی جامعیت سے ناقدانہ حیثیت سے جگہ پاتے ہیں اس باکمال شخص نے شاعر کے فرائض بتا کر موجودہ دور کے شعرا کی خامیوں کو نہایت آزادی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اہل مشاعرہ پر نکتہ چینی کر کے محفل شعر و سخن میں ترمیم کی تجویزیں پیش کی ہیں اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم صرف چند بند پر اکتفا کرتے ہیں۔

شکوہ تعلیم اے ہندوستاں بیکار ہے ۔۔۔ تو عرب کی جاہلیت کا علم بردار ہے
تھا زباں سے عشق اس کو تو مگر بیزار ہے ۔۔۔ شاعری کا تجھ میں ہر نااہل دعویدار ہے

تیری اردو نے زمانہ بھر کی بازی مات کی
شاعر اسّی فی صدی، تعلیم سو میں سات کی

. . . .

چونک کب تک خواب غفلت میں رہیگی آنکھ بند ۔۔۔ یہ تغیر دیدۂ عبرت سے دیکھ اے ہوش مند
تھی بنائے قومیت شاعر کی تخئیل بلند ۔۔۔ قوم اب شاعر بنا لیتی ہے خود حسب پسند

قوم میں جب سب کے سب شاعر ہوں جو بیکار ہیں — درحقیقت یہ فنائے قوم کے آثار ہیں

اسی سلسلہ میں جب مشاعرہ کا ذکر کرتے ہیں تو سنجیدہ باتوں کے ایک جدید شاعر کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

تیری پالی دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں تمام — گرد تیرے طالب لغو کے اک گنوار سا ازدحام
وہ غزل پڑھنا خوش الحانی سے تیرا وقت شام — واہ وا کا شور پھر جھک جھک کے وہ تیرا سلام
جمع ہوتی ہے تجھے ساری خدائی دیکھنے
طرح کے مصرعے کے دانے پر لڑائی دیکھنے

پیسے والوں کی سمجھ میں آ گئی ہے اب یہ بات — ورنہ بجا ناچ گانے کا ہے بالکل واہیات
جب کوئی جلسہ خوشی کا ہو کہیں یا برات — منعقد بزم سخن ہوتی ہے تا کٹ جائے رات
پہلے ارباب نشاط آتے تھے گانے کے لئے
اب تو شاعر بلائے ہیں غزلیں سنانے کے لئے

پھر شاعر کو مخاطب کرتے ہیں ؎

تو نمونہ سربسر اخلاق و خودداری کا تھا — اک مصفا آئینہ تو قدرت باری کا تھا
تو معالج نفس امارہ کی بیماری کا تھا — تو ذریعہ ملک اور ملت کی بیداری کا تھا
کتنی عبرت خیز شے اب عالم ہستی میں ہے
جس نے قوموں کو ابھارا خود وہ پستی میں ہے

یہاں تک پہنچ کر ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ عہد جدید کئی نئی چیزیں شاعری میں لے آیا جو ہر لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ جدت و ندرت کے اعتبار سے شاعری دو طرح پر تقسیم کی جاسکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ بزرگوں کے کارناموں سے خیالات و الفاظ وغیرہ لے کر ان میں ایسا تصرف کیا گیا ہے کہ نقصانی معلوم ہونے لگی۔ دوسرے وہ شاعری کہ جو اچھوتی ہے یعنی خیالات و موضوعات کے لحاظ سے بالکل نئی ہے۔ اس سے قبل اس کا کوئی ذخیرہ دیکھنے میں نہ آیا ہو موجودہ دور دوسرے قسم کی شاعری کا ایک نقشہ ہے۔

ایک اور بات عہد جدید کے رجحان میں زور دینے کے قابل نظر آتی ہے۔ اس سے پہلے ہماری شاعری میں آسمان اور اس کے متعلقات کا تذکرہ یوں ہی سا آجاتا تھا کبھی تشبیہہ و استعارے میں، کبھی مذہبی سلسلہ میں، کبھی موسم کے لحاظ سے اور بھولے بھٹکے منظر نگاری کے لئے بھی لیکن مذاق جدید نے نئے انداز سے عالم بالا کو دنیائے شاعری میں پیش کیا۔ آسمان کی وسعت و عظمت کا اقبال نے اس خوبی کے ساتھ جا بجا ذکر کیا ہے کہ طرز تخئیل میں ایک اضافہ ہوگیا۔ جلال و جمال کی لامحدود شکلیں پیش نظر ہوگئیں۔ بالغ النظری و تحیر کے احساس کو بالیدگی کا موقع ملا۔ زمین کے رہنے والوں کو آسمان ایک نئی دنیا کی طرح طبع آزمائی کے لئے ملا۔ ستاروں سے دوبدو گفتگو، ان کے حرکات و سکنات پر جذبات کا رنگ چڑھانا فرشتوں اور خدا کا ہم کلام ہونا فرشتوں کی ہیبت و جلالت و ملکوتیت پر اس طرح تبصرہ کرنا گویا عین مشاہدہ میں یہ خصوصیات آرہی ہیں۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ اردو شاعری کے لئے ایک نیا میدان بن گئیں۔ جس کی دل کشی سے متاثر ہو کر اقبال

کے علاوہ دوسرے شاعروں نے بھی اپنے کلام میں نہایت خندہ پیشانی سے جگہ دی اور دنیا نے خوش آمدید کہتے ہوئے اس تازگی و شگفتگی کو مشتاقانہ انداز سے دیکھا۔

غزل و نظم، رباعی وغیرہ ہر ایک صنف میں اس عنصر کو جگہ مل رہی ہے مفکرانہ شاعری کی تشنگی کو ایک ایسا چشمہ ملا جو تصوف و تغزل سے الگ تھا، اجرام فلکی کو انسان سے اس قدر مانوس کر دیا کہ وہ انسان نظر آنے لگیں وہ خوبی تھی کہ اس دور سے پہلے اردو شاعری نے بہت کم پیش کی تھی۔ اقبال کی ایک نظم "چاند اور تارے" مثال کے لئے ہم نقل کرتے ہیں۔ اجرام فلکی کی بات چیت جس احساس و خوبی کے ساتھ نظم ہوئی ہے وہ علاوہ شعریت کے تخاطب و انسانیت کے بہترین پہلو لئے ہے۔

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے — تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر — ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا — چلنا، چلنا، مدام چلنا
بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے — کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کش سفر سب — تارے، انسان، شجر، حجر سب

ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟

کہنے لگا چاند۔ ہم نشینو! | اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی | یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ | کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے | پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں! | جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

عہد حاضر میں اردو شاعری نے کچھ ادبی جدتیں بھی اختیار کیں شعر کی مروجہ بحروں، اور شکلوں کے علاوہ ہندی و انگریزی ادب سے متاثر ہو کر کچھ نئی بحریں اور شکلیں بھی لا رہی ہے ان بحروں اور شکلوں میں ندرت کے علاوہ ترنم و روانی کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے لیکن ابھی تک ہر دلعزیزی و ہمہ گیری نہیں نصیب ہو سکی کچھ ایسے بھی نوجوان شعرا پیدا ہو گئے ہیں جن کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف ایسی ہی بحروں شکلوں کے لئے شعر کہتے ہیں اس لئے کہ نشست الفاظ سے ترنم تو پیدا کر لیتے ہیں لیکن نہ تخئیل ہوتی ہے، نہ جذبات میں خلوص نہ رائے میں پختگی و اصابت۔

انگریزی شاعری سے جتنی چیزیں اس سلسلہ میں لی گئی ہیں ان میں سانیٹ نسبتاً زیادہ ہے مثال کے لئے ن۔ م راشد کی ایک "نظم" "خواب کی بستی" دیکھتے چلئے ۔

خواب کی بستی

(سانیٹ)

مرے محبوب جانے دے مجھے اس پار جانے دے
اکیلا جاؤں گا اور تیر کے مانند جاؤں گا
کبھی اس ساحلِ ویران پر میں پھر نہ آؤں گا
گوارا کر خدارا اس قدر ایثار جانے دے!
نہ کر اب ساتھ جانے کے لئے اصرار جانے دے
میں تنہا جاؤں گا تنہا ہی تکلیفیں اٹھاؤں گا
مگر اس پار جاؤں گا تو شاید چین پاؤں گا
نہیں مجھ میں زیادہ ہمتِ تکرار جانے دے!

. . .

مجھے اس خواب کی بستی سے کیا آواز آتی ہے
مجھے اس پار لینے کے لئے وہ کون آیا ہے
خدا جانے وہ اپنے ساتھ کیا پیغام لایا ہے
مجھے جانے دے اب رہنے سے میری جان جاتی ہے!

. . . .

میرے محبوب، میرے دوست اب جانے بھی دے مجھ کو
بس اب جانے بھی دے اس ارضِ بے آباد سے مجھ کو

سماجی اور سیاسی رجحان نے بھی اردو شاعری میں ہندی کے الفاظ وطرز بیان کے لانے میں قابل قدر سہارا دیا ہے۔ کافی نظمیں ایسی آنے لگی ہیں جن پر ہندی شاعری کا اثر غالب نظر آتا ہے ایک مختصر سی نظم اپنے بیان کی تقویت کے لئے پیش کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ شہاب سرمدی کی ایک نظم "سندیسا" ہے اس کا صرف ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو ؎

بھارت والو بھور بھئی	اب جاگو یہ سونا کیسا
بیتا رین اجور بھئی	مُنہ دھو ڈالو یہ رونا کیسا
دیکھو وہ اندھیر نگر کے	دیپک بجھتے جاتے ہیں
اک سنسان کھنڈر کے	باسی تم کو بلاتے ہیں
دیکھو پیچھے پاؤں نہ سرکے	کہدو ہم بھی آتے ہیں
بڑھنے کا میدان یہی ہے	چڑھنے کا سوپان یہی ہے
دھرم یہی ایمان یہی ہے	وید یہی قرآن یہی ہے
دنیا موہ کی تور بھئی	اب بیر کا بس بونا کیسا
بھارت والو بھور بھئی	اب جاگو یہ سونا کیسا؟

اس قسم کی نظمیں لکھنے والوں میں احسان دانش، اختر شیرانی، حفیظ ساغر اندر بیت شرما، لطافت مشہدی، بہزاد، مطلبی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی نظموں میں رس، لب ولہجہ، بحریں انداز بیان کا مجموعی اثر، نہایت دل پذیر وسکون پرور ہوتا ہے۔ اس رجحان کا ایک ظاہر نتیجہ

تو یہ ہے کہ اردو میں شیرینی و ترنم کا اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان نظموں کی ساخت کی وجہ سے، اظہار بیان میں آسانی اور ندرت دل و دماغ کو خاص طور سے متاثر کرتی ہیں۔ مزید مثال کے لئے حفیظ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کرشن کنھیّا

دنیا سے نرالا
یہ بانسری والا
گوکل کا گوالا

. . . .

بت خانے کے اندر
خود حسن کا بت گر
بت بن گیا آ کر

. . . .

وہ طرفہ نظارے
یاد آ گئے سارے
جمنا کے کنارے

سبزے کا لہکنا ۔۔۔ پھولوں کا مہکنا
گھنگھور گھٹائیں ۔۔۔ سرمست ہوائیں
معصوم امنگیں ۔۔۔ الفت کی ترنگیں

وہ گوپیوں کے ساتھ
ہاتھوں میں دیئے ہاتھ
رقصاں ہو برج ناتھ

بسنتی ترانہ

لو پھر بسنت آئی پھولوں پہ رنگ لائی
چلو بے درنگ
لب آب گنگ
بجے جل ترنگ
من پر امنگ چھائی پھولوں پہ رنگ لائی
لو پھر بسنت آئی

اس سلسلہ میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ آرزو اور ان کے معتقدین خالص اردو، کے نام سے ایسی غزلیں کہنے لگے ہیں جن میں فارسی یا عربی کے الفاظ نہیں لائے جاتے یا لاتے بھی ہیں تو صرف وہ جو عام طور سے اتنے رائج ہو چکے ہیں کہ ذرا سی اردو جاننے والے کی بھی سمجھ میں آسانی سے آسکتے ہیں۔ اس طرز کلام کا رجحان بھی ہندی کی طرف زیادہ مائل ہے۔ فارسی یا عربی سے اُسے بہت کم لگاؤ ہے۔

ایک طرف تو غالب کے فارسی آمیز انداز بیان کی پرستش اور

دوسری طرف ہندی پسندی کا رجحان دونوں مل کر اردو کو اتنا ضرور فائدہ
پہنچائیں گے کہ زبان میں توازن قائم رہے۔ نہ تو عربی فارسی کا بیجا غلبہ
ہوگا اور نہ زبان اتنی سہل ہوگی کہ بلندیٔ تخئیل کا ساتھ نہ دے سکے چنانچہ
اس اعتدال کی جھلک ابھی سے اردو ادب میں نظر آنے لگی ہے۔

بعض ایسے الفاظ و اثرات اور اشخاص جو میرؔ دردؔ سوداؔ نظیرؔ مصحفیؔ
کے یہاں نظر آکر بعد میں ناپید ہو گئے تھے موجودہ دور نے دوبارہ ان کو
وجود میں لانے کی کوشش کی۔ پریم، آکاش، نگر، بسنت، آنند، سماج، ارجن
وغیرہ اب پھر عام طور سے استعمال ہونے لگے ہیں تہوار و مقامی خصوصیات
تیزی کے ساتھ پھر سے چمکانے کی کوشش کر رہا ہے جو عرصہ ہوا فراموشی
کے رنگ سے بیکار ہو چکے تھے جنھیں دنیا نے متروک سمجھ کر بھلا دیا مگر
ضرورت و دور اندیشی نے پھر پردۂ غیب سے منصۂ شہود پر لانے کے لئے
مجبور کیا۔

دورِ جدید سے پہلے کے شاعرانہ انداز و طرزِ تخئیل و موضوعات سے
الگ ہونے کی وجہ زیادہ تر موجودہ دورِ حیات کی کشمکش میں نظر آتی ہے
حقیقتوں سے دوچار ہونا خیالی دنیا سے الگ ہونا غمِ امروز کو غمِ فردا سمجھنا
موجودہ احساس و ضبط سے باہر ہے، آج کے شعرا نئے راستے پر قدم رکھتے
ہوئے، جانے والے دور سے کچھ معذرت کرتے ہیں اور اپنے احساس
و جذبات کی اہمیت و بنیاد سمجھانا چاہتے ہیں اسے ساغرؔ نے ایک نظم "شاعر
و محبوبہ" میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے، اس کے چند بند یہاں نقل کئے۔

جاتے ہیں۔ یہ بند "محبوبہ" کے مختلف سوالات و اعتراضات کے جواب میں بڑی جامعیت کے ساتھ لائے گئے ہیں ؎

محبوبہ

وہ سوز کیوں نہیں، وہ ساز کیوں نہیں شاعر
صدا میں شعلۂ اعجاز، کیوں نہیں شاعر
نوا میں لرزشِ غماز، کیوں نہیں شاعر
طلسم خیزیِ آواز، کیوں نہیں شاعر
جو لوٹتا تھا وہ انداز کیوں نہیں شاعر؟

شاعر

دماغ درد رح نے وہ بوجھ اٹھائے ہیں کہ نہ پوچھ
جہاں دل پہ وہ آرے چلائے ہیں کہ نہ پوچھ
پہاڑ مجھ پہ وہ غم نے گرائے ہیں کہ نہ پوچھ
مری نگاہ کو وہ زخم آئے ہیں کہ نہ پوچھ
حقیقتوں نے وہ منظر دکھائے ہیں کہ نہ پوچھ
وہ جام زہر نظر سے پلائے ہیں کہ نہ پوچھ

زبان گنگ کا نغمہ سُنا نہیں تو نے
تباہ دل کا ترانہ سنا نہیں تو نے
نوا تو صرف تھی پردہ سنا نہیں تو نے
صدا تو صرف تھی دھوکا سنا نہیں تو نے
خموشیوں نے وہ بربط بجائے ہیں کہ نہ پوچھ
بغیر گائے بھی وہ گیت گائے ہیں کہ نہ پوچھ

محبوبہ

شکستہ دل ہے ہو، خاموش سے ہو، حیراں سے
حواس گُم سے ہیں، ویراں سے ہو، پریشاں سے
کہ جیسے نطق کوئی چھین لے غزل خواں سے
بہار جیسے کوئی لوٹ لے گلستاں سے
جنونِ شوق کے انداز کیا نہیں شاعر؟

شاعر

شکستہ دل ہوں کہ یہ بے حسوں کی محفل ہے
تحیر آج غزل خوانیوں کا حاصل ہے

سکوت شوق کی طغیانیوں کا ساحل ہے
خموش یوں ہوں کہ منزل فریب منزل ہے

دبائے جاتی ہے سینہ حیات کی تلخی
کھرچ رہی ہے کلیجہ حیات کی تلخی

محبوبہ

مدام سایہ فگن تھا جو نوجوانوں پر
جو برق بن کے چمکتا تھا گلستانوں پر

نقوش ثبت ہیں جس کے ابھی زمانوں پر
ستارے جس سے سلگتے تھے آسمانوں پر

وہ تند شعلۂ آواز کیوں نہیں شاعر؟

شاعر

حیات بے بس و تنہا مری نظر میں نہ تھی
نحیف آہ شرر زا مری نظر میں نہ تھی

کراہتی ہوئی دنیا مری نظر میں نہ تھی
یہ پیر زال یہ بیوا مری نظر میں نہ تھی

سنے نہ تھے کبھی مزدور حسن کے نغمے؟
مرے خیال میں بھی فاقہ کش کے گیت نہ تھے

کہیں ہے بارش دولت کہیں غموں کی اوس
یہ عشرتیں یہ مسرت یہ قصر جنت بوس

یہ جھونپڑوں میں کسانوں کی انتڑیوں کی ہوس
یہ ہے نظام جہاں میں خدا نہیں افسوس!

نہیں ستارے نہیں، خاک ہی کو بھڑکا دے
مری نوا سے امیروں کے دل ہی سلگا دے

محبوبہ

شراب شعر جو پی ہے تو ہوش ہی کیوں ہے   جو چور چور ہوا پھر جذبۂ خودی کیوں ہے
خودی میں ڈوب کے احساس بیکسی کیوں ہے   خدا کی دین پہ اس درجہ برہمی کیوں ہے

عطائے حق پہ تمھیں ناز کیوں نہیں شاعر؟

شاعر

خدا کی دین کا اور زندگی کا ساتھ نہیں   جہاں میں مفلسی و شاعری کا ساتھ نہیں
خلیل و بت گری و آذری کا ساتھ نہیں   سماج اور بھلے آدمی کا ساتھ نہیں

کہاں کا ناز خدا سے مجھے شکایت ہے
کہ اس نظام میں شاعر کی کیا ضرورت ہے

یہ آگ، خون، تباہی، و ابتری کا نظام   خبیث موت کے شانوں پہ زندگی کا نظام
یہ لوٹ مار کا جنگل یہ خودسری کا نظام   یہ مول تول کی دنیا یہ برتری کا نظام

یہاں میں پیش کروں روح شاعری، توبہ
کہ تل رہی ہے جہاں جنس زندگی، توبہ

وامق جونپوری کی ایک ایسی ہی عمدہ نظم کے چند اشعار اس سلسلہ میں اور ملاحظہ فرمایئے۔

اُس پار

یہ روئی ہے شبنم پربت پر یا اپنا ہی بھیگا دامن ہے؟
آہٹ ہے کسی کے پیروں کی یا اپنے ہی دل کی دھڑکن ہے؟

ان ٹوٹی ہوئی زنجیروں کے میں کب تک جوڑ ملاؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا
فطرت کی سنہری پیشانی سے چاند کی بندی چھوٹ گئی
آکاش کی سیمیں گردن سے تاروں کی لڑی بھی ٹوٹ گئی
الفت کی سہانی رات کہاں اب اور ترانے گاؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا
ان ہیرے ایسے اشکوں کو عارض پہ ڈھلکنے دو مت روکو
یاقوت کے ایسے ہونٹوں کو دانتوں سے چبا کر مت روکو
اک بات ہے جو رہ جائے گی یہ وقت کہاں پھر پاؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا
خوں خوار نگاہوں کے ڈر سے لب تک نہ ہلیں یہ کیا معنی
تقدیر کی بھولی باتوں کو ہم سنتے رہیں یہ کیا معنی
صدیوں کے بھیانک ماضی کی ان قندیلوں کو بجھاؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا
کب تک یہ عمامہ کفر و دیں کا ڈھونگ رچائے جائے گا
کب تک یہ پجاری دنیا کو انگلی پہ نچائے جائے گا
اب دور کہیں ان جھگڑوں سے میں بستی ایک بساؤں گا
اس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا
ایسا بھی زمانہ آئے گا جب ہم دونوں مل جائیں گے

ہر منظر کیف آگیں ہوگا ہر کیف پہ ہم لہرائیں گے
دنیا ہی نرالی پاؤ گی جس وقت میں واپس آؤں گا
اس پار مجھے جانے بھی دو رد کو نہ مجھے میں جاؤنگا
یہ صبح جو پھیکی پھیکی ہے فردوس نظر بن جائے گی
بوتل جو یہ خالی خالی ہے شہناز سحر بن جائے گی
رومان صفت آزاد نفس اک دور زمانہ لاؤں گا
اس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤنگا

رومانی شاعری

دور حاضر کا رومانی رجحان بھی اردو شاعری میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مغربی رومانی شاعری سے متاثر ہوکر ہمارے شعراء نے بھی اس طرف توجہ کی لیکن مغرب کا رجحان اب فرسودہ ہو چلا تھا اور انحطاط پذیر بھی، اس لئے اردو کو ایسے عالم میں ملا جب اس کی شکل کچھ بگڑ چلی تھی۔ لہذا اردو نے رومانی شاعری کو اس کی بنیادی خصوصیات کے ساتھ بہت کم دیکھا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اہم خصوصیات میں سے صرف چند چیزیں ہمارے یہاں آسکیں، تلاش حسن، مبہم انداز بیان، احساس حیرت کو مغربی رومانی شاعری سے اردو نے حاصل کیا اور باقی خصوصیات اتنی بھی ابھی تک نہیں نظر آتیں تلاش حسن، کا عنصر بھی اردو میں محدود سا ہے۔ نہ زندگی کے حسن پر زیادہ توجہ کی گئی ہے اور نہ مناظر فطرت کے جمالیاتی پہلو کا بالاستیعاب مشاہدہ کیا گیا زیادہ تر صنف نازک کے پیکر

وخواص پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

رومانی شاعری کے متعلق ایک نقاد کا خیال ہے کہ رومانیت اپنی تلاش میں واقعیت کو سرے کر روانہ ہوتی ہے لیکن خالص تخئیل اور احساس کے ذریعہ سے اس کی شکل بگاڑ کر ہمیں حد درجہ غیر حقیقی صورت میں واپس کر دیتی ہے ۔ ممکن ہے کہ انگریزی کے متعلق یہ رائے صحیح ہو اور اردو کے لئے بھی، لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گذشتہ دور کی عشقیہ شاعری مبالغہ اور یکطرفہ رائے زنی میں ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی تھی تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اردو کی موجودہ رومانی شاعری حقیقت سے کہیں زیادہ قریب ہے اور اس کا رجحان بہ نسبت قدیم عشقیہ رجحان کے واقعیت اور زندگی کا مرقع ہے ۔

موجودہ رجحان نے مثالیت پسندی کو ایک بڑی حد تک حقیقت سے ملا دینے کی قابل قدر کوشش کی ۔ اب سے پہلے یعنی داغ اور ان کے کچھ عرصہ بعد تک عاشق کا مجنوں و فرہاد ہونا ضروری تھا ۔ کسی وقت وہ یاد محبوب سے غافل نہیں رہ سکتا تھا ۔ بدترین مصائب پر بھی خاموش رہنا فرض تھا ۔ معشوق کا غیر معمولی حسین ہونا بھی لازمی تھا ۔ دور حاضر نے صاف طور پر واضح کر دیا کہ ہمارا عشق اتنا معیاری نہیں ہو سکتا کہ جہاں ہم انسان نہ رہ جائیں یعنی ہماری کمزوریاں یا انسانی خصوصیات ہمارے عشق میں بھی نظر آئیں گی کبھی ہم معشوق سے خفا ہو جائیں گے کبھی کبھی غم روزگار کے سیلاب میں کسی کو بھول بھی جائیں گے کبھی تاب ضبط باقی نہ رہے گی تو

صدائے احتجاج بھی بلند کریں گے جذبات عشق کے اظہار میں بیباکی اور کسی قدر نفسانی خواہش کی بھی جھلک ہو گی۔

یہ ضروری نہیں کہ عشق کی دنیا حسب و نسب کی تلاش کرے گو میر نے ابتدا ہی میں سمجھا دیا تھا کہ ؎

سید ہو یا چمار رہے اس کی وفا کی شرط | کیا پوچھتے ہو عاشقی میں ذات کو تمیں

لیکن یا تو دنیا یہ اشارہ نا کافی سمجھی یا اگر سمجھی بھی تو اس قدر کہ چاہے ان سے تعشق کر لیا جائے مگر ادب میں ان کا تذکرہ ناجائز ہے موجودہ شاعر نے جراُت سے کام لیا اور انہوں نے عشق کی پاک بازی کے غلط تصور کے طلسم کو توڑ کر حقیقت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ حسن کہیں بھی نظر آئے خواہ مزدور پیشہ جماعت میں یا مہترانی میں یا بھکارن میں حقیقی جذبات کے اظہار میں تکلف بزدلی ہے۔ ایسی نظموں میں عموماً ایک پاکیزگی، نفاست انسانیت، تخئیل اور شعریت کی وجہ سے بیش بہا جوہر پائے جاتے ہیں ان نظموں کو پڑھ کر خاص قسم کا خاندانی نجیب الطرفین شخص بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔ چند اشعار اس موقع کے ملاحظہ ہوں۔

تقاضائے جوانی

منہ اندھیرے تھی جب آویزش سی مہر و ماہ میں | مہترانی کل نظر آئی مجھے اک راہ میں
چھاؤں میں تاروں کی کچی نیند سے چونکی ہوئی | اک قدم پہ جاگتی اک گام پہ سوتی ہوئی
رنگ تھا اک شہر پیما پائے بے پاپوش پر | رخ پہ الجھن ملگجی ساری کا پلو دوش پر

چال اٹھلائی ہوئی گردن کا خم مستانہ وار — انکھڑیوں میں تنگ گلیوں کی تصور کا غبار
لیکن اس عالم میں بھی اے محو فطرت ہمنشیں — غم کا کوئی غبار پیشانی کے پہلوؤں میں نہیں
دیدنی ہے تلخ پیشے کا یہ انداز طرب — اک خوشی سی انکھڑیوں میں ایک لے سی زیر لب
سچ ہے ایمائے جوانی کو دبا سکتا ہے کون — سرشباب روح پہ دور کو چھپا سکتا ہے کون

مہترانی ہو کہ رانی گنگنائے گی ضرور
کوئی عالم ہو جوانی گنگنائے گی ضرور (جوش)

حسن و عشق کی داستان میں ایک ایسی اور چیز بھی اس دور میں نظر آتی ہے جو خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس دور سے پہلے جو کچھ کہا جاتا تھا اسمیں معشوق کی تصویر ایسی نظر آتی تھی کہ شاید اس کے پہلو میں دل نہیں یا وہ انسانی جذبات سے معرا ہے۔ اس کی مثال تو شاید بہت مشکل سے ملے گی کہ معشوق کی طرف سے کہیں اظہار محبت کیا گیا ہو اور وہ آزادی اور بیباکی کے ساتھ براہ راست بیان کر دیا گیا ہو۔ موجودہ دور شاعری کی ایک یہ بھی قابل قدر اور خاص چیز ہے کہ صنف نازک کی خود داری اور احترام کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارے شعرا نے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے یعنی اس بات کو بھی بتا دیا کہ اس کے پہلو میں پتھر نہیں دل ہے۔ اس کے بھی جذبات ہیں جس طرح ہم محبت کی قدر کرتے ہیں اسی طرح وہ بھی بشریت یا روحانیت سے مجبور ہو کر اپنی متانت اور سنجیدگی کو قائم رکھتے ہوئے اظہار عشق کرتا ہے۔ محبت کے جذبہ کی قدر اس کی نگاہوں میں دیکھ کر اور کبھی کبھی اس سے متاثر ہو کر موجودہ دور کے شعرا نے اس کے خلوص و احساس کو تفصیل

کے ساتھ نظم کرنا فرض سمجھا۔

اس دور سے پہلے بھی معشوق کی وفاشعاری و احساسات کا تذکرہ گیتوں یا مثنویوں وغیرہ میں بھولے بھٹکے مل جاتا ہے مگر اسے کوئی مستقل حیثیت نہیں حاصل ہو سکی اس دور میں شعرا نے معشوق کی خوبیوں کو نہ سراہنا خلاف انصاف سمجھا۔ اور اس نقطہ نگاہ کو خاص اہمیت نصیب ہو گئی ہے یہاں ہماری مراد ایسی نظموں سے ہے جن میں مردوں نے عورتوں کے احساسات کا اندازہ کرتے ہوئے ان کی مختلف کیفیتوں کو بیان کیا ہو۔

ایسی نظموں میں شعرا نے لب و لہجہ اپنا رکھا ہے خیال بھی اپنا ہے صرف ذات دوسری ہے اس قسم کی نظموں سے اردو شاعری کا مرتبہ بلند ہوتا ہوا نظر آتا ہے نہ صرف اس وجہ سے کہ یہ چیز نئی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ صنف نازک کی داغدار تصویر کو آب حقیقت سے دھو کر نمایاں کر دیا ہے ایک غلط فہمی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ اس کی ذات سنگدل، بیوفا، بیغارہ جو، عیارہ پرفن، لاپرواہ دشمن پرست کی حد تک نہ رہ جائے بلکہ اس کی خوبیاں بھی پیش نظر ہو جائیں، اور یقین ہو جائے کہ وہ صاحب دل ہے، وفاشعار بھی ہے، عشق پرست بھی، فرشتہ خصلت بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان بھی ہے۔ اس مفہوم کے واضح ہونے کے لئے ایک نظم دیکھ لیجئے ؎

تیرے چھپنے کا سماں اس وقت ہے پیش نظر ۔ دیکھ کر وہ خوف رسوائی سے ہر سو دیکھ کر
میرا دامن تھام کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ۔ دیکھنا اور مسکرا کر تیرا وہ کہنا نہ جا

مسکراتی جا رہی ہے چشم بھی نمناک ہے
التجا کی یہ ادا بھی کس قدر سفاک ہے

۲ اُف مری صبحِ مسرت کا بھی دامن چاک ہے
اشک بھر کے سر جھکا کر تیرا وہ کہنا نہ جا

وہ کشاکش میں مرا گھبرا کے رو دینا کبھی
باتوں باتوں میں ترا نشتر چبھو دینا کبھی

۳ اپنی ہستی کو ترے جلوؤں میں کھو دینا کبھی
سر مرے شانے پہ رکھ کر تیرا وہ کہنا نہ جا

ایک آویزش سی تھی اقرار اور انکار میں
ناگہاں تیری صدا گونجی در و دیوار میں

۴ محو تھا کچھ دیر تک تو بھی انہی افکار میں
چھا گیا ہستی پہ میری، تیرا وہ کہنا نہ جا

میری کشتیِ عزائم آ گئی گرداب میں
تھا عجب ہنگامہ یہ بھی زندگی کے باب میں

۵ لہر اٹھی تیری محبت کی دلِ بیتاب میں
روٹھنا اور پھیر کر منہ تیرا وہ کہنا نہ جا

میری کچھ مجبوریاں رکنے سے مانع ہو گئیں
عالمِ اسباب کی تاریکیوں میں کھو گئیں

۶ جاگ کر ساری تمنائیں یکایک سو گئیں
سُن کے بھی میں کچھ نہ بولا تیرا وہ کہنا نہ جا

شوقِ دنیا نے ترے پہلو سے بہکایا مجھے
تیرے دردِ عشق کو ادبار بتلایا مجھے

۷ سبز باغ اک دولت و ثروت کا دکھلایا مجھے
کچھ اثر آخر نہ لایا تیرا وہ کہنا نہ جا

اپنے ہی ہاتھوں کر اپنا خونِ دل کرتا ہوا
آج تک کانوں میں ہے لیکن وہی شیریں صدا

۸ تجھ کو مضطر چھوڑ کر میں نا سزا رخصت ہوا
دور جانے پر بھی مڑ کر تیرا وہ کہنا نہ جا

ہے تجھے اتنی محبت میں اسے سمجھا نہ تھا
دیکھتا ہوں وہ کہ جو پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

۹ اب سے پہلے میرا جذبِ آرزو سچا نہ تھا
وہ محبت کی نظر اور تیرا وہ کہنا نہ جا

تیرا اظہارِ تمنا وقتِ رخصت بار بار
جس پہ کرتا ہوں سلیقے سے میں ہر اک شے نثار

۱۰ ہے مرے عہدِ محبت کی وہ نیندیں یادگار
یاد اب تک آ رہا ہے تیرا وہ کہنا نہ جا

(احتشام)

اس میں ایک عورت کو جن مختلف جذباتِ محبت سے متاثر ہوتے ہوئے آپ دیکھتے ہیں، کیا اس کے بعد وہی خیال قائم رہ سکتا ہے کہ وہ انسانی جذبات سے مبرا ہے۔ یا عورت صنفِ نازک نہیں۔ اس مختصر سی نظم میں علاوہ معاملہ بندی کے نفسیاتی تحلیل جس خوبی سے کی گئی ہے وہ ایسی چیز ہے جس پر ہر شریف و پاکباز عورت فخر کر سکتی ہے۔

موجودہ رجحان نے نفسیاتی اصول سے عشق و حسن کی داستانوں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ گوشت و پوست کے انسان سے محبت کرنے میں ہر وہ ادا یا وضع جو جذبات انسانی کو متاثر کر سکتی ہے دورِ حاضر کی نظموں میں خوبصورتی سے جگہ پا رہی ہے یہ انداز بیان و مضامین عہدِ قدیم کے پرستاروں کے نزدیک غیر مناسب و مذموم ہیں لیکن موجودہ شعرا ان کی تنقید پر زیادہ چیں بجبیں بھی نہیں ہوتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انھوں نے ایسے شعر کی قدر کب کی جب داغ نے یہ شعر کہا تو پرانے لوگوں کی تیوری پر بل آ گئے۔

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی　　　　آف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

اس زمانہ میں واردات قلب کو وضعداری یا پاکیزگی کے ڈر سے چھپائے رکھنا تصنع یا ذہنی غلامی سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ ہاں سوسائٹی کے مذاق کا خیال رکھنا بے شک ضروری خیال کیا گیا ہے لیکن اتنا نہیں کہ فطری حالت کا اظہار نہ ہو سکے صرف انداز بیان سے مضامین کے عامیانہ پن کو دور کیا جاتا ہے، رنگینی و لطافت سے اتنا ماحول پیدا کر لیا جاتا ہے کہ ذہن و جذبات کو بہکنے کا کوئی موقع نہ ملے بلکہ کیف و نفاست سے دل و دماغ کو تازگی

حاصل ہوتی رہے اور جملہ لوازمات کے ساتھ حسن حسین تر نظر آنے لگے۔

ان نظموں کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی ضمناً کہہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ جس طرح موجودہ تمدن نے مغربی اثر کی وجہ سے لوگوں کو ایک حد تک مجبور کر دیا ہے کہ بیوی اور شوہر ایک دوسرے کا نام لیں اور "ان" "یا" "فلاں کے ابا یا اماں" وغیرہ کے اشاروں کو ناکافی یا غیر مستحسن سمجھ کر چھوڑ دیں، اسی طرح ہمارے بعض شعراء نے بھی معشوق کو "کسی"، "کوئی"، اور "وہ" کے اشاروں سے . . . . . . یاد کرنا مناسب نہ سمجھا معشوق کے مستقل نام رکھ لئے ہیں۔ کوئی "شیاما" کہتا ہے اور کوئی "سلمیٰ"، غرضکہ فرسودگی سے الگ ہونے کی ہر طرح بری یا بھلی کوشش ہو رہی ہے۔

اردو کی رومانی نظمیں ابھی تک جنسی جذبات پر زیادہ مبنی ہیں ابتدائے شباب کے نوخیز ولولوں کو پورے ہیجان کے ساتھ ہمارے شعرا پیش کرنا کافی سمجھ لیتے ہیں۔ ان نظموں میں عمق و ندرت بہت کم ہوتی ہے نرم و نازک الفاظ سے کھیلنے کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔ جوشؔ نے اسی کمی کو بڑی حد تک دور کرنے کی کوشش کی ہے ان کے یہاں خارجیت اور داخلیت کا امتزاج بڑے حسن کے ساتھ نظر آتا ہے۔

رومانی نظموں میں واردات حسن و عشق کے ارتقاء اور مختلف جذبات کے تصادم سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں ان کی وضاحت سے جوشؔ اپنے کلام کی سطح بہت بلند کر دیتے ہیں فطری مناظر کے اوپری پردوں کو چیرتی ہوئی ان کی نظریں اس سرچشمہ تک جا پہنچتی ہیں جہاں سے حسن وجما

کی لہریں رواں ہوتی ہیں اور جو اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ شاعر سے ہمکلام ہوکر رازِ مشیت اس کے سامنے بکھیر دیتی ہیں، وہ مناظرِ قدرت کو ذی حیات محسوس کرتا ہے ان میں جذبات کی دنیا پاتا ہے۔ ان کے لبِ خاموش کے نغمے، ان کا رجز، غرضکہ ہر ایک جنبش وادا سے اپنی شاعری کا مواد حاصل کرتا ہے اور پھر تشبیہ و استعارے یا سادگی و اشارے میں جیسا موقع ہوتا ہے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور دیکھنے والے کو قدرت سے زیادہ منظر کے قریب کردیتا ہے، یہ سب باتیں جوشؔ کو اردو کی رومانی شاعری میں بھی اوروں سے زیادہ بلند کر دیتی ہیں۔

رومانی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے شعرا مطمحِ نظر اور بنیادی اصول زندگی کو عشق پر قربان کرنا نہیں چاہتے وہ اس کو زندگی کا ایک خاص رخ سمجھتے ہیں مگر اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ فنا فی العشق ہو جائیں۔ چنانچہ عشقیہ نظمیں لکھتے وقت بھی وہ کبھی کبھی اپنے زبردست جذبات سے مغلوب ہو کر نظموں کے درمیان ایسی چیزیں کہہ جاتے ہیں جن میں سماجی، سیاسی اور ذہنی کشمکش و احساس کے نقوش اُبھر آتے ہیں۔ لیکن چونکہ داستان زندگی محبت سے پیہم متاثر ہوا کرتی ہے اس لئے باوجود تمام ترقی پسند ذہنیت کے بھی شاعر حسن و عشق کی دلفریبیوں سے مغلوب و مسحور ہو کر ان ہی کا راگ گانے لگتا ہے لیکن اس انفرادی سیلاب میں بہہ نہیں جاتا اس کا سماجی و سیاسی شعور ہمیشہ بیدار رہتا ہے اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے، ہم ایک نظم کا اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو آزادیٔ ہند سے چھ سال پہلے لکھی گئی تھی

بہار کشمیر

بہار کیسی کہ جانِ بہار ہے کشمیر — ز فرق تا بہ قدم اک نگار ہے کشمیر
نمو کو شکل مجسم بنا دیا اس نے — کہ رنگ و بو کا اک عالم بنا دیا اس نے
قدم قدم پہ یہاں ہے شباب کا عالم — نہ پوچھیے دلِ خانہ خراب کا عالم
درخت ہیں کہ یہ مصرعے بیاضِ قدرت میں — کھڑی ہیں حوریں سنور کر کنارِ جنت میں
بلند قد وہ سپیدے بہار در آغوش — کہ جیسے باغ میں کوئی حسین دوشالہ پوش

یہ سب بہار دیکھتے اور نظم کرتے ہوئے شاعر کا گذر نشاط باغ میں ہوتا ہے اور وہاں چشمہ کی روانی دیکھ کر متاثر ہوتا ہے۔ فواروں کے قریب پہنچ کر وہ ایک ایسے خیال سے مغلوب ہو جاتا ہے جو روحانی دنیا سے تھوڑی دیر کے لئے الگ کر دیتا ہے لیکن پھر وہ اپنی انفرادی سکون و مسرت کی دنیا میں کچھ عرصے کے لئے گم ہو جاتا ہے۔

سنو سنو کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں فوارے — نہ سمجھو پانی اگلتے ہیں ہم یہ انگارے
یہ نہر نہر نہیں ہے یہ آتشِ سیال — یہ آبشار نہیں غم سے قلب ہے غربال
کہاں وہ نورجہاں اور سلیم کی دنیا — کہاں وہ شاہ جہانِ حکیم کی دنیا
گلاب نورجہاں ختم ہو گئے کب کے — وہ اپنے مالک و قسمت کو رو گئے کب کے
اب ان کی جا پہ ہیں وہ پھول باغ مغرب کے — کہ جن میں بو نہیں لیکن ہیں ملک غالب کے
ہمارے آنسو تمہارے لئے یہ موتی ہیں — نگاہ تنگ ہے آنکھیں تمہاری سوتی ہیں

. . . .

تم ایک بوجھ ہو اب سینۂ سیاست پر | تم ایک داغ ہو رخسارِ آدمیت پر
یہ کوہسار شکن ہیں جبینِ فطرت کی | بچو عتاب سے تم زد میں ہو قیامت کی
یہ اونچے اونچے پہاڑوں کو دیکھنے والو | کچھ اپنی ذلت و پستی کی تھاہ بھی دیکھو

خطا معاف یہ سب سن لیا مگر اعجاز | غلام ہیں مرے جذبات بھی غلام نواز
مرے سکون کی دنیا نشاط و شادمانہ | مجھے یونہی ابھی کچھ اور بہنے دے سرشار
نسیم اُلجھی چمن میں وہ گدگداتی ہوتی | کہیں کہیں وہ کھلے پھول کچھ گراتی ہوئی
وہ چھیڑا موجوں نے نغمہ بجا بجا کستار | پھر آنکھ کھول ذرا دیکھ اب بہار بہار

وہ اس طرح گرد و پیش کے مناظرِ حسن سے اثر لیتا اور اپنے ماحول کو سامنے رکھتا ہر طرف نظریں دوڑاتا ہے حسن و نغمہ کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ ان کی سحر آفرینیوں کا قائل بھی ہے مگر انسانیت اجازت نہیں دیتی کہ وہ ان جذبات میں کھو جائے بقول مجاز ؎

یہ خیال آتا ہے رہ رہ کر دلِ بیتاب میں | بہہ نہ جاؤں پھر ترے نغمات کے سیلاب میں

تبلیغ و تلقین کے محدود دائرے سے نکل کر موجودہ نظموں کو ادبیت و ابدیت بخشنے کا خاص شرف اقبال کو حاصل ہے انھوں نے ادب العالیہ کا راستہ بتا دیا تھا مگر اس عبوری دور میں سیاسی نقطۂ نگاہ و ہردلعزیزی کو مدنظر رکھتے ہوئے شعرا نے زیادہ تر کلام کو محض پیام بنانے کی فکر کی۔ بہت کم ایسے شعرا نظر آئیں گے جو وقتی ضروریات سے الگ ہو کر ہمہ گیری کی طرف نظموں کو بڑھائیں یا وقتی ضروریات کو فنی حیثیت سے اتنا ادبی عنصر عطا کریں کہ نظم خود ہمہ گیر و ادب العالیہ نظر آنے لگے ان چند مخصوص شعرا میں جنھوں نے اس طرف توجہ کی ہے اقبالؔ

جوشؔ، فراقؔ، سردارؔ جعفری، ندیمؔ قاسمی، فیضؔ اور وامقؔ قابل ذکر ہیں۔

جغرافیائی رجحان

یوں تو عہدِ قدیم میں بھی کبھی کبھی مختلف شہروں اور مقامات پر اردو شعرا نے توجہ کی ہے اور ان کے اوصاف اور اپنے جذبات نظم کئے ہیں مثلاً گجرات، دہلی، لکھنؤ، اور تاج محل وغیرہ پر مختلف اصنافِ سخن میں خیالات کا مظاہرہ کیا گیا ہے لیکن ذاتی جذبات کی طغیانی یا وطن پرستی کا شدید احساس غالب آگیا ہے جس کی جھلک پورے کلام میں نظر آتی ہے حقیقت یا جغرافیائی مناظر پس پشت ڈال دئے جاتے ہیں دورِ جدید سے اس رجحان کو ترقی یافتہ شکل میں پیش کیا جانے لگا شہر یا مقام کی طبعی خصوصیات وہاں کی مشہور چیزوں کا تذکرہ گرد و پیش کے مخصوص حالات نظموں میں جگہ پانے لگے۔ شاعرانہ حسن اور منظر نگاری کی خوبیاں بڑی تیزی سے آنے لگیں۔

دورِ جدید اور دورِ حاضر دونوں زمانوں میں ہمیں اس قسم کا رجحان برابر ملتا ہے مولانا صفیؔ کو شہروں کے جغرافیائی حالات نظم کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ مختلف مقامات کی طبعی روداد اور مشہور واقعات کا نظم کرنا ان کا خاص حصّہ ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی چند نظمیں مثلاً الہ آباد۔ جونپور۔ بمبئی وغیرہ اردو میں اپنا نظیر نہیں رکھتیں۔ دوسرے شعرا نے دوسرے مقامات پر بھی جو نظمیں کہی ہیں ان میں بھی حقیقت و قدرتی نشیب و فراز کو زیادہ مد نظر رکھا گیا ہے شاعرانہ انداز بیان سے ان کے حسن کو بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصلیت

کی فطری کشش کو مبالغہ یا تشبیہ و استعارے کی بھر مار سے مجروح نہیں کیا گیا، چکبست کی "سیر دہرہ دون" حفیظ جالندھری" کی "تصویر کشمیر"، اقبال کی "ہمالیہ" اور اس قسم کی بہت سی نظمیں جغرافیائی رجحان کی بہترین مثالیں ہیں۔

تاریخی رجحان تاریخی یا نیم تاریخی واقعات بھی اردو شاعری میں کوئی نئی چیز نہیں سودا کے یہاں یہ چیز کبھی قصیدے کا جزو بن کر اور کبھی "شہر آشوب" کے پردے میں نمایاں ہوتی ہے علاوہ اس کے دہلی کے مرثیے جو مختلف شعراء کے جذبات پر مبنی ہیں اور ایک مجموعہ کی صورت میں چھپ بھی گئے ہیں خود مستقل تاریخی نظمیں ہیں۔ دورِ جدید میں اس رجحان کو کچھ اور فروغ ہوا۔ سیاسی بیداری کے ساتھ یہ جذبہ بھی آہستہ آہستہ کچھ تیز ہوتا رہا۔ یہ صحیح ہے کہ کوئی خاص اہمیت اب تک اس رجحان کو نہیں حاصل ہو سکی۔ لیکن شاعرانہ لطافت و مختلف زاویہ نگاہ سے واقعات و اشخاص کو پیش کرنا دورِ حاضر کا امتیازی کارنامہ ہے۔

"عدلِ جہانگیری"۔ "رامائن کا ایک سین"، "حسین اور انقلاب" جیسی نظموں میں شاعر کی خوبیوں کے علاوہ کردار نگاری کا نہایت عمدہ نمونہ پیش کیا گیا ہے علاوہ اس کے ہیرو یا واقعات پر شخصی یا ذاتی جذبات سے مغلوب ہو کر نظر نہیں ڈالی گئی بلکہ زیادہ تر قومی نقطۂ نگاہ سے کام لیا گیا ہے۔ ایسی نظموں نے اردو کے دامن کو صرف وسیع نہیں کیا بلکہ عام انسانی جذبات و ایثار کی ہمہ گیری سے مانوس کر دیا۔ علاوہ اور شعراء کے اقبال و چکبست

نے مختلف اشخاص کے کردار بیان کرکے اردو ادب کے نظریہ کو وسیع کرنے کی بڑی اچھی کوششیں کی ہیں۔

دورِ جدید میں "مدوجزر اسلام" یعنی مسدس حالی تاریخی رجحان کی بہترین پیداوار ہے یہ نظم اپنی جملہ خوبیوں کی وجہ سے آج بھی ایک خاص قدروقیمت کی مالک ہے۔ واقعات جذبات، انقلاب، تخریب وتعمیر کے اسباب پر ناقدانہ نظر ڈالنا اور پھر واقعات میں لطیف شاعری کا رنگ بھرنا حالی کو عام شعرائے اردو سے ممتاز کر دیتا ہے۔

دورِ حاضر میں امام حسینؓ کے ایثار و استقلال کو جتنا سراہا گیا ہے اتنا کسی دوسری ہستی کو اردو شاعری نے غزل و نظم میں جگہ نہیں دی۔ اقبال، حفیظ، جوش کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی قومی مجاہد کی بہترین مثال میں امام حسینؓ کو یاد کیا ہے حال ہی میں جوش نے ایک مستقل نظم 'حسین اور انقلاب' کے عنوان سے کہی ہے جس میں مذہبی یا فرقہ وارانہ ذہنیت سے بالاتر ہوکر امام حسینؓ کے کارنامہ پر نظر ڈالی ہے۔ حق و باطل کی جنگ میں آخر وقت تک مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بہترین مثال و ایثار کا نمونہ بتایا ہے۔ اس نظم میں موجودہ سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہمت و شجاعت و قربانی پر تنقید کی گئی ہے۔ شاعری کے لحاظ سے یہ نظم جوش وخروش، روانی اور ابھار سے سرتاپا معمور ہے۔ تشبیہات کی ندرت لب ولہجہ کی بلندی، تلمیح و معنی میں وسعت ذہن اور مذاق سلیم کو ایک لمحہ کے لئے بھٹکنے نہیں دیتے۔

اردو کا تاریخی رجحان غالباً تشنہ رہ جاتا اگر حفیظ نے شاہنامۂ اسلام

کی متعدد جلدیں لکھ کر اس مذاق کو راہ تکمیل میں آگے نہ بڑھایا ہوتا۔
حفیظ کا کارنامہ تاریخی انداز میں دنیا کے سامنے آگیا ہے جس میں اسلام کے تمام
کارنامے پر مورخانہ نظر ڈالی گئی ہے ظاہر ہے کہ تاریخ ایک ایسا خشک موضوع
ہے جس میں شاعرانہ لطافتیں داخل کرنا بہت مشکل ہے اور پھر اس عالم میں
جب جا بجا تاریخ درروایات وجذبات وعقائد میں تصادم ہو تو شاعر کو اپنا
کام نکالنے میں جس او گھٹ گھاٹ سے گذرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل
ہے مگر حفیظ نے تمام مراحل حسن وکمال کے ساتھ طے کئے ہیں تاریخی واقعات
بھی مجروح نہیں ہوئے اور کسی کی دلآزاری بھی نہیں ہونے پائی اتنی طویل
نظم اور ایسے خشک موضوع کو انتہائی دلچسپ ولطیف بنانا صرف حفیظ کا ح
حصہ تھا۔ شاعرانہ لطافت وحکیمانہ نکات کے ساتھ ساتھ مورخانہ مذاق کا امتزا
اس نظم کی ایسی نمایاں خصوصیت ہے جس نے "شاہنامہ اسلام" کو اتنا مقبول
بنا دیا کہ حفیظ کی شہرت لازوال ہو گئی ہے۔

مزاحیہ رجحان

ظرافت کا عنصر مختلف حیثیتوں سے ادب کے ابتدائی دور میں بھی نظر آتا ہے۔ ریختی، ہجو، طنز، استہزا غرضکہ مختلف عنوانات سے یہ جلوہ گر نظر آیا۔ سودا، مصحفی، انشا، جرأت وغیرہ کو ظرافت کے میدان میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ان لوگوں نے اسے ایک مستقل فن بنانے کی کوشش نہیں کی نہ ان کے پیش نظر کوئی بلند مقصد تھا۔ زیادہ تر ہنسنے ہنسانے کا سامان سمجھ کر بازار ادب میں ہجو، ہزل، ریختی

وغیرہ پیش کرتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بات عمدہ پیدا ہو جاتی تھی ورنہ عموماً ظرافت کی تگ و دو تفریح تک محدود تھی۔ ادبی لطافتیں اور شاعرانہ عظمتیں اس صنف کو دورِ حاضر میں نصیب ہوئیں۔

اکبر نے ظرافت کی سطح اتنی بلند کر دی کہ دنیائے ادب میں بالکل نئی چیز معلوم ہونے لگی۔ ایک بلند مقصد اور ایک خاص انداز سے انھوں نے اسے ایسا لطیف فن بنا دیا کہ ان کا مذاق متانت و سنجیدگی کا مرادف ہو گیا اس سے پہلے اردو شاعری کی ظرافت نگاری میں ذات پات، یا فحاشیات کا غلبہ ہوتا تھا۔ لیکن اکبر نے ایسے تکلیف دینے والے عناصر یک قلم خارج کر دیئے۔ پاکیزگی و وسیع النظری شامل کر کے ظرافت کو ایک ایسی ہمہ گیری عطا کر دی جو اب سے پہلے دیکھنے میں نہیں آتی ان کی ہنسی میں ذات پات کا شائبہ بھی نہیں اگر کبھی کبھی کوئی نام سر سید، یا گاندھی کا آجاتا ہے تو اس سے بھی ان کی مراد کسی ایک شخص کی ذات سے نہیں بلکہ پورے اسکول سے ہوتی ہے۔ اکبر کا کوئی خیال کوئی لفظ کوئی اشارہ ایسا نہیں ہوتا جو عمدہ سے عمدہ صحبت کے لئے موزوں نہ ہو۔

اکبر کے ہاتھوں ظرافت کا رجحان بالکل بدل گیا۔ ابتذال و عامیانہ پن کے بجائے معنویت و ہمہ گیری اور لطافت کا غلبہ ہوا۔ ہنسنے ہنسانے تک اس کا دائرہ محدود نہ رہا۔ رفتار زمانہ پر ناقدانہ اور لطیف انداز سے تبصرہ کرنا اس کا جزو اعظم ہو گیا۔ مزے مزے سے چٹکیاں لے کر لوگوں کو راہ راست پر لانا ہنسا ہنسا کر اپنی کمزوریوں پر رلانا۔ علمی دنیا میں

آگے بڑھانا اور پھر ناصح مشفق نہ معلوم ہونا یہ ایک زبردست فن کار دوراندیش شاعر کا کام تھا، جسے اکبر نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔ اکبر سے پہلے کے شعراء کے مذاق طرزِ تخئیل، ادبیت میں اتنا فرق ہے کہ امتیازکے خیال سے بھی ہم اکبر کی ظرافت اوروں سے الگ رکھنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ طرزِ بیان، وجدت مضامین سے اس صنف کو اکبر نے اس مرتبہ پر پہنچا دیا کہ اس کے بعد باوجود کوشش کے بھی اس میدان میں کوئی ان کا حریف نہ بن سکا اس کا راز ان کی فطری ذہانت وطباعی میں مضمر ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ظرافت کو اکبر نے نئے نئے استعارے اور کردار عطا کئے ہیں۔ جمن، کلو، بدھو، نحقو وغیرہ ایسے مبتذل نام مگر اس باکمال شاعر نے ان ناموں میں ایک خاص صلاحیت پیدا کر دی ہے جو ہمارے سامنے ایک ایک وسیع مفہوم لے کر آتے ہیں اور ایک مخصوص طبقہ کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان کے کلام کا نمونہ مختلف مثالوں کے سلسلہ میں کافی پیش کیا جا چکا ہے اس لئے اب یہاں اقتباس دینا تحصیل حاصل ہے۔

اکبر کے بعد مزاحیہ رجحان کو ہردلعزیز و کامیاب بنانے والوں میں سب سے پہلا نام ظریف کا آتا ہے۔ ابتدا میں جب وہ مزاحیہ غزلیں کہتے تھے تب تک شائدان کے پیش نظر کوئی بڑا مقصد نہ تھا۔ اس وقت ادب کی درستی میں زیادہ تر ان کی نظر ان چیزوں پر پڑی جو حقیقت میں مبالغہ کی آخری حد تک پہنچ گئی تھیں۔ اور ان میں شاید کوئی کیف بھی باقی نہ رہ گیا تھا۔ مثلاً ؎

ایک ٹھوکر سواڑائے جو مزارِ عشاق   وہ تو معشوق نہ ہوگا کوئی ہاتھی ہوگا

خیالِ ہجر میں فرضی مریضِ غم کا مر جانا — یہ سب کیا ہے سلامت جھوٹ کے پل سے اتر جانا

یہ حسن نرالا ہے کہ دو عضو ندارد — معشوق وہ ہے جس کے دہن بھی ہو کمر بھی

ظریف معراجِ کمال پر اس وقت ہوتے ہیں جب وہ طولانی نظمیں کہتے ہیں اس وقت ان کی فطرت نگاری و موقع شناسی کے ساتھ ساتھ شاعری کی لطافتیں بھی اُبھار پر ہوتی ہیں۔ ظریف نے اکبر کی طرح 'انقلابات' پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ ان کی مختلف نظمیں مثلاً 'ہوم رول' 'گول میز کانفرنس' وغیرہ ان کے مذاق اور نفسیاتی تخیل پر قادر ہونے کی عمدہ مثالیں ہیں۔

مزاحیہ شاعری نے اب اپنا مستقل شعار اصلاح بنا لیا۔ اور اس میدان میں آنے والوں سے دقتِ نظری اور وسیع الخیالی کے علاوہ فنی صلاحیت کا بھی مطالبہ کرنے لگی۔ سماجی و سیاسی نظریوں سے واقفیت کا بھی سوال ہونے لگا۔ اس کسوٹی پر زیادہ لوگ پورے نہ اُترے ظرافت و تمسخر سے تو کھیلنے والے کافی شاعر نظر آئے مگر عدم صلاحیت کی وجہ سے بہت کم لوگ کوئی مستقل حیثیت قائم کر سکے حسبِ استعداد ہر شخص ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور اصلاحی فریضہ بھی پیش نظر رکھتا ہے مگر عمومیت و دو رسی ناکافی ہونے کی وجہ سے مزاحیہ رجحان ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ موجودہ دور میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر مزاحیہ شاعری میں سید محمد جعفری ہیں جو اس وقت کراچی میں سرکاری عہدہ دار ہیں ان کے یہاں سیاسی رموز اور شخصی خصوصیات کا نقد و تبصرہ نہایت حسین طریقہ پر ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں مشہور شعرا کے بعض مصرعوں کو اسی طرح اپنے کلام میں نظم کرتے ہیں

کہ گویا یہ مصرعہ اسی مطلب کے لئے کہا گیا تھا۔

فلسفیانہ و مفکرانہ رجحان

اردو غزل میں فلسفیانہ تخیل کی ابتدا غالبؔ سے ہوئی لیکن نظموں میں سب سے پہلے اقبالؔ نے ادھر قدم اٹھایا وہ فلسفی تھے۔ اور شاعر بھی، بڑی خوبیوں کے ساتھ رموز و معارف کو انھوں نے اپنے کلام میں نظم کیا۔ بلند و باریک باتوں کو بھی اپنی قابلیت سے دلکش و عام فہم بنانے کی کوشش کی اردو کا دور حاضر بھی روزمرہ کے خیالات و معمولی باتوں سے آگے بڑھنا چاہتا تھا تخئیل کی بلند پروازی و حقائق کا انکشاف بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے۔ اقبالؔ نے اس رجحان کو اور زیادہ اہم و وقیع بنا دیا —

اقبالؔ کی نظم "فلسفۂ غم" کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گو سراپا کیف عشرت ہے شراب زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحاب زندگی

موج غم پر رقص کرتا ہے حباب زندگی
ہے 'الم' کا سورہ بھی جزو کتاب زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں

یا پھر کہتے ہیں ؎

غم نہیں غم، روح کا ایک نغمۂ خاموش ہے
جو سرود بربط ہستی سے ہم آغوش ہے

یا "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کہتے ہیں ؎

آہ یہ دنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت　　گلشنِ ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت!

یا پھر سے

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں　　ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

یا "خضر راہ" میں کہتے ہیں سے

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　جاوداں پیہم دواں ہر دم رواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے　　سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

جوش کا فلسفہ اقبال کے فلسفہ سے کسی قدر الگ ہے وہ ایک طرف تو عمر خیام کے نظریہ کی تحت میں اظہار خیال کرتے ہیں حقائق و معارف کے رخ سے پردے اٹھاتے ہیں مگر رندانہ انداز سے مادی زندگی کو اصل زندگی سمجھتے ہیں مذہب و اخلاق پر افادی نقطۂ نگاہ سے تبصرہ کرتے ہیں۔ رموزِ فطرت پر جو مذہب و روایات کی چلمنیں پڑی تھیں ان کے نزدیک وہ رسمی جذبات کی وجہ سے اٹھ نہیں رہی تھیں حالانکہ اٹھنا بہت ضروری تھا۔ جوش ان فطری مسائل پر علم کی روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اور اتنی تیزی سے کہ کوئی گوشہ زیرِ نقاب نہ رہ جائے حقیقت رسوم کے زنگ سے الگ ہو جائے۔

جوش اور اقبال کے انداز بیان میں بھی فرق ہے۔ اقبال نے اپنا مفہوم واضح کرنے کے لئے اصطلاحی الفاظ و مخصوص محاورے منتخب کر لئے تھے جو فلسفیانہ نکات کے بیان کرنے میں ایک خاص سماں پیدا کر دیتے ہیں جس میں پوری فضا حکیمانہ انداز سے سامنے نظر آتی ہے۔ جوش نے اپنے بیانات کو پیش

کرتے وقت اس قسم کا کوئی ماحول نہیں پیدا کیا۔ صرف تخیل و ندرت پر بھروسہ کیا ہے۔

اس سلسلہ میں جوش کے مخصوص انداز میں ان کے چند اشعار بھی ملاحظہ کر لیجئے

باغی روحوں کا کورس

کب ہے ہر پنجۂ تبلیغ میں دامانِ سکوت — کب ہے بے نغمۂ شریعت ہر ثنا خوانِ سکوت
کب ہے ہر سجدہ و تسبیح میں طغیانِ سکوت — کب ہے خورشید کی حدت میں بھی فرمانِ سکوت
پھر بھی جنبش میں ہے ذروں کی زبان کیا کہنا

خاک پر نوحۂ پیہم کی لگی ہیں مہریں — زیست پر دیدۂ پرنم کی لگی ہیں مہریں
دفترِ عیش پہ بھی غم کی لگی ہیں مہریں — ذرے ذرے پہ جہنم کی لگی ہیں مہریں
پھر بھی دنیا پہ ہے جنت کا گماں کیا کہنا

کب ہے نازل ہے حقائق پہ بلائے اوہام — ذہنِ نازک جنت میں ہو دوزخ کی لگام
کب ہے فطرت کے جگر میں ہر خراشِ الہام — کب ہے ہر ذوقِ نظر حکمِ شریعت سے حرام
وہی نظریں ہیں وہی حسن جواں کیا کہنا

روح کے بیچ کدۂ عالمِ افلاک میں بھی — وہمِ فردوس کو ٹھنڈے خس و خاشاک میں بھی
نقد کی سرد و خنک انجمنِ پاک میں بھی — شبنم و برف کے اس حلقۂ نمناک میں بھی
اٹھ رہا ہے دلِ انساں سے دھواں کیا کہنا

آفریں باد براں ہمت کونین شکار ۔۔ نہ تو شکوے ہی سے واقف نہ شکایت سے دوچار
نشۂ عہد جواں کا ہے ہر چند اتار ۔۔ اس پہ قرنوں کا ہے شانوں پہ اٹھائے ہوئے بار
پھر بھی رقصاں ہے جہانِ گزراں کیا کہنا

مفکرانہ رجحان صرف نظموں تک محدود نہیں بلکہ غزل میں بھی اس کا عنصر کافی نمایاں ہے آپ کو یاد ہوگا کہ غزل میں فلسفیانہ خیال ادا کرنے کی کوشش غالب نے کی تھی لیکن ان کے عہد میں یہ رجحان رجحان نہ ہو سکا۔ ایک عرصے کے بعد جب جدید علوم سے ذہنیت آراستہ ہوئی اور مذاق نو کی عینک سے کلام غالب پر ناقدانہ نظریں ڈالی گئیں تو ان کی ممتاز خوبیوں کے ساتھ ان کا فلسفہ بھی چمک اٹھا تخئیل کی بلند پروازی کے لئے شعراء نے اس کا سہارا ضروری سمجھا۔ چنانچہ ہر طبقہ فکر نے اس طرف توجہ کی اور غزل میں فلسفہ یا فلسفیانہ کوششیں برابر نظر آنے لگیں۔ عزیز۔ اصغر۔ فانی۔ جگر؛ اور فراق وغیرہ کی غزلوں میں اس قسم کے اشارے اکثر ملتے ہیں لیکن اس رجحان کی نمائندگی آج کل کی رباعیات زیادہ کر رہی ہیں۔

غزل دور حاضر کی غزلوں کا رجحان بھی قابل دید ہے۔ اس دور سے پہلے جو خرابیاں غزل میں آگئی تھیں نہ صرف وہ دور ہوئیں بلکہ بعض لحاظ سے وہ خصوصیات بھی نمایاں ہوئیں جو شاید کسی ایک دور میں اردو نہیں پیدا کر سکی تھی۔ ایک ایک خصوصیت کو با تفصیل بیان کرنا تو طوالت کا باعث ہوگا۔ مختصراً موجودہ دور کی غزل گوئی پر حسب ذیل خصوصیات قابل ذکر و توجہ ہیں جو ہم اپنی ایک کتاب[1] سے لے کر یہاں نقل کئے دیتے ہیں۔

دور حاضر میں غزل نے بھی نئے انداز سے نغمہ سرائی کی۔ تاثیر۔ ترنم دلوں پہ

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو

ہمواری ۔یک رنگی ۔جذباتی اور ذہنی کیفیات کے اظہار میں خاص توجہ کی گئی ۔ تصنع اور لفظی بھرمار اور بیکار باتوں کے بجائے شعرا نے سادگی ۔سچائی ۔روانی بندش کی چستی اور موسیقیت کو جگہ دی ہے ۔لطیف و پرمعنی کنایات موجودہ اُردو غزل کی امتیازی خصوصیات سے ہیں ۔ عام طور پر غزلوں میں فلسفۂ حیات اور حقیقت ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے ۔جو واقعات وامور بادی النظر میں مخصوص و محدود نظر آتے تھے ان کو دوربین نگاہوں نے غیر متناہی اور بے پایاں دیکھ کر شعرا کے کلام میں حیرت کا عنصر بہت بڑھا دیا ہے ۔

تصوف نے اصولی اور رسمی پیرایۂ بیان سے قدم بڑھا کر اکثر مقامات پر زیادہ رنگین اور شاعرانہ شکل اختیار کر لی ہے ۔مسائل تصوف کا بیان سیکڑوں نئے عنوان سے شعرا کرنے لگے ہیں ۔اپنی شخصیت اور انفرادی لب و لہجہ کو قائم رکھنے کی کوشش بھی دور حاضر کی ایک مخصوص چیز ہے متعدد غزلیں عشق حقیقی اور مجازی دونوں عنوانوں سے الگ ہو کر محض مسئلہ حیات کے موضوع پر ملیں گی ۔

ایک اور بڑی خصوصیت جو موجودہ اردو غزل میں نظر آتی ہے وہ اسکی حقیقت و واقعہ نگاری ہے ۔مبالغہ سے گریز کر کے ابتذال کے گندے نالے سے بچتے ہوئے ہمارے شعرا نے جذبات و تخیل کی پاکیزہ دنیا کو آباد کرنا سب سے پہلا کام سمجھا ۔عموماً وہ ان ہی خیالات کو نظم کرنا چاہتے ہیں جن میں حقیقت و کیفیت ہو تیز شوخی و بے کیف مبالغہ سے غزل کو بڑی حد تک دور جدید نے محفوظ رکھا ۔فرسودہ اور مبتذل مضامین، تصنع اور محض رسمی باتیں مفقود ہو چلی ہیں ۔

جو الفاظ و تراکیب کثرت استعمال سے پامال ہو چکی تھیں۔ ان سے گریز۔ اور نئی ترکیبوں اور نئے انداز سے کلام کو سنوارنے کی جد و جہد جاری ہے۔

زبان سے زیادہ خیالات کی بلندی و پرکاری پر زور ہے اس وجہ سے آج کل کبھی کبھی نامانوس ترکیبیں تو ضرور نظر آتی ہیں لیکن خیالات کی بلندی اور مضامین کی نوعیت پہلے سے اب بہت زیادہ قابل قدر ہے۔ نفسیاتی تحلیل "سبب" اور اس کے باربط اثر سے غزل کی دنیا آراستہ کی جا رہی ہے حسن تعلیل کی مثالیں زیادہ قاعدے کی اور قابل قبول آنے لگی ہیں۔ اس میدان میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ فلسفہ حیات و رموز ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے۔ مثالیت سے گذر کر واقعاتی حقیقت کا بھی بحیثیت انسان بیان کر دینا غزل گو شاعر نے بھی عاشق کے لئے مستحسن سمجھا ہے، حسرت موہانی کا شعر ہے کہ ؎

نہیں آتی جو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

یا فراق دوسری حالت کو بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں

واردات قلب کے فطری پہلو کو شاعر نے بیان کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ معیاری عشق کی تلقین میں حقیقت پس پشت ہو جاتی ہے اور ایسے جذبات کا غلبہ ہوتا ہے جو واقعیت سے الگ ہوتے ہیں۔ عہد ماضی میں شعراء مثالیت پسندی سے متاثر ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں کا بھی شمار معائب میں کرنے لگے تھے۔ ہر عاشق کو مجنوں و فرہاد کے افسانوی عشق کی کسوٹی پر کسنا چاہتے تھے۔ لیکن عہد جدید میں نفسیاتی اور حقیقی رنگ غالب رہتا ہے۔

میر و سودا کے زمانے میں داخلی پہلو غزل کی جان سمجھا جاتا تھا مگر دور متوسط میں ایک ایسا بھی زمانہ گزرا ہے کہ جس میں خارجی پہلو کو زیادہ جگہ مل گئی تھی غزل اب ظاہری خد و خال کو اوّل تو سطحی چیز سمجھ کر اپنے یہاں جگہ ہی نہیں دیتی اور اگر کبھی دیتی بھی ہے تو محض تعریف کر کے چپ نہیں ہو جاتی بلکہ ان کے دیکھنے سے جو کیفیات دل پر گذرتی ہیں ان کو مزے لے لے کر بیان کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

ایک دوسری خصوصیت بھی آج کل کی غزل میں خاص طور پر نظر آتی ہے اب سے پہلے کم شعراء کا کلام ایسا ملے گا جو شروع سے آخر تک ہموار ہو آج کل کے ممتاز شعراء اس کا زیادہ خیال رکھنے لگے ہیں۔ ہم یہ تو کہنے کو تیار نہیں کہ موجودہ غزلوں میں ناہمواری بالکل نہیں ہے۔ مگر اس سے کافی تسکین ہو جاتی ہے کہ ایک بڑی حد تک لوگوں کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔

یہ سب تو ہوا مگر قدما کے کلام کی سادگی۔ بھولا پن معصومیت اور خالص تغزل کے تیز اثر کو نگاہیں موجودہ غزلوں میں ڈھونڈھتی ہیں لیکن مایوس ہو کر واپس آتی ہیں تکلف اور خوشگوار آورد کی جھلک بڑھتی جا رہی ہے۔ سہل ممتنع کی مثالیں بہت کم ہوتی جا رہی ہیں فارسی اور عربی کی نئی ترکیبوں کی تلاش و استعمال میں لوگوں سے کبھی کبھی لغزش ہو جاتی ہے اور قدم ڈگمگا کر راہ راست سے الگ پڑ جاتا ہے۔

دور حاضر میں غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ حسن و عشق کے تعلقات کو ذرا دور سے دیکھا جا رہا ہے۔ سینماؤں یا افسانوں میں یا درس گاہوں میں سرراہے

گا ہے اور یہ دیکھا بھی تفریحی پہلو پر مبنی ہوتا ہے بہت کم سپردگی و ربودگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہیں چنانچہ بجز چند شعرا کے زیادہ تر لوگوں کی غزلوں میں جو عاشقانہ اشعار ہوتے ہیں ان میں بھی انہماک وگمشدگی کم ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کو قریب سے نہیں دیکھا گیا۔ عشق میں مٹ جانے کی صلاحیت بہت کم غزل گو شعرا میں نظر آتی ہے۔ یا تو رسمی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں یا ان کا عشق سرسری مشاہدہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ذاتی تجربات اور ان میں عمق کی کمی درد و شدت کو اشعار میں زیادہ نہیں ابھرنے دیتی۔

ان باتوں کا جواب اس راز میں مضمر ہے کہ غزل اور عشق کا نظریہ موجودہ دور میں وہ نہیں رہا جو اس سے پہلے تھا۔ اب غزل میں تنقید حیات اور دیگر مضامین کو کافی جگہ دینے کا خیال رہتا ہے محض حسن و عشق کی داستان تک محدود کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عشق کو مثالی درجہ پر رکھ کر نصب العین قرار دینا بھی ضروری نہیں خیال کیا جاتا محبت کا روحانی پہلو جنسی خواہشات میں تبدیل ہو چلا ہے۔ یہ مطمح نظر ایسا ہے کہ انہماک و سپردگی کو خود کم کر دیتا ہے۔ بقول فراق

بدلتی جا رہی ہیں بزم ناز کی روایتیں

نظموں کے دائرے کو وسیع ہوتے دیکھ کر موجودہ غزل گوئی نے بھی بعض بعض خواص جذب کرنے کی کوشش کی جس کا اثر کچھ اچھا نہیں پڑ رہا ہے۔ اشعار میں مضامین لانے کی فکر نے کسی قدر خشکی پیدا کر دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مضامین کو پوری طرح واضح کرنے میں ایک ایسا تسلسل

پیدا ہو گیا کہ یہ غزلیں نہ نظم رہتی ہیں اور نہ غزل ہی کے صحیح مفہوم کو پورا کرتی ہیں۔

بلندی تخئیل کی فکر کہئے یا معاشی زندگی کی ابتری سے انتشار کا نتیجہ سمجھئے کہ موجودہ غزلوں میں ایسا مجموعہ بھی ہے جس میں غیر عاشقانہ اشعار کی بھرمار ہے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نظم یا رباعی یا قطعہ میں سے نکال لئے گئے ہیں اور اپنی ساخت کی وجہ سے چند عاشقانہ اشعار کی آمیزش سے ان کے مجموعہ کو بھی غزل کہا جا رہا ہے۔

موجودہ غزل میں ایسے مضامین کافی آنے لگے ہیں جن میں سائنس کے ان پہلوؤں پر توجہ کی گئی ہے جو تخلیق عالم یا جذبات کی طرف اشارہ کرتے رہتے ہیں۔ جو ہمارے نیم شعوری احساسات کی لہروں کے حرکات و سکنات کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔ نفسیاتی تحلیل اور اس کے اثرات کا نتیجہ اردو غزلوں میں کچھ کم جگہ نہیں پا رہا ہے۔ نظموں کی طرح یہاں بھی اجرام فلکی اور خوش گوار یا ناخوش گوار مناظر قدرت کو بڑی خوبی کے ساتھ حقیقی و جذباتی رنگ دے کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ جملہ خصوصیات ہمارے نزدیک غزل کی دنیا میں معنوی حیثیت سے ایک خاص اضافہ ہیں جن کا وجود غزل کی تجدید و بقا کا ضامن ہو سکتا ہے۔ ان خصوصیات کی وضاحت کے لئے فراق کی غزل ملاحظہ ہو جو ۱۹۴۱ء میں کہی گئی ہے ؎

حیات بھی نہ ہو معراجِ آسمان و زمیں
مراد جو دبھی میرا وجود ہے کہ نہیں

ہر انقلاب کے بعد آدمی سمجھتا ہے
کہ اس کے بعد نہ پھر لے گی کروٹیں زمیں

یہ اہلِ رتبہ میں مائل یہ پستیٔ معکوس — اچھالتے ہیں زمانے کو چند خاک نشیں
نہ پوچھ کس سے ہے اب سامنا محبت کا — بغل میں قلب حزیں ہے نہ شاہدِ رنگیں
عمل تو وہ جو قضا و قدر کو بس میں کرے — دعا تو وہ ہے کہ تقدیر بھی کہے آمیں
بلندیوں سے جو دیکھے تو ہو تجھے معلوم — کہ یہ زمیں بھی چمکتا ستارہ ہے کہ نہیں
نہ پوچھ عشق کی مجبوریاں کہاں تک ہیں — ازل کے دن سے تو آزادیاں ہیں زیرِ نگیں
الگ نہیں مری دنیا، خبر ہے گو مجھ کو — زمانہ اور بھلے آدمی کا ساتھ نہیں
جھپک جھپک سی گئی ہے بہارِ لالہ و گل — مری نگاہ سے چنگاریاں سی کچھ جو اڑیں
کچھ اور حسرتِ پس ماندگاں نہ بڑھ جائے — جرس کی بانگ ہی کھوٹی کرے نہ راہ کہیں
مزاجِ عشق کو لازم ہے اب بدل جانا — کہ کچھ دنوں سے تو سنتے ہیں حسن بھی ہے غمیں
چہ خوش بود چوں برآید بیک کرشمہ دو کار — بس اک نگاہ سے کر دے جہاں کو شاد و غمیں
نگاہِ شاہدِ مستی کی نیتیں ہیں کچھ اور — یہ رنگ ہو تو کوئی کیا ہو شاد یا غمگیں

تھی شہر شہر زمانے میں جن کی رسوائی
فراقؔ سچے وہی ناموسِ زندگی کے امیں

آزاد نظم

اس باب کے ختم ہونے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے رجحانات کا بھی تذکرہ کر دیا جائے جو حقیقت میں ابھی قبولِ عام کا شرف تو نہیں حاصل کر سکے مگر ایک محدود مخصوص دائرے میں اپنا کام اس انداز سے کر رہے ہیں کہ عجب نہیں کہ دائرے کی حدیں شکست ہو جائیں اور وہ ہمہ گیری اختیار کر لیں۔ آثار ایسے نظر آرہے ہیں کہ عمومیت للچائی نگاہوں سے ان کو دیکھ رہی ہے اور رجحانات بھی رفتہ رفتہ اس کی

طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہماری مراد آزاد نظم[1] سے ہے۔

یورپ اور امریکہ میں جنگِ عظیم کے بعد سے آزاد نظم کو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ اس صنفِ شعر کی کوئی قطعی تعریف ابھی تک معین نہیں ہوئی روایتی قافیہ، بحر اور وضع کو ترک کر کے اس میں صرف "آہنگ" (CADENCE) کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

آزاد نظم کی بنیاد اس نظریہ پر قائم ہے کہ شعر کا دارو مدار مضمون پر ہے اس کی وضع پر نہیں اسے دراصل نظم اور نثر کی درمیانی کڑی سمجھنا چاہئیے؟ جدید اردو ادب میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ مغرب کا اثر سے کہ ہمارے بعض شعرا مثلاً اکبر، اسمعیل، شرر، وغیرہ نے بغیر قافیہ و ردیف کے چند نظمیں ایسی کہیں جو اردو کے لئے نئی تھیں لیکن ان نظموں کی تعداد بہت کم تھی۔ کہنے والے بھی زیادہ نہ پیدا ہو سکے۔ غالباً مذاقِ عام نے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ اس وقت صورت دوسری ہے مذاقِ نو فرسودگی سے الگ رہنے کے لئے نت نئے راستے اختیار کر رہا ہے اور طرزِ بیاں و نفسِ مضمون کی اتنی نئی صورتیں پیدا کر چکا ہے کہ قافیہ و ردیف کو ترک کرنے سے بھی اس کا منشا پورا نہیں ہوتا، وزن میں بھی جدت پسندی سے کام لینا چاہتا ہے ایک ایسا طبقہ ہمارے نئے شعرا میں پیدا ہو گیا ہے جو کہتا ہے کہ ہمارے طرزِ تخیل کی ترجمانی مروجہ شاعری کی کسی شکل سے نہیں ہو سکتی، کچھ ایسے خیالات ذہن میں آتے رہتے ہیں جن کو واضح کرنے کے لئے قافیہ، ردیف، وزن سب کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے برابر کے مصرعوں میں مفہوم و خیالات کی ارتقائی رفتار

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا بحوالہ "ساقی" جنوری ۱۹۴۳ء

اچھی طرح ظاہر نہیں ہوتی۔ یہ طبقہ قافیہ و ردیف سے الگ ہو کر مصرعے بھی چھوٹے بڑے رکھنا چاہتا ہے۔

آزاد نظم کے سلسلے میں اب تک جتنی چیزیں دیکھی گئی ہیں ان میں مشکل سے ابھی کوئی ایسی نظم ہو گی جو ایسے خیالات کی حامل ہو جو مروجہ شاعری میں نہ آ سکتے ہوں، رہا خیالات کی ارتقائی پیداوار کا مصرعوں کی ساخت سے نمایاں ہونا اس قسم کی نظم کے رواج کا ایک حد تک جواز ہو سکتا ہے یعنی ذہن میں جس رفتار و ترتیب کے ساتھ خیالات آتے جاتے ہیں ان کو بعینہٖ اسی طرح سے نظم کرنا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ شعور نے تخئیل کی دنیا میں کس وقت اور کس طرح احساسات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور کیسے غور و فکر کی منزلوں سے آگے بڑھا ہے۔

آزاد نظم کی زیادہ اہمیت نفسیاتی ہے فنی لحاظ سے ابھی تک اجنبی معلوم ہوتی ہے قافیہ و ردیف کا فقدان اور مصرعوں کی غیر یکسانیت کی وجہ سے ترنم کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے اس لئے کہ رنگینی و موسیقی سے شاعری کو ایک فطری لگاؤ ہے قافیہ و ردیف شاعری کے لئے ضروری نہ سہی لیکن ان کی وجہ سے جو آوازیں اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے وہ کسی اور طرح مشکل سے ہو سکتا ہے اور پھر مصرعوں کے قد و قامت کا اختلاف موسیقی میں بھی کمی کا باعث معلوم ہوتا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنا بڑے فنکار اور ذہین آدمی کا کام ہے طرز بیان و نفس مضمون دونوں کو اتنا حسین بنانا ہے کہ قافیہ و ردیف کا عدم التزام اور آزاد نظم کی اجنبیت مذاق سلیم پر بار گراں کیا بار بھی نہ ہونے

پائے بلکہ قبولِ عام لبیک کہے اور تخئیل و ذہن قافیہ ردیف کی جکڑ بند سے آزادی محسوس کریں۔

آزاد نظم کے سلسلہ میں اس وقت تک جو کچھ کہا گیا ہے یا کہا جا رہا ہے اس کو مجموعی حیثیت سے اول درجہ کی چیز نہیں کہہ سکتے لیکن عموماً شگفتگی و رنگینی کی کمی بھی نہیں ہوتی۔ اس وقت کے مشہور کہنے والوں میں میراجی۔ ن۔م۔ راشد، سردار علی جعفری، فیض، اختر الایمان وغیرہ ہیں۔ میراجی نے اس طرف خاص توجہ کی ہے۔ ان کو دلچسپی و حسن کاری کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ ہندی الفاظ و بحروں سے ان کو خاص مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تحت الشعور کی رنگینوں میں اس قدر گم ہو جاتے ہیں کہ آسانی سے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں — ن۔م۔ راشد کی نظموں کا مجموعہ بھی 'ماورا' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ راشد اپنی نظموں میں عموماً ایک ایسے تھکے ماندے انسان کا تصور پیش کرتے ہیں جو جنسی دباؤ سے مغلوب ہو، جس کے ذہن پر تہذیب و تمدن کی الجھنوں کا اثر حد سے زیادہ ہوا ہو، جو کسی بات سے جی بھر کے لطف اندوز نہ ہو سکتا ہو۔ ہم یہاں ان کی ایک نظم "اجنبی عورت" نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے ایک مغربی خاتون کے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔

اجنبی عورت

ایشیا کے دور افتادہ شبستانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی رومان نہیں
کاش اک دیوارِ ظلم
میرے ان کے درمیان حائل نہ ہو
یہ عماراتِ قدیم
یہ خیاباں یہ چمن، یہ لالہ زار
چاندنی میں نوحہ خواں

اجنبی کے دستِ غارت گر سے ہیں
زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی رومان نہیں
کاشش اک "دیوارِ رنگ"
میرے ان کے درمیان حائل نہ ہو!
یہ سیہ پیکر برہنہ راہرو
یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہر خند

یہ گزرگاہوں پہ دیو آسا جواں
جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل بیباک مزدوروں کا سیلاب عظیم!
ارضِ مشرق! ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے
ان کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں

دیہاتی نظمیں

حال ہی میں ترقی پسند طبقہ کو شدت کے ساتھ یہ خیال ہوا ہے کہ عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی اچھی طرح اسی وقت ہو سکتی ہے کہ جب ان کے درمیان میں رہنا بھی ممکن ہو۔ تہہ در تہہ خیالات و محسوسات کا پتہ ان میں گھل مل کر زیادہ چل سکتا ہے۔ چنانچہ مختصر افسانہ میں اب اکثر ایسے قصّے آنے لگے ہیں جو ذاتی تجربات و دیہاتی زندگی سے ہم آہنگ ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ایسے افسانے زیادہ فطری اور دیہاتی زندگی کے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ نظم میں بھی اس خصوصیت کو لانے

کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور بعض بعض شعرا اس پر بھی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ ایک دیہاتی کے جذبات کی ترجمانی کے لئے دیہاتی لب و لہجہ، الفاظ، تلفظ بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے چند لکھنے والوں میں مطلبی اور وامق کا کارنامہ سب سے بلند اور نمایاں ہے وہ کوشش کرتے ہیں کہ شعر کو سادگی کے ساتھ دیہاتیوں کے الفاظ و لہجہ میں نظم کریں۔ اس کی وجہ سے تازگی و ندرت ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں لیکن ابھی نامانوس الفاظ و محاورات کے سبب سے روانی میں کمی محسوس ہوتی ہے۔

ادب کو کامیاب بنانے کے لئے جو رویہ مطلبی نے اختیار کیا ہے وہ بڑی دور اندیشی پر مبنی ہے۔ بقول ساغر صاحب[1] "یہی اصل میں شاعری ہے زبان گنوار سہی لیکن موضوع کے جن تعلقات اور جزئیات کو مطلبی نے کمال حسن و کامیابی سے نظم کیا ہے وہ آج سے پچاس برس بعد جب ہندوستان کا نصیب چمکے گا پڑھنے والوں کے خیال میں آج کے ہندوستانی گاؤں کی تصویر کھینچ دیں گے۔" ہمارے نزدیک اپنا پیام عوام تک پہنچانے کے لئے زبان میں تھوڑی سی تبدیلی گوارا کرنا قومی تعمیر کے لئے ضروری ہے تاکہ ادب کو عوام سے اور عوام کو ادب سے قریب تر ہونے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں مطلبی کی نظمیں اکثر رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں مگر پھر بھی ایک نظم کے چند اشعار یہاں پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

[1] ایشیا، جنوری فروری مارچ ۱۹۴۹ء

پنہاری

پنگھٹ کو پنہاری چالی[1] ۔۔۔ باندھے پیلی ساری جالی
سر پہ کلسہ، کلسے پہ گاگر ۔۔۔ ہاتھ میں تیجو[2] مونجھ کی بھابر
کالی انڈوئی[3] میں کوڑی چمکیں ۔۔۔ ناگن کی جوں بندکی دمکیں

. . . .

پانی لے کر گھر کو چالی ۔۔۔ ڈرڈر یگ دھرتی متوالی
من ہی من میں کہتی پہنچی ۔۔۔ گھرکی جاکر سنکل کھولی
برتن مانجھے چوکا کیتا ۔۔۔ گھی آٹا مٹکی سے لینا
دال پکائی ساگ بنایا ۔۔۔ گھی ہلکا روٹی پہ لگایا
اک ڈلیا میں روٹی راکھی ۔۔۔ پیاز کا گنٹھا بیتوں بھاجی

. . . .

گاؤں سے رکھیایوں چلی ۔۔۔ جیسے بنی ہو کجلی بن کی
ادھر ادھر نیل سی پہاڑی ۔۔۔ بیچ بیں پیڑوں کی ہریالی

ہم اس سے بے خبر نہیں کہ مطلبی کا یہ کارنامہ دنیائے اردو میں نقش اول نہیں اس لئے کہ اب سے بہت پہلے یعنی ۱۸۵۰ء میں ایک بزرگ نے بہادر شاہ ظفر کے سامنے اسی قسم کا کلام پیش کیا تھا ان کا نام منور خاں اور تخلص دلگیر تھا میرٹھ کے رئیس تھے ظفر نے خلعت و انعام سے انھیں سرفراز فرمایا۔ مگر یہ کلام کوئی خاص رجحان یا اہمیت نہ حاصل کر سکا

---

[1] چلی [2] مونجھ کی رسی [3] جو سر پر رکھتے ہیں اور اس پر مٹکا وغیرہ رکھتے ہیں [4] کیا

اور اب اتنی مدت گزر چکی ہے کہ خاص خاص لوگ بھی اس کلام کو بھول چکے۔ ایسی صورت میں مطلبی کی اس کاوش کو جدت سے تعبیر کرنا بیجا نہ ہو گا۔

موجودہ اردو شاعری کا یہ مختصر جائزہ ہمیں شعر و ادب کی ایک نئی دنیا میں ضرور پہنچاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم کہیں کہیں اسیں قدما کی شان اور عظمت، ان کی دور رسی، ان کا علم نہ پائیں لیکن جس دور کی ترجمانی موجودہ شاعری کر رہی ہے اس کے تمام علمی اور عملی رجحانات کو اردو نے اپنے دامن میں جگہ دے دی ہے گویا اردو زبان زندگی کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے، زندگی کی ترجمان بھی ہے اور ناقد بھی اس لئے اس کے مٹنے کا ڈر نہیں۔ اس کا مستقبل وقت کے ساتھ شکلیں بدلتا رہے گا لیکن اس کے ختم ہونے کا خوف نہیں ہے کیونکہ اس کی جڑیں زندگی میں پیوست ہیں اور شاعری حسن تجربات کی بنیاد پر قائم ہے ان کا ادراک نئے علوم و فنون کی روشنی میں بڑھتا جا رہا ہے۔

سیاسی و ذہنی انقلاب سے جو ایک نئی ذہنیت اور معاشرت پیدا ہو رہی ہے موجودہ شاعری اس کی آئینہ دار ہے، نئے خیالات کا دھارا اتنی تیزی سے بہہ رہا ہے کہ اس کے روکنے کے لئے کوئی باندھ نہیں باندھا جا سکتا۔ ہماری شاعری میں آفاقیت و عمومیت کا جو عنصر پیدا ہو رہا ہے وہ زبان کو آگے بڑھانے کے لئے کافی امید افزا ہے۔

عہدِ قدیم کے رجحانات

نثرِ جدید کے رجحانات پیش کرنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پہلے کے رجحانات بھی مختصراً بیان کر دیئے جائیں تاکہ موجودہ دور کی ترقی کا اندازہ پورے طور پر ہو سکے۔

شعر و شاعری کے غلبہ نے عرصہ تک کسی کو نثر کی جانب خاص توجہ نہ کرنے دی۔ جنوبی ہند کو تو پھر بھی کچھ پہلے احساس ہوا شمالی ہند نے ایک مدت کے بعد نثر کی خبر لی لیکن جنوب ہو یا شمال دونوں جگہ غالباً اس وقت تک نثر کی طرف توجہ نہیں کی گئی جب تک ضروریات نے مجبور نہیں کر دیا۔ مذہبی جذبات عام کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا تدبیر ہو سکتی تھی کہ مقامی زبان میں فارسی و عربی کے الفاظ ملا کر لوگوں تک پیامِ اسلام پہنچایا جائے۔ صوفیوں عالموں اور درویشوں نے یہی کیا اور مذہب کی اشاعت میں خود بخود نثر کی بھی اشاعت ہوتی رہی۔

جنوبی ہند میں بھی پہلے پہل اردو نثر نویسی کا رجحان مذہبی تھا۔ اس کی طرف توجہ کرنے والوں کی فہرست میں زیادہ تر بزرگان دین کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں چنانچہ شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز گیسودراز، میراں جی شاہ شمس العشاق، اردو نثر نویسی کی ابتدا کرنے والوں میں تاریخی اہمیت رکھتے ہیں اس دور میں جتنی کتابیں لکھی گئیں ان کا زیادہ تر موضوع مذہبی تھا۔ مختلف پیرایہ سے اسلام کے اصول دین، فروع دین، اخلاق، مساوات، روحانیت کی ترویج کی جا رہی تھی۔ تصوف کا اثر تیز تھا۔ غالباً اس وجہ سے کہ یہ مسلک ایسا ہے جو دوسرے عنوان کے مقابلہ میں زیادہ دنیا پر اپنا اثر ڈال سکتا ہے۔ اور دنیا کے مختلف مذاہب اس آئینہ میں ایک دوسرے کے قریب نظر آتے ہیں۔ بہرحال مذہب کی وجہ سے نہ صرف اردو نثر کی اشاعت میں کافی مدد ملی بلکہ الفاظ و رمزیات کا بڑا زبردست ذخیرہ ادب میں آگیا۔

قصے کہانیوں کی کتابیں جو لکھی گئیں وہ زیادہ تر فارسی کتابوں کا ترجمہ تھیں۔ افسانے عام طور سے مافوق الفطرت عادات وکردار پر مبنی ہیں۔ اخلاق و مذہب کا خیال زیادہ رکھا گیا ہے۔ حسن و عشق کی داستانوں سے بزم آرائی کی گئی ہے۔ فارسی ادب کے دلکش و پُر اثر قصوں کو اردو کے قالب میں ڈھالنا بھی کوئی کم مفید کام نہ تھا اتنی کم عمر میں اردو نثر کا فارسی عبارت آرائی و پختگی و نصب العین سے روشناس ہو جانے کے یہ معنی تھے کہ خود اردو کا معیار دفعتاً فصاحت و سلاست و معنویت کے

لحاظ سے بلند ہوگیا۔ ورنہ بعد کی نسلوں کو زبان کے صاف کرنے میں اتنی جلدی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ طرز تحریر کے لحاظ سے اس وقت کی اردو نثر کا رجحان رنگین وشاعرانہ ہے۔ عبارت عموماً مقفیٰ ومسجع۔ و پیرایہ بیان رنگین و عاشقانہ اور تشبیہہ واستعارے کا تصرف زیادہ ہے۔

شمالی ہند میں بھی اردو نثر کا یہی رنگ ہے۔ چنانچہ اب تک جو سب سے پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے یعنی فضلی کی دہ مجلس (کربل کتھا) وہ بھی شاعرانہ ذہنیت کی جھلک لئے ہوئے ہے۔ وزن اور کہیں کہیں قافیہ ورد یف بھی مل جاتے ہیں نمونہ ملاحظہ ہو۔ [ا]

"اس رات واقعہ (خواب) میں دیکھتا ہوں گویا کہ ایک طرف بمع اخوان ذی شان و دوستان بہتر از جان سیر کو جاتا۔ اثنائے راہ کے ایک شخص اجنبی نے کہا کہ اول روضۂ مقدس حسنین علیہما السلام کی زیارت کر جا۔ میں بخواہش اتم اور بخوشی اکم اس روضۂ منور میں گیا۔ دیکھتا ہوں کہ عمارت باہدایت اس مکان لطیف کی بعینہ مانند عمارت حضرت قدم شریف کے ہے۔ اور متصل دیوار کے دو قبریں نہایت ملی ہوئی باہم جوں قافیہ ورد یف ہیں۔ ایک بالشت بھر سرہانے کی طرف سبز ہے اور ایک اسی دستور سرخ۔ میں نے بادب تمام اور باصدق تام فاتحہ پڑھ سرہانے کی طرف بیٹھ مناقب شروع کیا۔ جوں مجھے وہ معراج بلند حاصل ہوا وہیں میرے فلک چشماں سے رونا نازل ہوا۔ یکایک اس مرقد دل سے دو دستہ نرگس کے نہایت تر و تازہ نکلے۔ تب میں نے

[ا] تذکرہ فیلن بحوالہ تاریخ نثر اردو مرتبہ پروفیسر احسن مارہروی۔

یہ دعا مانگی کہ یا امامین علیہما السلام ایک دستہ اور عنایت ہوئے کہ میرا
صدق دل مجھ پر ثابت ہوئے کیونکہ میں پنجتن کا خادم ہوں معاً مانگنے
اس دعا کے ایک دستہ اور تر و تازہ نکلا حاصل الامر میں تا شام اسی
درگاہ ملک بارگاہ میں رہا۔ اور دل میں کہا کہ فضلی تو ایسی جناب مستطاب
اور ملجا و مآب عالم دعا لمیان سے کہاں جاتا ہے اور پھیر (پھرا)
اپنے تئیں چاہ میں پھنساتا ہے۔ یہیں رہ اور مت جا۔"

یہ کتاب ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی تھی اس کے کافی بعد غالباً ۱۱۸۰ھ میں جو
عبارت مرزا سودا کے یہاں ملتی ہے اس میں بھی پیرایۂ بیان کم و بیش وہی
ہے جو اس سے پہلے تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رجحان سادگی کی طرف
نہیں بلکہ رنگینی و قافیہ پیمائی کی طرف زیادہ بڑھ رہا ہے فضلی کے یہاں
روانی سودا سے کہیں زیادہ ملتی ہے" دہ مجلس" کی عبارت کا نمونہ آپ دیکھ
ہی چکے اب سودا کی بھی نثر دیکھ لیجئے۔

"مضمون سینے میں بیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو بیچ قفس کے جس وقت
زبان پہ آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوش دادرس کے۔ غرض جس اہل
سخن کا درمنصفی زینت لب ہے، مررشتہ حسن معانی کا اس
کلام کے اس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ
سفید کی مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان
کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے۔ چاہیے کہ دیکھ کر
نکتہ چینی کرے، ورنہ گزند زہر آلود سے بے اجل کاہے کو

---

[۱] تاریخ نثر اردو ص۲۷ مرتبہ پروفیسر احسن مارہروی۔

مرے۔ ہر چند کلام استادان سلف پر بھی غلطی کا گمان ہے کس واسطے
کہ انسان مرکب الخطا والنسیان ہے"
طرز بیان کی رنگینی عرصہ تک جنت نگاہ و فردوس گوش بنی رہی رجب
علی بیگ سرور اس فن کے خاتم النبئین مانے گئے غور کرنے سے معلوم
ہوتا ہے کہ شاعری و ترنم کا اتنا غلبہ ہوگیا تھا کہ بغیر اس کی چاشنی کے نثر کا کامیاب
ہونا دشوار تھا۔ لہٰذا یہ روش برابر قائم رہی۔ موسیقی و رنگینی بڑے کام کی چیز
ہو سکتی تھی۔ کاش لکھنے والے اس کا خیال رکھتے کہ اس رنگ میں جتنی شاعری
کی زبان کامیاب ہے اتنا ہی نثر میں جذبات نگاری اور ماحول کے لحاظ سے
الفاظ لائے جائیں۔ تصویر کا صرف ایک ہی رخ پسند کیا گیا۔ جذبات میں تاثیر
کو کامیاب بنانے کی طرف توجہ نہ گئی۔ صرف الفاظ و قافیہ، وزن پر تمام تر زور
رہا، ہماری اس وقت کی شاعری میں کم از کم غم کے جذبات ضرور کامیاب ہوئے
تھے۔ نثر والے رنگینی بیان میں یہ خصوصیت بھی نہ پیدا کر سکے۔ دو چار کتابیں
جو کچھ بھی ہیں وہ یا تو سب کی سب مذہبی مسائل و امور پر مبنی ہیں یا اس کا اثر
لئے ہوئے ہیں۔ بہرحال شمالی ہند میں بھی مذہب نے اردو سے امداد چاہی۔
بلاشک و شبہہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کاوشیں اردو کی خدمت کے لئے نہ تھیں
لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اس روِیہ سے
اردو کی اشاعت کافی ہوئی سنہ ۱۷۹۰ء / ۱۲۰۵ھ میں شاہ عبدالقادر نے قرآن کا ترجمہ
اردو میں کیا۔ اور ان کے بعد انھیں کے خاندان کے ایک فرد مولوی اسمٰعیل شہید

نے ایک رسالہ "تقویت الایمان" تصنیف کیا۔ قرآن مجید کے ترجمہ کے دیباچہ کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"الٰہی شکر تیرے احسان کا ادا کروں کس زبان سے کہ ہماری زبان کو گویائی اپنے نام کر اور دل کو روشنی دی اپنے کلام کر اور اُمت میں کیا اپنے رسول مقبول کی جو اشرف الانبیا اور نبی الرحمت جس کی شفاعت سے امید دار ہیں ہم کہ پاویں دو جہاں کی نعمت۔"

"تقویت الایمان" کی عبارت کا نمونہ بھی دیکھ لیجئے۔

"ہر خاص و عام کو چاہئے کہ اللہ اور رسول ہی کے کلام کو تحقیق کریں اور اسی کو سمجھیں اور اسی پر چلیں اور اسی کے موافق اپنے ایمان کو ٹھیک کریں۔ سو سننا چاہیے کہ ایمان کے دو جزو ہیں۔ خدا کو خدا جاننا اور رسول کو رسول سمجھنا اور خدا کو خدا سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا شریک کسی کو نہ سمجھے اور رسول کو رسول سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی راہ نہ پکڑے۔ اور پہلی بات کو توحید کہتے ہیں اور اس کے خلاف کو شرک۔ اور دوسری بات کو اتباع سنت کہتے ہیں۔ اور اس کے خلاف کو بدعت۔"[1]

نثر نویسی کے رجحان میں فورٹ ولیم کالج نے کافی تبدیلی پیدا کر دی۔ اب تک گو نثر کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی تھی تفریحی یا تبلیغی مشاغل نے یہاں تک پہنچایا تھا اس غریب کو کار آمد موضوعات اور ادبیت سے سرفراز کرنے کی بہت کم فکر کی گئی ہے لیکن جس میں جوہر قابل ہوتا ہے وہ اپنی اہمیت

---

[1] سبد المصنفین حصہ اول ص ۱۰۹

کبھی نہ کبھی زمانے سے تسلیم کرا ہی لیتا ہے۔ آخر وقت آگیا کہ سلطنت کو اردو کی امداد کی ضرورت پڑی اور یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس زبان کی سرپرستی کرکے حکام سرکاری کو اردو سے مانوس کر دیا جائے۔ اگر ممکن ہو تو کوشش کی جائے کہ ہر شخص اس کو سمجھے اور استعمال کرنے لگے۔ چنانچہ اس خیال کو پورا کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج مناسب سمجھا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں "فورٹ ولیم کالج کلکتہ" انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں اردو ادب کا مرکز قرار دیا گیا۔ اس کالج کے منتظم اعلا ڈاکٹر جان گل کرائسٹ تھے۔ انھوں نے اردو کی ترقی کے لئے ان تھک کوشش کی ملک کے بہترین انشا پردازوں کو اکٹھا کرکے ایسی کتابیں لکھوائیں جو عام فہم اور دلچسپ ہوں۔ رنگین عبارت اور مقفٰی تحریر سے یک قلم گریز کیا۔ بلکہ سلیس اور رواں عبارت پر زور دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو نثر بہت جلد عام فہم و دلکش نظر آنے لگی۔ تھوڑے ہی دن میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار پائی اس زمانہ کی چند خاص ہستیاں یہ ہیں۔ میر امن، شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، حیدر بخش حیدری، میر کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، مظہر علی خاں ولا، حفیظ الدین احمد، للو لال جی، بینی نرائن مرزا علی لطف۔[1]

اس زمانے سے رفتہ رفتہ طرز تحریر میں سادگی آنے لگی۔ دہلی نے کسی قدر جلد اور لکھنو نے ذرا دیر میں یہ روش قبول کی۔ اس کالج میں بھی

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۴۴

قصہ کہانی کی کتابیں زیادہ لکھی گئیں مگر کبھی کبھی دوسرے موضوع پر بھی کچھ نہ کچھ لکھ دیا گیا۔ اخلاق، مواعظ، تاریخ، سوانح عمری، لغت، علم اللسان پر بھی توجہ کی گئی کالبداس کے ایک سنسکرت ڈرامے کا ترجمہ ہندی سے اردو میں کاظم علی جوانؔ نے کیا۔ اصل زبان سے فرخ سیر (۱۱۲۴ھ سے ۱۱۳۱ھ ہجری) کے زمانہ میں نوازؔ نے شکنتلا سے ترجمہ یا اس سے اخذ کرکے ڈراما ترتیب دیا تھا۔

اس زمانے سے اردو نثر نے اپنا رجحان قصہ کہانیوں سے ذرا الگ کرنا شروع کر دیا۔ کالج کے باہر بھی لوگوں سے قواعد، تذکرے، علوم و فنون، تاریخ و جغرافیہ اور دوسرے مضامین پر کتابیں لکھوائیں یا ترجمے کرائے۔ "دہلی کالج سوسائٹی" نے خاص طور سے ایسے موضوعات پر توجہ کی یہ سوسائٹی ۱۸۴۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ انگریزی سے اردو میں بہت سی کتابیں اس کے زیر اہتمام ترجمہ ہوئیں۔

اب اردو نثر کا احاطہ وسیع ہونے لگا۔ قرآن مجید اور انجیل کے ترجمے تفاسیر، عدالتی کارروائیوں کی خاص عبارت بھی اس کے دائرے میں آ گئیں۔ ترجمے کی زبان ابتدا میں، گلابی اردو کی سی تھی مگر رفتہ رفتہ سادگی کی طرف مائل ہو گئی۔

بہرحال فورٹ ولیم کالج کے اثر سے نثر نگاری کے اسلوب میں کافی تبدیلی ہوئی۔ اسی زمانہ میں اردو نے مغرب کے اصول پر اعراب قبول کئے یعنی سوالیہ نشان، واوین، قوسین وغیرہ عبارت میں کافی جگہ پانے لگے۔

پیراگراف کی تقسیم پر بھی توجہ ہونے لگی۔ طرزِ تحریر میں بھی جملوں کی ساخت مشرقی انداز سے زیادہ مغربی انداز میں ہونے لگی۔ رنگین و مقفیٰ طرزِ تحریر کے بجائے سادگی و روانی عبارت میں آنے لگی جس کے مظاہرے کالج کے باہر بھی ہوئے۔ انشا نے اپنی انتہا پسند طبیعت سے مجبور ہو کر ارادہ کرلیا کہ ایک کتاب ایسی لکھ دی جائے جس میں بجز اردو کے اور کسی دوسری زبان کے لفظ نہ ہوں۔ یا دوسرے الفاظ میں جس کی عبارت تمام تر خالص اردو ہو۔ یہ کتاب اب چھپ بھی گئی ہے لیکن پھر بھی چند سطریں نمونے کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی ایسی کہانی کہیے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے تب جاکے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ میں نہ ہوں۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پرانے بوڑھے گھاگ یہ کھڑاگ لائے۔ سر ہلا کر منہ تھتھا کر ناک بھوں چڑھا کر گلا پھلا کر لال لال آنکھیں پھرا کر کہنے لگے یہ بات ہوتی نہیں دکھائی دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھس جائے۔ .... میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا۔ میں کچھ ایسا انوکھا بڑ بولا نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی باتیں کئے جاؤں مجھ سے

نہ ہوسکتا تو بھلا منہ سے کیوں نکالتا جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے
کو ٹالتا" اس کتاب کا نام رانی کیتکی کی کہانی ہے

اردو نثرنویسی کے لئے سرسیّد مرحوم کا زمانہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔
زبان اور رجحان کے لحاظ سے اس دور کو ہم جدید و قدیم عہد کے درمیان
میں رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ سرسیّد نے جب لکھنا شروع کیا تو پہلے پہل عبارت
میں وہی قدیم انداز تھا۔ یعنی جملوں میں وزن، قافیہ، ردیف اور الفاظ کے
انتخاب میں دقت پسندی نمایاں ہے۔ اس دور کی ابتدا ۱۸۴۷ء سے ہوتی ہے
جب سرسیّد نے پہلی بار "آثار الصنادید" مرتب کی تھی۔ اس وقت اس کتاب
میں بھی کم و بیش وہی باتیں نظر آتی تھیں جو اور کتابوں میں ہیں مثلاً۔

"بہتر ہے کہ فکر مآل اندیش اس داعیہ کمال سے ہاتھ اٹھا کر اپنے انداز
سے باہر پاؤں نہ نکالے اور اس آب صنعت میں ہاتھ نہ ڈالے اس
واسطے خاک پائے اہل ہنر خوشہ چین معنی طرازان سخنوز امید وار
رحمت صمد سیّد احمد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دانایان اولی الابصار صاحب طبعان
روزگار کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ مدّت دراز سے یہ اندیشہ
دامن گیر تھا کہ اگر حیلہ گری زمانہ پر بہانہ سے اندک نجات حاصل
ہو جائے اور فلک ناتواں بین کے پنجہ سے کچھ مہلت ہاتھ آوے
تو ایک نسخۂ عجیب اور مجموعۂ غریب، خامۂ چابک رقم کی مدد اور فکر
آسمان سیر کی عنایت سے لکھا جائے"۔

اس وقت کے مشہور انشا، پروانہ دل ہیں رجب علی بیگ سرور،

ماسٹر رام چندر، مولوی کریم الدین دہلوی تھے۔ مگر اتنی تیزی سے اس دور کی طرز تحریر میں تبدیلی ہوئی ہے کہ اوروں کا ذکر کیا خود سرسید کی 'آثار الصنادید' کے دوسرے ایڈیشن میں کافی فرق ہو جاتا ہے۔ سرسید ایک دبستان کے بانی تھے اور غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو نثر میں علمی مضامین سادگی اور متانت کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ مسلمانوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ زبان کی بھی فکر کی ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاخلاق" انھیں کے دم سے قائم ہوا جس کا خاص مقصد یہ تھا کہ عقلیت کے ساتھ مذہب و تمدن وغیرہ پر روشنی ڈالی جائے اس رسالہ کا اثر اردو کے رجحانات تبدیل کرنے میں بڑے کام آیا۔ اس سے پہلے رنگین مقفیٰ اور مسجع عبارت پسند عام تھی۔ بیان میں مبالغہ اور رعایت لفظی کا غلبہ تھا جس میں علمی اور بلند خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا 'تہذیب الاخلاق' میں سرسید نے عالمانہ و حکیمانہ مسائل پر بحث کی تو فرسودہ مذاق کو بدل کر عبارت میں سادگی اور حقیقت کو جگہ ملنے لگی۔ ان کی دیکھا دیکھی صرف یہی نہیں ہوا کہ ان کے دوسرے رفقاء نے کار اس طرز کو اختیار کرتے گئے بلکہ وہ لوگ بھی جو 'تہذیب الاخلاق' کے مضامین پر اعتراض کرتے تھے غیر شعوری طور پر اسی طرز پر کاربند ہوئے۔ اس بحث و مباحثہ کا سلسلہ عرصہ دراز تک قائم رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اچھا خاصا ذخیرہ سلیس و رواں عبارت کا اکٹھا ہو گیا۔

سرسید پر اعتراض کرنے والے زیادہ تر مولویانہ ذہنیت کے لوگ تھے۔ جواب دینے میں ان کا انداز بیان تہذیب الاخلاق کے ردیہ پر کچھ اس طرح

آتا گیا کہ رفتہ رفتہ عبارت کی قدامت پسندی کم ہوگئی اتنی قدیم ذہنیت کے لوگوں کا طرز بدلنا ایک خداداد نعمت تھی ان کے توسل سے ان کے ماننے والے بھی اسی طرز کو پسند کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کا رجحان بہ لحاظ طرز بیان و تنوعِ مضامین بہت تھوڑی مدت میں راہ راست پر آگیا۔

تہذیب الاخلاق کے صرف مخالفین ہی سے اردو ادب کو فائدہ نہیں پہنچا بلکہ موافقین نے بھی مستقل کارآمد مضامین لکھ کر جو اردو کی خدمت کی ہے وہ اپنی جگہ پر خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی چراغ علی، محسن الملک، مشتاق حسین، وقارالملک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے اخلاقی، علمی، سیاسی، مذہبی، فلسفیانہ اور تاریخی مضامین لکھ کر اردو کو نہ صرف کارآمد موضوع بتا دیے بلکہ ان کو نباہ کر مختلف مسائل کے لئے الفاظ و اصطلاحات بھی حسب ضرورت مہیا کر دیے۔

اس عہد کی ایک زبردست چیز رہی جاتی ہے جس نے مستقبل کے رجحان تبدیل کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ گو اس کا وجود کسی ادبی نقطۂ نگاہ سے نہیں ہوا اور نہ اس کے کتابی شکل میں آنے سے پہلے زبان نے کوئی توقع رکھی تھی۔ لیکن اس کے شائع ہونے کے بعد اور بازار میں آتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ غالب نے اپنے خطوط کسی خاص غایت و غرض سے نہیں لکھے تھے اور نہ ان کے ایسے فارسی داں داد ق نویس سے کسی کو امید ہو سکتی تھی کہ اس قدر سہل و بے تکلف زبان استعمال کریگا کہ دنیا ہی بدل جائے گی۔ لیکن ایک باکمال شخص کی جدت پسندی و

دوراندیشی، فطرت شناسی کو سب سے پہلے پیش نظر رکھتی ہے جو فن کار کو مجبور کر دیتی ہے اور ہمیشہ کے لئے ایسی کوئی چیز اس سے پیدا کرا دیتی ہے کہ یادگار ہو جائے۔ غالب کی طبیعت نے بھی تحریروں کو اسی انداز میں پیش کرنا ضروری سمجھا جس میں ہونا چاہئے جس طرح کسی کی عیادت کی جاتی ہے یا جس طرح کسی کے گھر کا حال روزمرہ کی زبان میں پوچھا جاتا ہے اسی انداز سے غالب نے خطوط لکھے۔ پہلی بار دنیا کے سامنے مراسلہ کو مکالمہ بنا کر دلکشی و دلچسپی کا دفتر پیش کر دیا۔ اتنی نرم زبان و دلکش طرز نگارش نثر کے لئے میر کی غزل ہو گئی۔ سادگی پر لوگ ایمان لے آئے۔ رنگین دنیا کے رہنے والے بھی للچا اٹھے۔ اور اسی عہد پر کیا منحصر ہے۔ آج تک غالب کے خطوط اپنی فطرت پسندی و طرز بیان کے لحاظ سے قابل رشک ہیں۔

عہد جدید میں اس کتاب نے عوام و خواص دونوں کو سادہ و سلیس زبان کی طرف مائل کر دیا۔ اس کے تتبع میں خطوط بھی اسی انداز سے لکھے جانے لگے یہاں تک کہ آداب والقاب کا فرسودہ و طول حصہ خطوط میں نظر انداز کیا جانے لگا روزمرہ کی زبان صرف کی جانے لگی۔ کتابوں میں بھی لوگ مکالمانہ انداز جا بجا پسند کرنے لگے جو آج تک اپنی دلکشی کی وجہ سے پسندیدہ و مستحسن ہے۔ آگے چل کر اس نے ایک رجحان کی صورت اختیار کر لی جس کا تذکرہ ہم عہد جدید و دور حاضر میں کریں گے۔

یہاں سے اردو ادب کا رجحان کچھ اس نہج پر آ گیا کہ جس سے جدید اردو نثر نویسی کی سرحد مل رہی تھی یعنی غدر کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا اور

ہندوستان میں بظاہر سکون پیدا ہو چلا تھا۔ محمد حسین آزاد ایک نئی انجمن کی بنیاد پنجاب میں ڈال رہے تھے۔

اردو نثر کے عہد قدیم میں مزاح کا رواج زیادہ نہیں معلوم ہوتا نہ کوئی مستقل تصنیف نظر آتی ہے اور نہ کوئی خاص رجحان، لطائف یا جابجا اشارے ضرور مل جاتے ہیں۔ البتہ دور متوسط میں یہ خصوصیت نسبتاً زیادہ ہے انشاء اللہ خاں کا جو نوشتہ آزاد نے آب حیات میں دیا ہے اس میں 'بی نورن' اور ایک میر صاحب کی گفتگو مزاح کا پہلو لیے ہوئے سامنے آتی ہے۔ مذاق اچھا ہے مگر اس قسم کی مثالیں زیادہ نہیں۔ اس تحریر میں آبرو، ناجی، حاتم، میر درد وغیرہ پر مزاحیانہ انداز میں نکتہ چینی ہے۔

غالب کے نظری مزاح کا پتہ ہمیں اکثر ان کے لطائف سے ملتا ہے۔ اُن کے خطوط میں بھی بعض بعض ایسے ٹکڑے مل جاتے ہیں جو نہایت عمدہ مذاق کے نمونے ہیں بقول چکبست:-

لطیف[1] ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوں پر نظر ڈالنا چاہیے اردو نثر کے ان جواہرات میں جہاں اور بہت سی لطافت و رنگینی کے جوہر موجود ہیں، وہاں ظرافت کی جھلک بھی کم دلکش نہیں ہے نہ پھبتیاں ہیں نہ طعن و تشنیع کے جگر خراش فقرے ہیں۔ محض روزمرہ کی باتیں ہیں مگر طبیعت کی شوخی متین الفاظ کے پردہ سے جھلکتی ہے اور پڑھنے والے کے چہرہ

---

[1] دیباچہ گلدستہ پنج ص۵

پر مسکراہٹ کا نور پیدا کر دیتی ہے۔"

عہدِ قدیم میں سوانح عمری لکھنے کا کوئی خاص رجحان نہیں معلوم ہوتا جو کچھ اس فن میں تھوڑی بہت کتابیں ہیں۔ ان کی اہمیت بھی تذکرہ کی سی نظر آتی ہے۔ البتہ تذکرے کافی لکھے گئے جن میں عہد قدیم اور اس سے پہلے کے بھی لوگوں کے حالات اور کچھ کارنامے مل جاتے ہیں۔ ان تذکروں میں شعرا، حکما، بزرگان دین، سلاطین اور دیگر مشاہیرِ عالم کا بھی حال مل جاتا ہے۔

بزرگان دین کی سوانح عمریاں جذبات و عقائد کی روشنی میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ تذکرے زیادہ تر ذاتی تعلقات کی بنا پر قلم بند کئے گئے ہیں نہ سوانح عمریوں میں نہ تذکروں میں کردار کی نشوونما تدریجی دکھائی گئی ہے اور نہ لغزشوں کو انسان یا دوست ہونے کی حیثیت سے نمایاں کیا گیا ہے۔ اگر مصنف کسی سے ناراض ہے تو البتہ اس کے معائب پُر زور طریقہ پر بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ غرض کہ عہد قدیم میں سوانح عمری کے لکھنے میں جذبات و عقائد زیادہ کارفرما ہیں اصلی کردار مشکل سے نمایاں ہوتا ہے۔

اخبارات و رسائل

یوں تو ۱۷۸۰ء میں ہندوستان کا سب سے پہلا اخبار "بنگال گزٹ" کے نام سے نکلا لیکن اردو میں نہ جانے کیوں ۵۶ سال تک باقاعدہ اخبار نہیں دکھائی دیتا۔ ۱۸۳۵ء اردو زبان کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ اسی سال سے سرکاری زبان فارسی کے بجائے اردو ہوئی اور پریس کو آزادی ملی۔ اور فوراً اسی کے بعد یعنی ۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار نکلا۔ اس اخبار کے بانی

مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر تھے۔ اس اخبار میں صحافت سے زیادہ ادبیت پر توجہ دی جاتی تھی چنانچہ غالب، ذوق، مومن کی غزلیں شائع ہوتی تھیں اور کبھی کبھی زبان کے دوسرے مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ اس کے بعد ۱۸۴۳ء میں سر سید کے بھائی سید محمد خاں نے "سید الاخبار" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس میں زیادہ تر سر سید ہی کو کام کرنا پڑتا تھا "فوائد الناظرین" ماسٹر رام چندر دلی سے نکالا کرتے تھے۔ پہلے یہ ماہوار رسالہ تھا لیکن ۱۸۴۶ء سے ہفتہ وار ہو گیا۔ اس اخبار میں مشہور اشخاص کی تصویریں اور مختلف مقامات کے نقشے بھی ہوتے تھے۔ یہ چیز پہلے کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ نقشے، سائنٹفک مضامین، علمی آلات اور تاریخی اشخاص کی دستی تصویریں اس کی خصوصیات میں سے تھیں" اس کے بعد بھی اردو اخبارات نکلتے رہے۔ غدر کے پہلے تک اخباروں کو بڑی آزادی تھی اس وجہ سے ان کا وجود تیزی سے ظہور میں آتا رہا اور خوشی کی بات یہ ہے کہ روز بروز سیاسی و خارجی امور پر ان اخبارات کی توجہ بڑھتی رہی۔ اقتصادی حالت اور اخلاقی معیار کو درست کرنے کی برابر کوشش ہوتی رہی۔

گارساں دی تاسی کے خطبات کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اردو ہندوستان کے ہر گوشہ میں ہر دلعزیز ہو چکی تھی۔ یہ اندازہ اس لئے ہوتا ہے کہ بمبئی، مالوہ، بنگال، پنجاب، بہار، ممالک متحدہ سے متعدد اخبارات یا رسالے نکلتے تھے۔

---

[1] اردو صحافت کا ارتقاء۔ از مولوی ابو عاصم صاحب بحوالہ "معارف" اکتوبر ۱۹۴۲ء

دور جدید تک آتے آتے اخبار سے دلچسپی لینے کا مذاق اردو میں اچھا خاصا قائم ہو گیا تھا۔ اس وقت تک روزانہ اخبارات بہت کم نکلتے تھے۔ زیادہ تر ہفتہ وار یا پندرہ روزہ تھے۔ رفتار زمانہ کے لحاظ سے سیاسی سطح زیادہ بلند نہ تھی اور صحافت نگاری کا فن بھی یوں ہی سا تھا لیکن اخبارات کو دلچسپ بنانے کے لئے ہر طرح کی خبروں و تحریروں کا اندراج ہوتا تھا۔ علمی و ادبی پہلوؤں پر بحث ہوتی، مذہب و رسوم پر بھی رائے زنی ہوتی۔

یہ رجحان بھی اس وقت کے اخباروں کا قابل دید ہے کہ اکثر اخبار اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہوتے تھے اور بعض بعض انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں نکلتے تھے۔ ان کے لب و لہجہ میں بیباکی اور اثر بھی تھا۔ اس قسم کی ترکیبیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں "راقم چیٹھی" "بحصول اجازت حکام واسطے خرید نیلام اسباب لوٹ کے" فقروں اور جملوں کو کسی قسم کے وقفوں کے نشانات سے جدا نہیں کرتے تھے۔ انگریزی املا کی صحت کا اس قدر خیال تھا کہ سپٹمبر اور ڈسمبر ہی لکھتے تھے۔ بمبئی میں "م" کی جگہ "ن" لکھتے تھے۔"[1]

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اردو اخبارات پر بھی اثر ڈالا۔ بہت سے بند ہو گئے لیکن ۱۸۵۸ء سے پھر اخباری دنیا چونک پڑی اسی سنہ میں "اودھ اخبار" نکلا جو اس صوبہ کا پہلا اخبار تھا۔ ایک زمانہ میں اس اخبار کی بڑی شہرت تھی اور حقیقت میں ادبی حیثیت سے اس نے بڑا کام

---

[1] "اردو صحافت کا ارتقا" از مولوی ابو عاصم صاحب بحوالہ "معارف" اکتوبر ۱۹۴۲ء

گیا۔ حسب معمول قدیم متعدد اخبارات پھر شائع ہونے لگے اور اب چونکہ انگریزی تعلیم باقاعدہ پھیلتی جارہی تھی جگہ جگہ کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہو رہی تھیں لہذا اخبارات سے دلچسپی بھی زیادہ لوگ لینے لگے اور اخبارات بھی گوناگوں مسائل پر اظہار خیال کرنے لگے معاشرتی، سیاسی، ادبی، سائنٹفک غرض کہ مختلف موضوع ان کی توجہ کے مرکز بن گئے۔

خطبات گارساں دی تاسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخباروں کے ساتھ رسالے بھی اردو میں نکلنے لگے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ پہلا رسالہ نکلنے کی صحیح تاریخ کیا ہے ادبی دنیا دسمبر ۱۹۲۲ء میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی صاحب نے لکھا ہے کہ " ایک رسالہ "محبوب ہند" دہلی سے ماہانہ شائع ہوا کرتا تھا سالانہ قیمت بارہ روپیہ تھی، چھوٹی تقطیع کے ساٹھ صفحے کی ضخامت تھی۔ لیتھو کی تصاویر وغیرہ بھی اکثر ہوا کرتی تھیں۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر مشہور ریاضی داں و فاضل ماسٹر رام چندر تھے۔ یہ رسالہ جون ۱۸۴۷ء سے جاری ہوا اور کئی برس چلتا رہا۔"

کیفی صاحب نے بعض نمبروں کی فہرست مضامین بھی نقل کی ہے جس سے اس رسالہ کے مضامین کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً رسالہ بابت اکتوبر ۱۸۴۹ء کے بعض مضامین یہ ہیں۔ ۱۔ بقیہ حال حکمت۔ زراعت وفنون باغیچہ وغیرہ۔ ۲۔ حال شہر بابل ونمرود کا۔ ۳۔ رسالہ مبارک دراصل کمبوہ۔

جولائی ۱۸۵۰ء کی فہرست یہ ہے کہ۔ ۱۔ مفصل حال جنگ ہائے جدید پنجاب کا۔ ۲۔ بھوت بند۔ ۳۔ بقیہ تاریخ چین۔ ۴۔ غزل شاہ نصیر

فہرست کے علاوہ کیفی صاحب نے اس رسالہ کے اقتباسات بھی نقل کئے ہیں۔ ہم صرف ایک نمبر (۱۸۵۰ء) کا اقتباس نمونہ کے لئے پیش کرتے ہیں۔

"ذکر سکندر اعظم۔ فیلقوس والد سکندر نے ارسطو کو جو جمیع دانایان اس زمانے کے سے زیادہ تر ہوشیار تھا واسطے تربیت اور تعلیم سکندر کے مقرر کیا اور واسطے بیان تعریف اسکندر کے کہنا اس بات کا کفایت کرتا ہے کہ شاگرد لائق استاد کے تھا"

گارساں دی تاسی اپنے تیسرے خطبہ میں ماسٹر رام چندر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "محبوب ہند ایک ماہانہ پرچہ ہے جس میں اہم مسائل و معاملات وقت پر اہل ہند کی تعلیمی حالت پر اور عام ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں" اس میں رسالہ کی اجرا کی کوئی تاریخ نہیں دی ہے۔ کیفی صاحب نے ۱۸۴۷ء اس کا سال وجود بتایا ہے جو غالباً صحیح ہو گا۔ کیونکہ کیفی صاحب اپنی تحقیق و اصابت رائے کے لئے مشہور ہیں اور موصوف پر ہر طرح کا بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

یوں تو گارساں دی تاسی نے اپنے اکثر خطبات میں اخبارات و رسائل کا تذکرہ کیا ہے لیکن کچھ اس مبہم طریقہ سے کہ بعض وقت یہ نہیں پتہ چلتا کہ رسالہ و اخبار میں اس نے کیا فرق کیا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس زمانہ میں کوئی فرق متعین ہی نہیں کیا گیا تھا یا گارساں دی تاسی نے خود نہیں توجہ کی چنانچہ

اپنے نویں خطبہ میں وہ ایک رسالہ "خیر خواہ ہند" کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"رسالہ خیر خواہ ہند، جو مرزا پور سے ۱۸۳۷ء میں فارسی اور لاطینی حروف میں شائع ہوتا تھا بند ہو گیا۔" آگے چل کر پھر لکھتا ہے کہ "نہ صرف امریکن مشنری سوسائیٹوں نے اس اخبار کو چلایا تھا جیسا کہ میں نے اپنے ۱۸۵۷ء کے لکچر میں بیان کیا تھا۔ . . . اس رسالہ کا مقصود تبلیغ مذہب اتنا نہ تھا جتنا کہ دیسیوں میں علم کی اشاعت۔" ایسی صورت میں یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ واقعی رسالہ تھا یا اخبار۔ لہٰذا ہم قطعی طور پر "خیر خواہ ہند" کو اردو کا پہلا رسالہ سمجھنے سے معذور ہیں، کاش وہ اس کے متعلق بھی ویسا ہی صاف لکھتا جیسا کہ بعض بعض جگہ دوسرے رسالوں کے متعلق ایسے کھلے الفاظ میں لکھ دیتا ہے کہ جس سے فیصلہ کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ وہ اخبار ہیں یا رسالہ۔ مثلاً اپنے چوتھے خطبے میں (۲۹ نومبر ۱۸۵۲ء) "فوائد الناظرین" کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ "یہ ایک ماہانہ رسالہ ہے۔"

خطبات گارساں دی تاسی اور دوسرے ذرائع سے جو ہم کو رسالوں کے متعلق اشارے ملتے ہیں ان سے رجحانات کے متعلق کوئی رائے واضح تو نہیں قائم ہو سکتی۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۷ء تک اردو میں کافی رسالے نکلنے لگے تھے جو تنوع مضامین کے اعتبار سے ہمہ گیر ہوتے تھے۔ علمی و ادبی بحثیں بھی ہوتی تھیں اور مذہبی و نیم مذہبی خیالات پر بھی مضامین لکھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ مخصوص شعبہ جات و فنون مثلاً

طب وزراعت وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی۔

طرزِ تحریر کی مثال آپ نے ادیبِ "محبوب ہند" کے سلسلہ میں ملاحظہ فرمائی ہے۔ ۱۸۷۵ء تک عام طور سے زبان ایسی ہی رہی عبارت میں ناہمواری اور تعقید کافی پائی جاتی ہے۔ رنگینی کسی قدر اور قافیہ پیمائی مقبول عام تھی۔ بات کو واضح کرنے کی فکر میں جملوں کو بلا وجہ بھی بڑھاتے جاتے تھے۔ اختصار اور جامعیت اس وقت تک بہت کم نظر آتی ہے۔ فارسی اور عربی کا غلبہ تھا۔ اسلوب بیان و نگارش کے لحاظ سے یکسانیت زیادہ تھی اور انفرادیت بہت کم۔

اخبارات و رسائل کے رجحانات کے سلسلہ میں ضمناً ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ سیاسی فضا کے مکدر ہونے کی وجہ سے فرقہ دارانہ ذہنیت رسالوں کے حدود میں بھی کچھ کام کرنے لگی تھی بعض رسالے ایسے بھی نکلتے تھے جو ۱۸۵۷ء میں کشت وخون کا الزام اپنے فرقہ سے ہٹا کر دوسرے فرقے کے سر تھوپنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ اس ذہنیت کا اثر رسم الخط پر بھی پڑا۔ فارسی رسم الخط کی ہمہ گیری کو مجروح کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں چنانچہ گارساں دی تاسی لکھتا ہے۔ (گیارھواں خطبہ ۲ دسمبر ۱۸۶۱ء)۔

"مفید خلائق" بھی چل رہا ہے۔ اس کے مدیر شیو نرائن جی کا شمار اردو کے اچھے لکھنے والوں میں ہے، آپ یہ کرتے ہیں کہ اردو کے پہلو بہ پہلو ہندی زبان کے مضمون بھی شائع کرتے ہیں۔ ہندی کے مضامین

اسروپ کارک' کے عنوان کے تحت ہوتے ہیں۔اس سے ان
کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان ہندوؤں کو خوش کریں جو
مسلمانوں کی زبان سے اپنی زبان کو تحریر کے ذریعہ الگ کرنا
چاہتے ہیں"

جدید نثر کے رجحانات

جدید دور کا تعین

جدید اردو شاعری کے رجحانات پر قلم اٹھاتے وقت یہ کشمکش ہوئی تھی کہ اس دور کا آغاز کس زمانہ سے کیا جائے وہی سوال جدید نثر کے لئے بھی درپیش ہے اگر اس کا فیصلہ طرز تحریر پر رکھا جائے تو میر امن فورٹ ولیم کالج سے اپنی پیشوائی کی سندیں "باغ و بہار" پیش کرتے ہیں۔ اور ان کے رفیق کار ایک جتھا بنا کر کسی کو آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ اگر تنوع مضامین کو معیار قرار دیا جائے تو یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ غدر کے پہلے جو علمی ذخیرہ وجود میں آچکا تھا۔ وہ کس طرح نظر انداز کیا جائے اور ذہن شاید کوئی حل نہ پیش کر سکے۔ اگر ان دونوں شرطوں کو یعنی طرز نگارش اور تنوع مضامین کو بہ یک وقت ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو البتہ اس فیصلہ میں کافی مدد ملتی ہے یعنی اگر ہم یہ دیکھیں کہ سادگی کے ساتھ عبارت آرائی اور مختلف مضامین کی کثرت و مقبولیت کس زمانہ میں ہوئی اور یہ رویہ کب سے مستقل ہوا اور اسی زمانہ کو سنگ بنیاد بنالیں تو ممکن ہے کسی قرین قیاس و قابل قبول نتیجہ پر پہنچ سکیں اس لحاظ سے سرسید اور ان کے

رفقا سب سے پہلے ہمارے سامنے آتے ہیں جو "تہذیب الاخلاق" کی صورت میں ہمیشہ کے لئے ایک خاص کارنامہ چھوڑ گئے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ دورِ جدید کے بانی یہی لوگ تھے اور اسی عہد سے اس کی ابتدا ہونی چاہئے۔ مگر ذرا سختی سے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ سر سیّد اور ان کے رفقا کے طرز تحریر کی ابتدا میں زیادہ اور بعد کو بھی کہیں کہیں پرانی روش کی جھلک آجاتی ہے مقفّیٰ عبارت بھی نظر آتی ہے اور گلابی اردو کا بھی رنگ نظر آجاتا ہے۔ اگر ان باتوں کو آپ قابل غور سمجھتے ہیں تو پھر محمد حسین آزاد اور ان کے ہمعصر حالی و شبلی وغیرہ کا زمانہ اردو نثر نویسی کا دورِ جدید کہا جا سکتا ہے۔ طرز تحریر کے اعتبار سے بھی اور تنوع مضامین کے لحاظ سے بھی ان بزرگوں نے ندرت و کثرت کا انبار لگا دیا اور ایسے راستے دکھا دیے جو اس سے پہلے مشکل سے دکھائی دیے تھے۔ مضمون کے لحاظ سے رمزیات، تنقید، تاریخ، علم کلام، سوانح عمری، غرض کہ متعدد اقسام کے مضامین آگئے اور طرز بیان کے اعتبار سے صفائی، سادگی، زور، جوش، بیباکی، استدلال، متانت، علمیت، تاثیر اور سب سے بڑھ کر واقعیت کچھ اس انداز سے یہ حضرات لے آئے کہ اس سے پہلے کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے بعد اردو میں اس پایہ کے نثر نویس آج تک نہ پیدا ہو سکے۔ ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ جدید اردو نثر کی ابتدا آزاد ہی کے زمانہ سے کی جائے ورنہ قدیم

جدید رجحانات کا تسلسل اور طرز تحریر کا مربوط رشتہ قدم قدم پر ہیں کسی ایک دور کو پرانے اور نئے عہد میں تقسیم کرنے سے روکے گا علاوہ اس کے چونکہ آزاد نے اسی غرض وغائت کے لئے ایک انجمن قائم کی تھی اور محض ادبی وعلمی رجحانات کو حسب رفتار و مطالبات زمانہ پھیرنے کے لئے قدم اٹھایا تھا جس کی تقلید دوسروں نے بھی کی تو ہمیں ایک خاص تاریخ بھی سنگ بنیاد قائم کرنے کے لئے مل جاتی ہے۔ اس وجہ سے بھی ہم اسی زمانہ کو عہد جدید کی ابتدا سمجھنا بہتر خیال کرتے ہیں۔

مغرب کا اثر اس دور کے رجحانات پر انگریزی ادب کا اتنا اثر پڑا کہ تمام اردو ادب متاثر نظر آتا ہے۔ ہماری شاعری و نثر دونوں نے مغربی ادب کی خصوصیات کو جذب کر لینے کی کامیاب کوشش کی۔ نظم کے سلسلہ میں آپ طریق کار و اثرات کا اندازہ کر چکے ہیں نثر نے بھی ہر چہار طرف ہاتھ پیر مارنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ خوش قسمتی سے اس کو ایسے اچھے اور سلیقہ شعار بزرگوں کی رہنمائی نصیب ہوئی جو علاوہ علمی قابلیت کے فنی صلاحیتوں کے بھی مالک تھے اپنے ادب کی کم مائگی پر اظہار تاسف کر کے خاموش ہونے والے نہ تھے زمانہ کی سرد مہری پر حقارت آمیز نظریں ڈال کر چپ رہنا گناہ سمجھتے تھے بلکہ ایک صاحب فکر و دور اندیش مدبر کی طرح خود اپنی دنیا آباد کرنا چاہتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اگر یہ سوچ لیجئے کہ وہ لوگ انگریزی یا مغربی

ادب سے کما حقہ واقف بھی نہ تھے تو اور حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح اس ادب کی خوبیوں کو اپنی زبان میں لاسکے جس سے بہت کم واقفیت تھی۔ آزاد، حالی، شبلی سب کے سب مشرقی علوم کے عالم تھے مغربی ادب سے کوئی خاص سابقہ کبھی نہیں پڑا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی ایک زبان کے ماہر و جوہر شناس کو ذرا سی محنت میں دوسری زبان کے کارناموں سے خوبی و خرابی کا اندازہ کرلینا کوئی مشکل کام نہیں، اس لئے کہ انسانوں کی طرح زبانوں میں بھی کچھ خاص مناسبتیں ہیں جیسے آدمی خواہ کسی ملک یا طبقہ کا کیوں نہ ہو دوسرے انسانوں کے کارناموں سے اخلاق و ہمدردی و ترقی کے عناصر کا اندازہ کرکے فوراً متاثر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک زبان کا جاننے والا بشرطیکہ صاحب دل و دماغ ہو دوسری زبان سے بھی حسب استعداد حسن و قبح کا اندازہ کرلیتا ہے۔ ہاں عموماً ہوتا یہ ہے کہ اثر لینے والے صرف ممدوح کی تعریف کرکے چپ ہو جاتے ہیں یا اپنی عظمت و برتری ثابت کرنے کے لئے ہمدردی کے پردہ میں اپنی قوم یا زبان کی بڑائی کرکے سمجھتے ہیں کہ ان کا ذاتی فرض ادا ہو گیا۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اپنے جذبات لطیف کو اس خود نمائی کے سبز باغ سے آگے لے جانے کی کوشش کرتے ہیں حقیقت میں ایسے ہی لوگ نئی تحریک کے پیش رو بن کر حیات جاودانی کے مالک ہو جاتے ہیں اور انھیں لوگوں کو رجحانات کے تبدیل کرنے کا ملکہ ہوتا ہے۔ پنجاب میں آزاد نے انگریزی ادب کے کارنامے سن کر اپنی زبان

کی علمی و ادبی کاوشوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ابھی اردو میں بہت سی ایسی کارآمد باتوں کا اضافہ کرنا ہے جن کے بغیر زبان، ادب کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ تنقید، انشا، تاریخ، سوانح عمری، فلسفیانہ مضامین، ڈائری، ناول اردو میں اتنے کم تھے کہ نہ ہونے کے برابر، عبارت و طرزِ بیان میں عہد قدیم کے مقابلہ میں کافی تبدیلی ہو چکی تھی۔ مگر ابھی علمی مضامین قلم بند کرنے کی پوری صلاحیت نہ پیدا ہو سکی تھی۔ کسی قدر مبالغہ و رنگینی کا اثر اردو نثر میں باقی تھا۔ ضروری معلوم ہوا کہ اب رجحان تبدیل کیا جائے اور کمی پوری کرنے کی باقاعدہ کوشش کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے اور ان کے ہمعصروں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور سب کے سب مرتے دم تک نثر کو مالدار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے لکھنے والوں کے لئے نئے راستے پیدا کئے اور ان پر خود چل کر طریق کار بتا دیا۔

علمی رجحان اس دور میں اردو، ادبیت و علمیت کی طرف مائل تھی۔ نئے نئے کارآمد و مختلف مضامین سے اردو کا دامن سجایا گیا۔ آزاد، حالی، اسمٰعیل، ذکاءاللہ خاں، نذیر احمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھوں نے اس دور کی نثر نویسی میں وسیع النظری، زور، جاذبیت، حقیقت، اور دلکشی پیدا کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔

اس دور کے اس علمی مذاق کا بھی تذکرہ ضروری ہے جس نے وسیع النظری کے ثبوت میں علاوہ ان موضوعات کے جن کا تذکرہ ابھی

ہو چکا ہے دوسرے مختلف و معتدد علمی شعبہ جات کو اردو سے متعارف کر دیا جو اس سے پہلے نہ تھے۔ یا بہت کم تھے۔ آزاد نے اردو زبان کو مالدار بنانے کے لئے علم اللسان، رمزیات و ALLEGORY کی مستقل کتابیں لکھ کر نثر کو نئے راستے دکھا دیے۔ مولوی ذکاءاللہ خاں نے ریاضیات، طبیعیات، ہیئت، سیاست مدن، جغرافیہ وغیرہ پر تصنیف یا تالیف کی صورت میں پوری پوری کتابیں نئے میدان کے تلاش کرنے والوں کی رہنمائی کے لئے پیش کر دیں۔ اس سلسلہ میں ان کی زبان دانی کا ثبوت ایک اور طریقہ سے ملا۔ انڈین پینل کوڈ کو اردو میں اس خوبی سے ترجمہ کر کے تعزیرات ہند کی صورت میں پیش کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ جو قوانین آرہے ہیں وہ اردو ہی میں لکھے گئے تھے قانون کی اصطلاحات اور زبان کا ترجمہ اس خوبی سے کیا کہ لوگوں کو سمجھنے اور ذہن نشین کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ موصوف ۱۸۵۴ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک مختلف موضوعات پر کوئی ۱۴۳ کتابیں نثر کے کتب خانے کے لئے چھوڑ گئے۔ ایک ایک موضوع پر کئی کئی کتابیں مہیا کر دیں صرف ریاضیات پر کم و بیش اکیاسی کتابیں اسی ایک قابل قدر مصنف کی موجود ہیں۔[1]

نئے رجحانات کو عام کرنے کے لئے مستقبل کی ذہنیت کو ابھی سے سنوارنا ضروری تھا۔ نئے مذاق سے نئی پود کی آبیاری ضروری تھی تاکہ بڑے ہوتے ہوتے مزاج پختہ ہو جائے۔ آزاد و اسمٰعیل نے بڑی دور اندیشی سے کام لیا۔ بچوں کے لئے نئے ڈھنگ کے قاعدے لکھے۔ قواعد

---

[1] سیر المصنفین حصہ دوم۔

مرتب کیے ان درسی کتابوں میں ان لوگوں کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ بعید از قیاس قصوں کے بجائے دلچسپ پیرایہ میں کارآمد باتیں پیش کر دی جائیں مولوی اسمٰعیل نے اس کام میں اتنی خوبی سے ہاتھ بٹایا کہ آج تک اس معرکہ میں ان کا کوئی حریف نہ پیدا ہوسکا۔ ان کا دل و دماغ قدرت کی طرف سے بچوں کی ذہنی تربیت کے لئے بنایا گیا تھا۔ بچوں کے مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے اتنے موزوں طریقے سے سلسلہ وار کتابیں لکھ دیں کہ ان کی پانچوں کتابیں پڑھ کر اچھی خاصی اردو آجاتی ہے۔

مولوی اسمٰعیل کی کتابوں نے بچوں کے سامنے دنیائے قدیم کی تصویروں کو مٹادیا مافوق الفطرت قصوں کی جگہ پر سائنٹفک اور علمی باتیں مختصر طور پر مگر مزے کے ساتھ کبھی افسانوں میں کبھی مضامین کے پیرائے میں اس طرح پیش کر دیں کہ ذہنیت بدل گئی۔ زراعت، حب الوطنی، اخلاق، سفر کی دلچسپیاں بڑے بڑے لوگوں کی زندگی سے درس بصیرت حاصل کرنا، غرض کہ ہر طرح واقعات و معلومات کو دل و دماغ تک پہنچانے کی کوشش کی۔

تنقید جدید اردو نثر نویسی کی خصوصیات کو اگر وضاحت کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی جائے تو کئی چیزیں نئی معلوم ہوں گی

اسی دور میں باقاعدہ ادبی تنقید کی بنیاد پڑی۔ اس سے پہلے یا تو اردو میں تنقید تھی ہی نہیں یا تھی بھی تو تذکروں میں بہت ناقص اور تشنہ دیوانوں کے ساتھ تقریظیں ہوتی تھیں ان کو تنقید کہنا ہی ظلم ہے۔ آزاد نے آب حیات لکھ کر ادبی تنقید کی طرف اردو نثر کو موڑ دیا۔ شاعری اور شاعر دونوں کے حسن و قبح ادبی لحاظ سے دنیا کے سامنے اس خوبی سے پیش کئے کہ اصلی شعر و شاعر نظروں کے سامنے آگئے حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو اصناف سخن پر تبصرہ کیا۔ شاعری کا مقصد سمجھا کر اپنے ادب کے معائب بیان کئے گو محاسن نہیں بیان کئے گئے لیکن پھر بھی تنقید کا ایک رخ سامنے آگیا۔ شبلی نے اس فن کو اور ترقی دی۔ شعر العجم لکھ کر فن تنقید کے اصول پر روشنی ڈالی۔ فارسی شعرا کے کلام پر رائے زنی کر کے یہ سمجھا دیا کہ اشعار میں خوبی و خرابی کس طرح سے معلوم کی جا سکتی ہے۔" موازنہ انیس و دبیر" لکھ کر واضح کر دیا کہ دو ہم پایہ شاعروں کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ حالی نے یادگار غالب لکھ کر یہ بتا دیا کہ ایک باکمال شاعر پر کیسے کوئی مستقل کتاب تنقید کی روشنی میں لکھی جا سکتی ہے اس کے بعد پھر اس قسم کی اور بہت سی کتابیں اسی موضوع پر آنے لگیں مثلاً المیزان (۱۹۰۷ء) وغیرہ

سید امداد امام اثر نے "کاشف الحقائق" کی دو جلدیں لکھ کر نہ صرف

اردو شاعری پر تنقید پیش کی بلکہ فارسی اور سنسکرت وغیرہ پر بھی رائے زنی کی جس سے اردو کو دوسری زبانوں کی شاعری کی خوبی و خرابی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ غرضکہ اس رجحان سے اردو نثر میں نہ صرف اپنے ہی اصناف سخن پر رائے زنی کی صلاحیت پیدا ہوئی بلکہ دوسری زبانوں کے خواص سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ گویا اب عہد جدید میں اردو نے اس فن میں بھی اپنی وسیع النظری کا ثبوت دینا شروع کیا جو موجودہ دور میں خاص طور پر قابل قدر ہو گیا۔

تنقید کا مذاق اتنا مفید اور اہم معلوم ہوا کہ مستقل کتابوں کے علاوہ جستہ جستہ مضامین بھی اس موضوع پر دیوان کے ساتھ ساتھ نظر آنے لگے ہیں۔ اس سے پہلے بھی دیوانوں میں یا دوسری تصنیفات میں دیباچہ تمہید یا کلام کے متعلق کسی عنوان سے کچھ نہ کچھ لکھا جاتا تھا لیکن وہ شاعر کی ایسی مبالغہ آمیز تعریف ہوتی تھی کہ جس سے شاعر اور شاعری کی خصوصیات کا کوئی پتہ نہ چل سکتا تھا۔ اس کو تقریظ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اوروں کا ذکر تو کیا ہے غالب ایسا سنجیدہ بزرگ بھی جب دیوانوں کے متعلق تقریظ لکھنے بیٹھتا ہے تو آسمان و زمین کے قلابے ایک کر دیتا ہے۔[1] ۱۸۴۹ء میں منشی حبیب اللہ ذکا کے دیوان پر جو تقریظ لکھی ہے اسمیں فرماتے ہیں۔

" فقیر اپنے دوستوں کے کلام کو معرض اصلاح میں بہ نظر دشمن دیکھتا

---

[1] تاریخ نثر اردو مرتبہ احسن مارہروی ص۵۰۲

ہے پس جب تعلق نہیں مدارا نہیں تو جو مجھ کو نظر آیا ہے بے حیف
وبیل (بے لاگ) کہوں گا۔ نثر میں نعمت خاں عالی کی طرز کا احیاء
کیا ہے مگر پیرایہ کچھ اس سے بہتر دیا ہے۔ قصائد میں انوری کا چربہ
اٹھایا ہے۔ مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین
کا انداز، عاشقانہ سوز وگداز۔ منشی حبیب اللہ ذکا سخنور ہمہ دان یکتا۔
لفظ طراز معنی آفریں، صد آفریں، صد ہزار آفریں فقط؛

دور جدید نے اس تقریظ کو تنقید سے بدل دیا جس میں رائے زنی
اس انداز سے ہوئی کہ شاعر اور شاعری کی خصوصیات کا فی نمایاں ہو سکیں۔
اب ۱۹۵۵ء تک آتے آتے ہم دیکھتے ہیں کہ تنقید کے باب میں اچھا خاصا اضافہ
ہو گیا ہے۔ نفسیاتی تحلیل پر زیادہ زور دیا جانے لگا فن کار کے طرز تخیل
کو اس کی ذہنی نشوونما کے لحاظ سے پرکھا جاتا ہے۔ بیان کو واقعات اور
ماحول کی روشنی میں جانچنے کی فکر کی جاتی ہے جذبات سے بہت کچھ الگ
ہو کر سائینٹفک انداز میں سوچا جاتا ہے کردار نگاری، منظر کشی، طرز
استدلال کو فن کارانہ اصول سے تنقید کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے۔

اب سے دس سال پہلے الفاظ اور گرامر پر ہمارے نقادوں کی
نظر کم تھی مگر سردست اس پر بھی خاص توجہ ہو گئی ہے ہر شاعر اور نثر نگار
سے امید کی جاتی ہے کہ وہ زبان کا پورا خیال رکھے گا ان سب باتوں کا
نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ادب بہ ظاہر سست رفتاری کے ساتھ کام کر رہا ہے
لیکن جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ سلیقہ کے ساتھ کیونکہ ہر ادیب کو تنقید کا

خوف و احترام راہ راست پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ہمارا تنقیدی سرمایہ ہمیشہ سے بہتر ہے مگر پھر بھی اس پایہ کا نہیں جیسے انگریزی ادب میں ہے۔

فن سیرت نگاری جدید اردو نثر نے اس کی طرف بھی توجہ کی اور آنے والے اس رجحان کو باقاعدہ منظم کرنے کی فکر کی۔ حالی نے "حیاتِ جاوید" لکھ کر اردو میں سوانح نگاری کا راستہ کھول دیا۔ اور لوگوں نے بھی توجہ کی۔ شبلی نے حیات عالمگیر۔ المامون، الفاروق، سیرۃ النبی لکھ کر بہت کچھ اس فن کی کمی کو پورا کرنا چاہا۔ آزاد کی "دربار اکبری" سیرت نگاری کا ایک اچھا خاصا مرقع ہے۔ اس میدان میں اور بھی بہت سے لوگوں نے قدم اٹھائے اور اس صنف پر متعدد کتابیں لکھی گئیں مثلاً "حیات النذیر" (ڈاکٹر نذیر احمد) "حیات کرامت" (سید کرامت حسین) "حیات رشید" (پیارے صاحب رشید) "حیات محسن الملک" "حیات انیس"۔ "حیات دبیر" وغیرہ مولانا علی حیدر فوق بلگرامی نے ایک سلسلہ اسی زمانہ میں رسول خدا اور ان کی اولاد کے سوانح حیات کا قائم کیا جو اب تک چل رہا ہے اور متعدد کتابیں اس سلسلہ کی ظہور میں آچکی ہیں۔

عہد قدیم کی طرح اس دور میں جذبات پرستی سے مغلوب ہو کر اس فن پر قلم نہیں اٹھایا گیا۔ تاریخ کی روشنی میں واقعات کو پیش کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ نتائج مرتب کرنے میں عقل و منطق سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ طرز استدلال میں البتہ اپنے جذبات کو پیش رکھا گیا ہے۔ ہیرو کی کمزوریوں پر بھی

نظر یں ڈالی گئی ہیں لیکن معذرت کے پردے میں واقعات وماحول سے اسے مجبور بتا کر۔ عقائد وجذبات کا اتنا زور نہیں جتنا اس سے پہلے تھا اصل کردار بہت کچھ نمایاں ہو جاتا ہے۔

تذکرہ نویسی کا رواج جاتا رہا اور اس کا اثر بھی، چنانچہ مصنفین کی حیات قلم بند کرتے وقت ان کے کلام پر تنقید اور اس کا دوسروں سے موازنہ خاص طور سے مدنظر رہتا ہے مغربی اثر کی وجہ سے اور انگریزی زبان سے کسی قدر واقفیت نسبتاً زیادہ ہونے کی بنا پر اہل مغرب کی سوانح عمریوں کے ترجمے بھی پہلے سے زیادہ ہوئے اور سوانح عمری پڑھنے کا شوق بھی کچھ تیز اور وسیع ہو گیا۔

اس سلسلہ میں ہمیں اس سیرت نگاری کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے جو ادبی سلسلہ میں ظہور پذیر ہوئی۔ آزاد نے آب حیات میں ہزاروں شعرا کے حالات وکردار پر جس خوبی سے روشنی ڈالی وہ محتاج بیان نہیں۔ حالی نے حیات سعدی دیادگار غالب میں سعدی اور غالب کی سوانح حیات و مزاج وغیرہ پر بڑی خوبی سے تبصرہ کیا شبلی نے شعرالعجم لکھ کر فارسی شعرا کی سوانح عمریوں سے اردو کو اور زیادہ مانوس کر دیا۔

دور حاضر میں خود نوشت سوانح عمری کا بھی مذاق پیدا ہو گیا ہے لوگ اپنے حالات خود قلم بند کرنے لگے ہیں اس سے ان کے پوست کندہ حالات اور ذہنی نشوونما کے علاوہ ان کی ذاتی جد وجہد کا اندازہ ہوتا ہے لیکن ابھی یہ ذوق ہمہ گیر نہیں ہو سکا اردو میں باقاعدہ لکھنے کا رواج عام نہیں ہو سکا مگر پھر بھی جو کچھ سرمایہ آرہا ہے وہ امید افزا ضرور ہے اس سلسلہ میں سید

رضا علی صاحب کا "اعمال نامہ" اچھی چیز ہے جس میں موصوف نے اپنی کہانی اپنی زبانی بیان کی ہے۔

تاریخی رجحان اس دور سے پہلے تاریخ کی جو کتابیں لکھی گئی تھیں ان میں زیادہ تر فارسی و انگریزی کے ترجمے تھے۔ قاعدہ کی کوئی تصنیف کم نظر آتی ہے واقعات و مذاق کی تبدیلی سے جدید دور نے اس کمی کو بھی پورا کرنے کی فکر کی اس سلسلہ میں آزاد، شبلی، ذکاءاللہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آزاد نے دربار اکبری لکھ کر یہ بتا دیا کہ تاریخ کو کس طرح حدود کے اندر دلچسپ و پُر از معلومات بنایا جاسکتا ہے جس طرح لارڈ مکالے نے تاریخ انگلستان نہایت مبسوط و مفصل لکھ کر تمام سیاسی سماجی مذہبی امور پر روشنی ڈالی تھی اسی طرح آزاد نے بھی دربار اکبری کو ضخیم و مبسوط بنا کر اکبری عہد کے ارتقا، انقلابات، انجام کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ سیاسیات، معاشیات، طرز معاشرت، اخلاق، آداب، علوم، تعمیرات، مذہب مذاق سخن، طریق رزم و بزم غرض حالات کے مکمل نقشے، اپنے دلکش انداز بیان سے اردو کی خدمت میں پیش کئے۔

شبلی نے فن تاریخ کو اردو میں ترقی دینے کے لئے ایک اور قدم اٹھایا۔ متعدد کتابیں اس موضوع پر لکھیں۔ تحقیق و استدلال کے علاوہ عالمانہ و مورخانہ انداز بیان بھی اردو تاریخ نویسی کو آپ نے عطا کیا۔ "اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچا، پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں اور خارستان سے

لے سیر المصنفین حصہ دوم ص۲۲۵

نکال کر سلجھانا اور پھر تقسیم و تحلیل کرنا، بعد ازاں اسے ایسے طور سے ترتیب دینا کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے یہ وہ باتیں ہیں جو مولانا شبلی کو درجہ امتیاز بخشتی ہیں" مولوی ذکا اللہ نے بھی اس طرف توجہ کی اور متعدد کتابیں تاریخ کی اردو میں مہیا کر دیں انھوں نے کبھی خود لکھا کبھی انگریزی مستند تاریخوں کا ترجمہ کیا۔ تاریخ و جغرافیہ پر ۱۷ کتابیں آپکی یادگار ہیں۔ جو اس وقت کے لحاظ سے اردو میں قابل قدر ہیں۔ اپنی معلومات کے لحاظ سے بھی اور مذاق تاریخ کو عام کرنے کے اعتبار سے بھی ان کتابوں کی خاص اہمیت ہے جس سے جدید اردو نثر کے تاریخی رجحان کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلہ میں تمدن عرب و تمدن ہند کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے یہ کتابیں ایک مشہور فرانسیسی مصنف ڈاکٹر لی بان کی لکھی ہوئی تھیں۔ ان کی شہرت و اہمیت کا اندازہ کر کے سید علی بلگرامی نے انھیں اردو میں منتقل کیا۔ فن تاریخ نویسی کے لئے یہ دونوں کتابیں اردو کے مذاق کو سنبھالنے کے لئے کم مفید ثابت نہیں ہوئیں۔ قدیم و تاریخی مواد بہم پہنچانے کے علاوہ مترجم نے جس خوبی سے ترجمہ کیا ہے وہ نہ صرف اب سے پچاس سال پہلے کے لئے باعث افتخار تھا بلکہ آج بھی زبان دانی اور ادبیات پر عبور کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

ان لوگوں کے علاوہ اور بہت سے لوگوں نے تاریخ و تاریخی موضوع پر قلم اٹھائے۔ اس فن کی متعدد کتابیں بازار میں آگئیں جس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ تاریخ بینی کا مذاق پہلے سے زیادہ عام و تنوع پسند ہو چلا تھا۔
صرف ہندوستان نہیں بلکہ اور اسلامی ممالک کی بھی تاریخیں اردو میں مرتب
کی گئیں مثلاً سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے چار جلدوں میں "تاریخ ایران"
شائع کی۔ عرب و اسپین، افغانستان وغیرہ کی بھی تاریخیں کافی لکھی گئیں۔
اس سلسلہ میں سرسید کی "آثار الصنادید" خاص چیز ہے جس سے ذوق
و شوق کے علاوہ اس دور کے تربیت و ترقی یافتہ تاریخی رجحان کا پتہ
چلتا ہے لوگوں کو تھوڑا سا فن تاریخ یا فلسفہ تاریخ سے بھی دلچسپی ہو چلی
تھی۔ ممکن ہے کہ اس فن سے دلچسپی لینے والوں میں عہد سلف کے
کارناموں سے تھوڑی دیر کے لئے خوش ہونے اور فخر کرنے کا جذبہ
زیادہ رہا ہو قوموں یا ملکوں کے عروج و زوال کے اسباب و انجام سے
دل و دماغ کو واقف کرانے کا خیال کم رہا ہو لیکن اس سے انکار نہیں
کیا جا سکتا کہ تاریخ لکھنے اور پڑھنے کا مذاق پہلے سے اس وقت بہتر تھا
تاریخی رجحان کی ایک کڑی سفرنامہ و سیاحت نامہ کا مذاق تھا
جو عہد جدید کی ابتدا میں اردو نے پیدا کیا۔ سرسید نے اپنے لندن تک
کے سفر کی ایک روداد سفرنامہ کی صورت میں قلم بند کی جو تہذیب
الاخلاق اور سوسائٹی اخبار میں چھپ بھی چکی ہے۔ شبلی کا سفرنامہ، ادب
و معلومات کے لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ نے قسطنطنیہ،
ایشیائے کوچک، شام و مصر وغیرہ کے ذاتی مشاہدات و حالات یکجا کرنے
کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد اور لوگوں نے بھی اس قسم کے حالات

سپردِ قلم کیے مثلاً خواجہ غلام الثقلین نے "سیاحت نامہ" اور سرمہارا جہ کشن پرشاد صاحب نے بھی اس قسم کا "سفرنامہ" مرتب کیا۔ ان سفرناموں میں رو داد کی دلچسپیوں کے علاوہ مصنفین کی ذاتی رائے بھی ان کی قابلیت و معاملہ فہمی، خاص طور پر قابلِ قدر ہیں جن سے نہ صرف سفر و سیاحت کی دلکشی بڑھتی ہے بلکہ سیاسی معاملات میں ملکی ترقی سے دلچسپی لینے کی صلاحیت نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ٹکڑا خواجہ غلام الثقلین کے سیاحت نامہ سے ملاحظہ ہو۔

"شط العرب کا پانی شیریں اور اچھا ہے۔ اور اگر آب پاشی باقاعدہ ہو تو کچھ شک نہیں کہ یہیں ایران و ترکی ہر دو کی آمدنی ایک ایک کروڑ روپیہ ہو سکتی ہے بشرطیکہ امن کامل ہو اور آبادی کو ترقی دی جائے۔ یہ آمدنی چار پانچ سال کے اندر بڑھ سکتی ہے۔ یہاں کھجوریں نہایت کثرت سے ہیں اور ان کی تجارت زور پر ہے کہا جاتا ہے کہ سب سے عمدہ کھجوریں یورپ کو چلی جاتی ہیں۔"

یہ سفرنامے معلومات کے علاوہ اس وسعتِ نظر کا پتہ بھی دیتے ہیں۔ جو ایسے طویل سفر کے تجربات کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ ان میں بعض مصنفین نے اپنے مخصوص اندازِ بیان اور طرزِ نگارش کو باقی رکھا ہے جن کی وجہ سے ان کی شگفتگی اور دلکشی حیرت خیز بن جاتی ہے۔ حال ہی میں یعنی ۵۵ء میں احتشام حسین نے امریکہ و یورپ کا سفر کیا اور اپنے ذاتی تجربات کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا ہے جس میں اپنے تجربات کے علاوہ انھوں نے بعض سیاسی

دسماجی نظریات کو بھی دلکش طریقہ سے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا نام "ساحل اور سمندر" ہے

ناول نگاری

قدیم افسانوں کے ردعمل سے مگر زیادہ تر انگریزی ادب سے متاثر ہو کر اردو میں ناول نویسی کی بنا اسی دور میں ڈالی گئی۔ نذیر احمد نے متعدد ناولیں لکھیں، مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) بنات النعش (۱۸۷۲ء) اور توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء) ان کے علاوہ اور کئی ناولیں ان کی وجہ سے ظہور میں آئیں قریب قریب کل ناولوں میں اصلاح معاشرت مدنظر ہے۔ لیکن بقول مجنوں[1] "نذیر احمد کے اصلاحی افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان کا اسلوب نہایت شگفتہ اور دل پذیر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ہم ان کی کہنگی اور بے کیفی کو آج بھی مشکل سے محسوس کرتے ہیں۔ موقع موقع سے ان کے یہاں سوز بھی ہوتا ہے اور تمسخر بھی، اور پھر زبان میں ایسا انداز اور لوچ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا دیر تک اس کی کیفیتوں کو نہیں بھولتا"

مختلف وجوہ سے لوگوں کا مذاق ناول پڑھنے کا بڑھتا گیا۔ لکھنے والے بھی نئے نئے پیدا ہوتے گئے۔ نذیر احمد، سرشار اور شرر اس دور میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سرشار نے فسانۂ آزاد۔ سیر کہسار۔ کامنی۔ پی کہاں۔ جام سرشار وغیرہ لکھ کر خاص شہرت حاصل کی۔ "فسانۂ آزاد" اپنی خصوصیات کی وجہ سے آج تک اردو ادب میں وقعت کے ساتھ زندہ ہے۔ اس کے دو کردار آزاد اور خوجی جس خوبی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ ان کی مثالیں اردو ناولوں میں بہت کم ملتی ہیں۔

---

[1] افسانہ ص۵۹

ایسے زندہ جاوید کردار شاید ہی کوئی دوسرا ناول نویس اردو میں ابتک پیدا کر سکا ہو افسانۂ آزاد ایک اور لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب اور گری ہوئی حالت کو نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ دولت وامارت جانے کے بعد بھی جو افتاد طبیعت معزول رئیسوں کی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ تباہ ہوئے جاتے تھے۔ اس کا نقشہ بڑے دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا ہے۔

ناول نویسی کی دنیا میں شرر کئی لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ ناول خوانی کے رجحان کو جس قدر انھوں نے عام کیا ہے اتنا کوئی دوسرا ناول نویس نہیں کر سکا۔ اپنے ناولوں کو دلچسپ بنانے کے لئے شرر نے اسلام کے تاریخ نما واقعات کو اپنا سرچشمہ بنا لیا۔ عروج اسلام کا نقشہ، آباواجداد کی فتوحات، غیر اقوام کا مغلوب ہونا، ہندوستان کی سلطنت کھونے والے مسلمانوں کے جذبات کو جس خوبی وکثرت کے ساتھ وہ آسودہ کر سکے اُسکی مثال مشکل ہے۔ اس لئے کہ اب زمانہ چالیس برس بعد حقیقت کے ساتھ موجودہ حالت بھی پیش کر دیتا ہے لیکن اس وقت کچھ تو خواب آور انہماک اور کچھ شرر کا طرز تحریر دونوں نے واقعیت کو تاثرات کی گرفت میں کر دیا تھا۔ لوگ ماضی کے خواب میں محو تھے۔ اس میں شک نہیں کہ صحیح یا غلط طریقہ پر شرر نے مسلمانوں کے دلوں میں ذاتی اہمیت کسی حد تک اپنی ناولوں سے پیدا کر دی۔ جو لوگ تاریخ اسلام سے ناواقف تھے ان کو بھی احساس ہوا کہ ہم کسی معمولی قوم سے تعلق نہیں رکھتے۔ چاہے کچھ اور فائدہ ہو سکے

نہ ہوسکے اس قسم کے خیالات سخت جانی یا وقتی امنگ کا باعث ضرور ہو سکتے ہیں۔

شرر کے ناولوں کی فہرست کافی طولانی ہے لیکن جو خاص اہمیت رکھتی ہیں ان کے نام یہ ہیں ملک العزیز ورجنا۔ منصور موہنا۔ فردوس بریں۔ ایام عرب۔ بدرالنسا کی مصیبت۔

ناول نویسی کا رجحان تیزی کے ساتھ بڑھتا گیا۔ لکھنے والے بھی تعداد میں زیادہ پیدا ہوتے گئے۔ خاص طور سے جو لوگ علاوہ شرر وغیرہ کو اس میدان میں نمایاں تھے ان میں حکیم محمد علی خاں طبیب مرزا عباس حسین ہوش۔ ڈاکٹر رسوا سجاد حسین کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ فن کے اعتبار سے ناول نویسی میں کوئی خاص ترقی نہیں ہو رہی تھی۔ انگریزی ناول نویسوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش تھی لیکن اصول پر خاص توجہ نہ تھی نذیر احمد نے اپنی زیادہ تر توجہ عورتوں اور مذہب کی طرف رکھی تھی۔ عام دلچسپی اور شگفتگی ان کے یہاں مفقود تھی۔ سرشار نے مزاح اور شگفتگی کا عنصر ضرور پیدا کیا کردار کی طرف بھی خاص توجہ رہی لیکن پلاٹ میں نہ تسلسل پیدا ہو سکا نہ کوئی خاص مقصد نمایاں ہو سکا۔ شرر نے ہندوستان کے باہر کی چیزیں بھی اپنے دائرہ بیان میں شامل کیں۔ واقعات کو بھی تاریخی جھلک دے دی لیکن کثرت نویسی کی وجہ سے کبھی خامیوں پر تھم کر غور کرنے کی فکر نہ کی۔ خفیف تغیر کے ساتھ سب کے سب کردار ملتے جلتے نظر آتے ہیں واقعات کے ساتھ کرداروں میں نشوونما نہیں ہوتی۔ شروع سے آخر تک یکساں

ایسے زندہ جاوید کردار شاید ہی کوئی دوسرا ناول نویس اردو میں ابتک پیدا کر سکا ہو ۔ فسانۂ آزاد ایک اور لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب اور گری ہوئی حالت کو نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے ۔ دولت و امارت جانے کے بعد بھی جو افتاد طبیعت معزول نیسوں کی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ تباہ ہوتے جاتے تھے ۔ اس کا نقشہ بڑے دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا ہے ۔

ناول نویسی کی دنیا میں شرر کئی لحاظ سے قابل قدر ہیں ۔ ناول خوانی کے رجحان کو جس قدر انھوں نے عام کیا ہے اتنا کوئی دوسرا ناول نویس نہیں کر سکا ۔ اپنے ناولوں کو دلچسپ بنانے کے لئے شرر نے اسلام کے تاریخ نما واقعات کو اپنا سرچشمہ بنا لیا ۔ عروج اسلام کا نقشہ، آباد اجداد کی فتوحات، غیر اقوام کا مغلوب ہونا، ہندوستان کی سلطنت کھونے والے مسلمانوں کے جذبات کو جس خوبی و کثرت کے ساتھ وہ آسودہ کر سکے اُسکی مثال مشکل ہے ۔ اس لئے کہ اب زمانہ چالیس برس بعد حقیقت کے ساتھ موجودہ حالت بھی پیش کر دیتا ہے لیکن اس وقت کچھ تو خواب آور انہماک اور کچھ شرر کا طرز تحریر دونوں نے واقعیت کو تاثرات کی گرفت میں کر دیا تھا ۔ لوگ ماضی کے خواب میں محو تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ صحیح یا غلط طریقہ پر شرر نے مسلمانوں کے دلوں میں ذاتی اہمیت کسی حد تک اپنی ناولوں سے پیدا کر دی ۔ جو لوگ تاریخ اسلام سے ناواقف تھے ان کو بھی احساس ہوا کہ ہم کسی معمولی قوم سے تعلق نہیں رکھتے ۔ چاہے کچھ اور فائدہ ہو سکے

یا نہ ہو سکے اس قسم کے خیالات سخت جانی یا وقتی امنگ کا باعث ضرور ہو سکتے ہیں۔
شرر کے ناولوں کی فہرست کافی طولانی ہے لیکن جو خاص اہمیت رکھتی ہیں ان کے نام یہ ہیں ملک العزیز ورجنا۔ منصور موہنا۔ فردوس بریں۔ ایام عرب۔ بدر النسا کی مصیبت۔
ناول نویسی کا رجحان تیزی کے ساتھ بڑھتا گیا۔ لکھنے والے بھی تعداد میں زیادہ پیدا ہوتے گئے۔ خاص طور سے جو لوگ علاوہ شرر وغیرہ کو اس میدان میں نمایاں تھے ان میں حکیم محمد علی خاں طبیب مرزا عباس حسین ہوش۔ ڈاکٹر رسوا سجاد حسین کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ فن کے اعتبار سے ناول نویسی میں کوئی خاص ترقی نہیں ہو رہی تھی۔ انگریزی ناول نویسوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش تھی لیکن اصول پر خاص توجہ نہ تھی نذیر احمد نے اپنی زیادہ تر توجہ عورتوں اور مذہب کی طرف رکھی تھی۔ عام دلچسپی اور شگفتگی ان کے یہاں مفقود تھی۔ سرشار نے مزاح اور شگفتگی کا عنصر ضرور پیدا کیا کردار کی طرف بھی خاص توجہ رہی لیکن پلاٹ میں نہ تسلسل پیدا ہو سکا نہ کوئی خاص مقصد نمایاں ہو سکا۔ شرر نے ہندوستان کے باہر کی چیزیں بھی اپنے دائرہ بیان میں شامل کیں۔ واقعات کو بھی تاریخی جھلک دے دی لیکن کثرت نویسی کی وجہ سے کبھی خامیوں پر تھم کر غور کرنے کی فکر نہ کی۔ خفیف تغیر کے ساتھ سب کے سب کردار ملتے جلتے نظر آتے ہیں واقعات کے ساتھ کردار میں نشوونما نہیں ہوتی۔ شروع سے آخر تک یکساں

رہتا ہے۔ اور بقول ڈاکٹر زور "ان کے ناولوں میں بہت کم ایسے پارے منتخب کئے جا سکتے ہیں جو ان کے مضامین کے بعض پاروں کی طرح خاصہ کی چیز یعنی ادب العالیہ کہلائے جا سکیں"۔ ڈاکٹر ہادی رسوا نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی، گھریلو زندگی اور اس کے ماحول اور مناظر شگفتہ انداز میں پیش کئے۔ کردار کو بھی رفتہ رفتہ نمایاں کرتے رہے۔ واقعات اور مشاہدات بھی اوروں سے زیادہ خوبی کے ساتھ بیان کئے۔ لیکن پھر بھی ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے فن کی کمی ابھی اتنی باقی ہے کہ ان کے ناولوں کو بھی انگریزی کے خاص ناولوں کے برابر نہیں رکھا جا سکتا۔

ڈراما ڈراما کا رجحان اردو میں واجد علی شاہ کے زمانے ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ امانت کی اندر سبھا اور دوسری اسی قسم کی سبھائیں اس مذاق کا پتہ دیتی ہیں۔ زیادہ فروغ اس رجحان کو انگریزیت کے ساتھ ہوا۔ اسٹیج اور اس کے تمام متعلقات، منظر، پردے، تصویر کشی، اداکاری سب انگریزی اثر کے منت پذیر ہیں۔ لیکن نہ کسی اصول کے ساتھ اس صنف کو نباہا گیا اور نہ ادب کی کوئی قیمتی چیز سمجھی گئی۔ سیر و تفریح کے طور پر ڈرامے لکھے جاتے تھے۔ تھیٹریکل کمپنیوں نے روپیہ کمانے کے لئے اردو ڈراموں پر توجہ کی۔ نہ کوئی زبردست قصہ ڈراما میں لایا گیا اور نہ کسی معمولی قصہ کو زبردست بنانے کی کوشش کی گئی۔

لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، شیریں فرہاد وغیرہ کے قصے مرتب کئے جاتے تھے جن میں بجز عاشق و معشوق کی داستان بیان کرنے کے اور کچھ نہ ہوتا

اور بقول بادشاہ حسین قدیم[1] اردو ڈرامے زیادہ تر ایسے ہیں جن کے پلاٹ کو نہ کسی غیر ملک کے تاریخی واقعہ سے سابقہ ہوتا ہے اور نہ معاشرت سے لگاؤ۔ ان ڈراموں کی زبان مقفیٰ مسجع ہوتی تھی نظم میں بھی کوئی ادبیت نہیں ہوتی تھی۔ مذاق پست و مقصد عامیانہ ہوتا تھا۔ کردار نگاری سرے سے مفقود ہوتی تھی۔

اردو میں ڈرامائی ذوق ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں ذرا دیر میں آیا، گجراتی، بنگالی، مرہٹی میں اس سے پہلے سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اردو نے اس کی تلافی تیزی رفتار سے پوری کرنے کی کوشش کی ۔ انگریزی زبان کے اکثر و بیشتر ترجمے کر ڈالے۔ لیکن عموماً تصرف سے کام لیا گیا۔ کردار و انجام کو بھی کبھی کبھی مترجمین تبدیل کرتے رہے۔

ان ترجمہ کرنے والوں میں عبداللہ، جوالا پرشاد برق، مرزا نذیر بیگ بیتاب اور احسن لکھنوی زیادہ مشہور ہوئے۔ ترجمے عموماً رنگین زبان میں ہوتے تھے۔ مترجمین اشعار زیادہ تر خود کہتے تھے لیکن ادبی حیثیت سے اشعار کی بھی خاص قیمت نہ ہوتی تھی۔

ترجمے کے علاوہ تصنیفات بھی بازار میں آگئیں لیکن زبان و فن کے لحاظ سے کافی خرابیاں تھیں جن سے متاثر ہو کر محمد حسین آزاد نے ڈراما اکبر لکھنا شروع کیا افسوس کہ جنون نے ختم نہ کرنے دیا۔ ایسی ہی غلطیوں کا اثر لے کر ڈاکٹر رسوا نے بھی ایک منظوم ڈراما مرقع لیلیٰ مجنوں تیار کیا جس کی زبان تو نہایت عمدہ ہے مگر پلاٹ اور کردار نگاری کے علاوہ

---

[1] اردو میں ڈراما نگاری ص ۱۰۳

مذاق بھی پست ہے۔ شرر نے جو ڈرامے شہید وفا، میوۂ تلخ، کے نام سے لکھے وہ بھی کچھ اہمیت نہ حاصل کر سکے۔ ان میں عمل اور بیان کا پہلو کافی کمزور ہے۔

اس میدان میں آغا حشر کشمیری کے آجانے سے بہت کچھ تیزی اور وقعت پیدا ہو گئی ابتدا میں تو وہ بھی قدیم انداز کے ڈرامے لکھتے رہے مگر بعد میں فن و زبان و ادب کی طرف خاص توجہ کی۔ سب سے پہلے لب و لہجہ کی کافی فکر کی۔ انداز بیان میں زور، اور مکالمہ میں جوش و متانت نہایت ہوشیاری سے داخل کر کے سطح کو دفعتاً بلند کر دیا۔ حشر نے خود بھی ڈرامے لکھے اور شیکسپیر کے بعض ڈراموں کے بھی ترجمے کئے۔ زبان میں فارسیت اور چستی زیادہ ہے۔ مگر اثر جتنا دیرپا ہونا چاہیے نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ غم و مسرت، نصیحت و عبرت جس کسی کا بھی بیان پیش کرتے ہیں انتہائی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ الفاظ محسوسات کو آخری حد تک کھینچ کر لے جاتے ہیں اور پھر اس کے بعد دفعتاً چھوڑ دیتے ہیں جو اس وجہ سے جلد پھر اپنے مقام پر آجاتے ہیں کہ وہ خود وہاں اس تیزی کے ساتھ نہیں گئے بلکہ لائے گئے تھے، اگر حشر جذبات کو تیر نیم کش بنا کر احساس کا شکار کرتے تو کہیں زیادہ دیر تک ہم لطف لے لے کر مناظر کی یاد تازہ رکھتے۔

بہر حال آغا حشر کا احسان ہے کہ انھوں نے اردو ڈراما کو بہت آگے بڑھا دیا۔ ان کے پہلے ہمارے ڈرامے زیادہ تر منظوم ہوا کرتے تھے نثر میں گفتگو بھی قریب قریب حرام تھی، آغا حشر نے فطرت پسندی کا خیال کر کے نثر کو

بھی ڈراما میں کافی جگہ دی جس سے نظم کی بھی دلکشی زیادہ ہوگئی۔ اس لئے کہ شعر کو ہر وقت سنتے سنتے کان کر ہو جاتے تھے۔ دل کو اُلجھن اس لئے ہوتی تھی کہ نثر کی جگہ لوگ شعر ہی میں گفتگو کرتے تھے۔ اب اپنی اپنی جگہ یہ دونوں ملے تو اچھے معلوم ہوئے۔ ان ہی کی تقلید میں اور لوگوں نے بھی ایسے ہی ڈرامے لکھے جن میں آرزو لکھنوی کافی کامیاب ہوئے۔

مقالہ نگاری

سب سے پہلے فرانسیسی فلسفی مانٹین نے مارچ ۱۵۷۱ء میں ایسے متعدد مختلف مضامین لکھے جو ذاتی تجربات، اختصار و معلومات کا پہلو لئے ہوئے تھے۔ اس قسم کی تحریر کا نام مصنف نے Essay رکھا تھا۔ یورپ میں یہ چیز بڑی دلچسپی و قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی۔ نثر میں یہ مختصر، جذباتی مضامین نظموں کی اکثر دلکشی لئے ہوئے نظر آئے۔ دل و دماغ کو کئی لحاظ سے یہ ندرت پسند آئی۔ مانٹین، کے مقالات کے کوئی سترہ سال بعد انگلستان میں بیکن نے مقالہ نگاری کی طرف توجہ کی اپنے اسلوب بیان و طرز تخئیل، عالمانہ اختصار و جامعیت کی خوبیوں سے اس صنف کو نمایاں و مقبول عام کر دیا۔ اکثر اہل قلم نے اس کو اپنا مشغلہ بنا لیا لیکن مانٹین اور بیکن، کی سی مقبولیت و بلندی آج تک کسی کو نصیب نہ ہوسکی اس صنف کی انتہا ابتدا ہی میں ہو گئی تھی۔ بقول اسمتھ، دوسرے شعبہ جات کی طرح اس شعبہ میں بھی زبردست ہستیاں، ابتدا ہی میں پیدا ہو گئیں تھیں۔

اس مخصوص مقالہ نگاری کی تعریف میں مغرب کے اکثر اہل قلم نے

اختلاف رائے سے کام لیا ہے۔ ایڈمنڈ گاس' لکھتا ہے کہ ESSAY ایک معقول طول کا مضمون عموماً نثر میں ہوتا ہے جس میں بے تکلف اور سرسری طریقہ سے موضوع کی خارجی صورت حال قلم بند کی جاتی ہے اور سختی کے ساتھ یہ پہلو مد نظر ہوتا ہے کہ خود صاحب مضمون پر موضوع کا کیا اثر پڑا ڈاکٹر جانسن اس کی تعریف میں لکھتا ہے کہ اس قسم کی تحریر میں ترتیب وتخئیل کی بہت کمی ہوتی ہے۔ اسمتھ اسی کے متعلق لکھتا ہے کہ ESSAY کو خالص ادب ہونا چاہیے' جیسے کہ نظم خالص ادب ہوتی ہے۔ اسی خیال کر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ مقالہ نگار حقیقت میں نثر کے میدان میں ایک قسم کا شاعر ہوتا ہے۔

بعض ناقدین کے نزدیک مقالہ نگار ساحل حیات پر ایک جذباتی دوربین لے کر بیٹھ جاتا ہے' زندگی لہراتی ہوئی گذرتی ہے وہ موجوں اور خس وخاشاک پر اپنے خاص انداز میں نظر ڈالتا ہے اور اپنی مسرتوں اور اخلاقیات کا مرقع تیار کرتا ہے۔ وہ نہایت ہی معمولی چیزوں سے بھی ربط قائم کر لیتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے جو بڑے سے بڑے موضوعات سے بھی بہ آسانی نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ اس کو موضوع کی کمی نہیں ہوتی بقول اسمتھ کے ہر چیز جو میں دیکھتا یا سنتا ہوں (ESSAY) کا مواد ہے دنیا ہر طرف' مقالہ' برسا رہی ہے صرف انسان کو ہم آہنگ ہونے کی دیر ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی اور بڑی سی بڑی چیز مقالہ کا موضوع ہو سکتی ہے۔

مغرب کا رجحان مقالہ نگاری میں کبھی شخصی اور کبھی غیر شخصی رہا۔ مانٹین بالکل شخصی و ذاتی سمجھتا تھا لیکن بیکن کے یہاں یہی چیز غیر شخصی و پر تکلف ہوگئی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں داخلی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا۔ رفتہ رفتہ تنقید، سماجی مسائل و سوانح حیات بھی مقالہ کے دائرہ میں شامل ہوگئے یعنی انیسویں صدی میں ٹھوس اور عالمانہ نکات پر بھی خامہ فرسائی ہونے لگی۔

مقالہ نگاری کے موجودہ مغربی رجحان کے متعلق ہم اپنے ایک شاگرد[1] کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں: "موجودہ دور میں خاص طور پر شخصی مقالہ (Personal Essay) کا دور دورہ ہے غیر شخصی مقالہ (Impersonal Essay) بہت کم پسند کیا جاتا ہے غیر شخصی مقالہ کیا ہے؟ ایک خوبصورت پیرائے میں مفہوم کو ایک مقررہ قانون قاعدہ اور منطق کے ساتھ وسعت دینا اور اپنے کو پس پشت ڈال دینا تاکہ ذاتی تاثرات و جذبات اس میں شامل نہ ہوسکیں۔ شخصی مقالہ اس کے بالکل متضاد ہے اس میں مضمون نگار مضمون کا تابع نہیں رہتا بلکہ اس کو اپنا تابع رکھتا ہے وہ اس کو جس طرح چاہتا ہے پیش کر دیتا ہے وہ اپنے موضوع کے ساتھ کھیلتا ہے اور اس سے جتنا چاہتا ہے منتخب کر کے اپنی کیفیات و احساسات کے مطابق پیش کر دیتا ہے۔" آگے چل کر مختصر الفاظ میں مزے کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ "مقالہ نگار کا کام اصلاح یا دنیا کی از سر نو تعمیر کرنا نہیں۔ اس کا کام دنیا کی موجودہ حالت کا جائزہ لینا ہے اور ہر بات سے متاثر ہونا ...... مقالہ نگار کا خاص

---

[1] شریف احمد خاں ایم۔ اے (نگار اگست ۱۹۳۸ء)

مقصد اصلاح نہ ہونا چاہیے اس میں کسی قسم کا پروپیگنڈا یا جوش یا مطلب براری کے لئے جدوجہد نہیں ہونا چاہیے۔ مقالہ میں ہلکا سا مزاح، سکون، سادگی اور بے لوث تنقید حیات ہونی چاہیے۔"

ان تمام رجحانات و خصوصیات کو مدنظر رکھ کر ہم اردو کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں مقالہ نگاری، کسی خاص مرتبہ کو نہیں پہنچ سکی ایسے لوگ تو ضرور پیدا ہوئے جو صحیح معنون میں مقالہ نگار کا فرض انجام دے سکتے تھے۔ اور ان لوگوں نے انگریزی ادب سے متاثر ہو کر اس صنف پر قلم بھی اٹھایا لیکن یا تو اصلاحی رجحان نے اس طرف توجہ کرنے کا زیادہ موقع نہ دیا یا کشاکش پنہاں، نے فرصت نہ دی ورنہ ابتدا ہی میں آزاد نے اس طرف اشارہ کیا تھا۔ نیرنگ خیال کے دیباچہ میں کہتے ہیں کہ "میں نے انگریزی انشا پردازی کے خیالات سے اکثر چراغ روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر مشتمل ہیں جنھیں یہاں جواب مضمون (ESSAY) کہتے ہیں۔"

آزاد۔ سرسید۔ حالی۔ شبلی۔ شرر دور جدید میں ایسے اہل قلم ملتے ہیں جنھوں نے انشائیہ کو بھی اردو میں متعارف کرنے کی کوشش کی اور ان میں سے ہر ایک نے ایسے ایسے مضامین لکھے جو صحیح معنون میں انشائیہ کہے جا سکتے ہیں جیسے سرسید کا مضمون "امید کی خوشی"، حالی کا انشائیہ زبان گویا، اور شرر کے بہت سے مضامین مثلاً لالۂ خود رو، اندھیری رات، انتظار وغیرہ۔

آزاد کے اکثر مضامین جو نیرنگ خیال میں ہیں انشائیہ کے تحت میں آجاتے ہیں۔

تہذیب الاخلاق کے زیادہ مضامین کسی نہ کسی مقصد یا پروپیگنڈا پر مبنی ہیں جن سے مسلمانوں کی بیداری مقصود ہے اور شروع ہی سے کوئی نہ کوئی مقصد پیش نظر ہو جاتا ہے اس لئے اپنے مضامین کو انشائیہ کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

مزاحیہ رجحان دور جدید میں ظرافت و بذلہ سنجی دور قدیم سے زیادہ ملتی ہے اخبارات و علمی و ادبی کتابوں میں بھی یہ عنصر تیزی کے ساتھ جگہ کر رہا ہے۔ محمد حسین آزاد کی لطیف ظرافت ان کی ہر تصنیف میں نمایاں ہے لیکن 'آب حیات' کے لطیفے مجموعی حیثیت سے آزاد کے بہترین مذاق کے نمونے ہیں۔ سنجیدگی و متانت نے درمیان کردار کے متعلق افسانہ و واقعیت کا پہلو لئے ہوئے ان کا ہر لطیفہ موضوع کو بہت دلکش بنا دیتا ہے۔ اس قسم کا مذاق' نذیر احمد کے یہاں بھی کافی ہے۔ ابن الوقت اور مرزا ظاہر دار بیگ کا کردار بذلہ سنجی و طنز کا بڑا لطیف امتزاج ہے ان قصوں کے پس پردہ جو مقصد ہے وہ بے انتہا موثر و دلکش ہو جاتا ہے۔ سرسید و حالی کی تحریروں میں بھی ہمیں پر لطف مذاق کے نمونے ملتے ہیں۔ غرض کہ متین سے متین ادیب بھی نثر میں کبھی کبھی ہنستے ہنساتے نظر آتے ہیں۔

ان کے بعد ہم کو اس قسم کی ظرافت ملتی ہے جس میں مزاح کا رنگ زیادہ نہیں اودھ پنچ نے مذاق کی ایک نئی دنیا بسا دی اس کا پورا اسکول

تبسم زیر لب کا قائل نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ہنسنے والے نمایاں طور پر ہنسیں
چکبست نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ وطرار طبیعت
کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں اس طرح نکلتی ہیں جس طرح کمان
سے تیر جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ ہوتا ہے وہ روتا ہے اور دیکھنے والے
اس کی بیکسی پر ہنستے ہیں۔ ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے بلکہ
نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں۔ ان کا ہنسنا غالب کی زیر لب مسکراہٹ سے
الگ ہے۔ یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسرے
کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اکثر طبیعت کی شوخی اور بے تکلفی درجہ
اعتدال سے گذر جاتی ہے اور ان کے قلم سے بے تحاشا ایسے فقرے نکل
جاتے ہیں جن کو دیکھ کر مذاق سلیم کو آنکھیں بند کر لینا پڑتی ہیں[1]"

اس اسکول میں سب سے زیادہ نمایاں منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ
پنچ ہیں۔ ان کے مذاق میں مکالمہ کا زیادہ لطف ہے۔ چٹکلے اور لطیفے اس
طرح قلم بند کرتے ہیں کہ معلوم ہو کوئی بات کر رہا ہے۔ طرز تحریر بہت رنگین
و جاندار ہے۔ تشبیہہ و استعارے کی ندرت خاص طور پر جاذب توجہ ہے ان
کے تمسخر سے قابلیت و ہمہ دانی ٹپکتی ہے۔ سیاسی امور پر اپنے انداز میں رائے
زنی علمی و ادبی مسائل پر تنقید ان کے مضامین کے خاص جوہر ہیں۔ وہ
مذاق کے پردے میں گورنمنٹ پر ایسی چوٹ کر جاتے تھے جو اور کسی طرح
ممکن نہ تھی اس طرح ادب میں گویا سیاسی بیداری کا نہ تحریک پیدا کرنے کی
کوشش کر رہے تھے۔ ان کی خلقی ذہانت وطباعی کا نتیجہ تھا کہ حاجی بغلول

---

[1] گلدستہ پنچ ص ۵

احمق الذین، طرحدار لونڈی وغیرہ اردو ادب میں پیدا ہوئیں۔ علاوہ منشی سجاد حسین کے اودھ پنچ کے مشہور اہل قلم حضرات یہ ہیں مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، احمد علی شوق، نواب سید محمد آزاد، جوالا پرشاد برق، احمد علی کسمنڈوی، اکبر حسین اکبر، ان سب کا رنگ قریب قریب وہی تھا جو سجاد حسین کا۔

اس سلسلہ میں رتن ناتھ سرشار کا ذکر نہ کرنا تمام فضا کو تاریک رکھنا ہے۔ اگر ظرافت و بذلہ سنجی کا مجسمہ تلاش کرنا ہو تو سرشار کا تصور کیجئے ان کی حرکات و سکنات میں، ان کی گفتگو میں ہر جگہ ہنسی لوٹ رہی ہے۔ سماج و انسانی فطرت کے گہرے مطالعہ نے ان کی تحریر کو وسیع و کارآمد بھی بنا دیا تھا۔ اسلوب بیان اتنا دلچسپ تھا کہ چاہے مواد زیادہ نہ ہو مگر ذرا سی بات کو بھی ضرب الامثال کی کثرت و رعایت لفظی کے برمحل استعمال سے دلچسپ و قابل مطالعہ بنا دیتے تھے۔ لیکن ایسی دلچسپی کو قائم رکھنے کی فکر میں کبھی کبھی مبتذل جملہ بھی کہہ جاتے ہیں۔ سرشار کا مرتبہ ظرافت میں اتنا بلند ہے کہ کوئی دوسرا مشکل سے ان کے قریب نظر آتا ہے۔ فسانۂ آزاد، خدائی فوجدار وغیرہ آج تک ان کے کمالات کو غیر فانی بنائے ہوئے ہیں۔

اودھ پنچ کی ہردلعزیزی سے متاثر ہو کر اور بھی کئی اخبارات اسی قسم کے نکلے مگر وہ اہمیت نہ حاصل ہو سکی جو اس اخبار کو تھی۔ اس رجحان کے عام کرنے میں اس اخبار کا وہ حصہ ہے جو اردو ادب کبھی نہیں فراموش کر سکتا زبان و ادب کے لحاظ سے بھی اس اخبار کے اہل قلم اردو میں ایک ممتاز جگہ پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود اس دور میں مذاق لطیف کی کمی فوراً محسوس ہوتی ہے۔ اشارہ وکنایہ میں وہ پہلو نہیں پیدا ہوتے جو غالب کے یہاں ہوتے تھے۔ شخصی وذاتی پہلو زیادہ نمایاں ہوگیا تھا۔ رعایت لفظی اور الفاظ کے الٹ پھیر کی وجہ سے مذاق کی سطح زیادہ بلند نہ ہوسکی، سادگی وعلوتخئیل کی کمی ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔

صحافتی رجحان

صحافت نگاری سے اردو کو دلچسپی کم از کم ۱۸۲۶ء سے ہوگئی تھی۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ اخبارات ورسائل کا سلسلہ عہد قدیم میں شروع ہوگیا تھا۔ رفتار زمانہ کے ساتھ رجحان واخبارات میں اضافہ ہوتا گیا۔ دورجدید یعنی ۱۸۶۶ء سے صحافت نگاری واخبار بینی کے مذاق میں باقاعدگی ہمہ گیری زیادہ ہونے لگی۔ انگریزی اخبارات کے نمونے مدنظر رکھتے ہوئے اردو اخبارات بھی قدم اٹھانے لگے۔

سرسیّد، ممتاز حسین، حکیم برہم وغیرہ کا میدان صحافت میں آجانا اخبار نویسی واخبار بینی کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ قابلیت واعزاز کے لحاظ سے ان لوگوں کا مختلف طبقوں میں زبردست اثر تھا اور پھر ان لوگوں نے اخبارات کو وقیع بنانے کے لئے گوناگوں کوششیں صرف کیں۔ خبروں کی صحت، اصابتِ رائے، وسیع النظری اور تنوع مضامین کی وجہ سے صحافت کی سطح پہلے سے بہت بلند ہوگئی۔

رسالہ سائینٹفک سوسائٹی علی گڈھ اور اودھ پنچ ایسے اخبارات تھے جنھوں نے اردو کے مذاق ورجحان تبدیل کرنے میں کافی حصّہ لیا۔ علمی وادبی

مسائل کے ساتھ ساتھ سماجی و سیاسی حالات پر نہایت خوبی کے ساتھ مضامین لکھے جاتے تھے۔ اول الذکر اخبار کے متعلق مولانا احسن مارہروی لکھتے ہیں کہ "اگرچہ[1] یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانۂ حال کی نئی اطلاعات اس کی بدولت ہندوستان کو حاصل ہوئیں ان کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں کہ کم از کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اسی پرچہ کے اجرا سے شروع ہوئی" اودھ پنچ (لکھنؤ) نے اپنے مزاحیہ انداز میں سیاسی و سماجی حالات پر ایسی رائے زنی کی کہ اس کی بیباکی ہر اخبار سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی وہ گرفت سے بھی آزاد رہا۔ علمی و ادبی مضامین بھی اپنے خاص رنگ میں مسلسل پیش کرتا رہا۔ طنز و تمسخر، تخاطب کے ساتھ قابلیت و معلومات کا امتزاج اس لحاظ کی نمایاں خصوصیت تھی اس کی ہمہ گیری و صلاحیت کو دیکھ کر اکثر سربرآوردہ و ممتاز اہل قلم اپنے مضامین سے اس کی اعانت کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک قابل قدر اسکول اودھ پنچ کی وجہ سے اردو میں پیدا ہو گیا۔

اس دور میں زبان و مذاق کے لحاظ سے صحافت نگاری کا معیار نسبتاً بلند نظر آتا ہے۔ طرز تحریر میں نمایاں فرق ہے۔ عبارت پہلے سے زیادہ سلیس اور چست ہے مگر پھر بھی عربی و فارسی کے لحاظ و تراکیب کا دباؤ ضرورت سے زیادہ ہے۔ انگریزی الفاظ اردو جملوں میں جا بجا چکتے ہیں۔ مغرب کے ضرب الامثال و محاورات کے ترجمے سے زبان کو مالدار بنانے کی کوشش شعوری یا غیر شعوری طور پر ہونے لگی۔ مغربی ادب و خیالات سے متاثر ہونے کی وجہ سے مدیروں

---

[1] تاریخ نثر اردو

کے طرزِ تحقیق و اظہارِ رائے میں بھی ایک گونہ آزادی نظر آتی ہے آمد و رفت کے وسائل زیادہ ہو جانے سے دنیا کے ہر گوشہ سے خبریں آنے لگیں۔ اور خبروں کی دلچسپی عجوبہ روزگار تک محدود نہ رہی اور ایسی خبریں، جو قرینِ قیاس نہ ہوں محض اچنبھے کے لئے کچھ لوگوں کو متاثر کریں اب غائب ہونے لگیں۔ زیادہ تر وہ باتیں اخباروں میں آنے لگیں جو معقول و قرین قیاس ہوں۔ فنِ صحافت سے لوگوں کو زیادہ دلچسپی ہوئی اور کئی ایک اخبارات روزانہ نکلنے لگے۔

اخبار کی طرح رسالے بھی عہدِ جدید سے تعداد میں زیادہ ہونے لگے کئی ایک رسالوں کا نام ویتہ گارسان دی تاسی نے لکھا ہے۔ منجملہ دیگر رسائل کے 'آئینۂ علم' الہ آباد سے شائع ہوتا تھا جو ماہوار ادبی رسالہ تھا اور ایک رسالہ موسوم بہ 'اخبار سررشتہ تعلیم' لکھنؤ سے نکلتا تھا، 'گنجینۂ التعلیم' مرادآباد سے گنگا پرشاد کی ادارت میں ماہانہ نکلتا تھا۔ اور ایک رسالہ 'میور گزٹ'، سر ولیم میور (لفٹنٹ گورنر) کی سرپرستی میں میرٹھ سے ماہوار شائع ہوتا تھا لیکن ان سب میں ممتاز تہذیب الاخلاق تھا جس کے متعلق مولانا احسن مارہروی لکھتے ہیں[1] کہ "اگرچہ اس کا شمار اخباروں میں ہوتا ہے مگر مذاق حال کے مطابق باعتبار مضامین ماہوار رسالہ یا میگزین کی حیثیت رکھتا تھا اس عہد کے نامور و سربرآوردہ اہل قلم جو اکثر سرسید کے ہم خیال و متبعین میں تھے ان کے مضامین بالعموم اسی اخبار میں چھپتے رہتے تھے۔ صحت زبان و اسلوب بیان کے متعلق اس کی وقعت ہر طرح مسلمہ تھی"۔ تہذیب الاخلاق' جدید

---

[1] تاریخ نثر اردو ص۴۳۵

علوم اور مذہب پر ایک خاص قاعدہ و نظریہ کے تحت روشنی ڈالتا تھا۔ اس نے ادب و خیالات میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ وسیع النظری و تنوع مضامین کے بہترین نمونے ہم کو اس رسالہ میں مل جاتے ہیں زبان اور لب و لہجہ اس وقت کے لحاظ سے اتنا موثر تھا کہ عام طور سے اردو رسائل و تصنیفات میں تقلید کی جھلک نمایاں ہے۔ رسائل کے معیار بلند کرنے میں 'مخزن' کا بھی کافی ہاتھ ہے۔ طباعت کی خوبی کے علاوہ صحت و انداز بیان پر اس رسالہ کی خاص توجہ تھی' سرعبد القادر کی ادارت میں اس کو قابل رشک مقبولیت حاصل ہوئی 'زمانہ' (کانپور) جس کی ادبی خدمات کا سلسلہ اب سے قریب ۴۵ برس پہلے شروع ہوا تھا اس زمانہ سے عرصہ تک اردو کی خدمت و اشاعت میں دیا نرائن نگم صاحب کی زیر ادارت مستقل مزاجی کے ساتھ معروف رہا صحافت نگاری سے اردو ادب کو مانوس کرنے میں اس رسالہ کا بڑا حصہ ہے۔

دور جدید میں رسائل کی طرف خاص توجہ معلوم ہوتی ہے خاص خاص اہل قلم کے علاوہ گورنمنٹ بھی اس سلسلہ میں مہربان نظر آتی ہے علمی و ادبی رسائل کے علاوہ شعبہ جاتی رسالے بھی بعض بعض مقامات سے شائع ہوتے تھے مثلاً 'گنجینۂ احکام' ایک قانونی رسالہ مراد آباد سے نکلتا تھا اور فن تعلیم کے متعلق کئی رسالے صوبہ متحدہ و پنجاب سے مخصوص خدمات انجام دے رہے تھے۔ شرر کی زیر ادارت 'دل گداز' نے علاوہ اور خدمات کے تاریخی رجحان کی طرف توجہ دلانے میں کچھ کم کام نہیں کیا۔

زبان و مذاق کے لحاظ سے اس عہد کے رسالے دورِ قدیم سے ممتاز ہیں عبارت میں سنجیدگی و متانت خاص طور پر نمایاں ہے۔ زبان فصیح و پختہ ہے۔ علمی و فنی اعتبار سے اس وقت مذاق زیادہ بلند ہو گیا ہے مضامین میں ہمہ گیری بھی زیادہ ہے۔ لیکن جامعیت حسب دلخواہ نہیں جس کے لئے غالباً دورِ حاضر کا انتظار تھا۔

ان تمام رجحانات کا جائزہ لینے سے صاف نظر آتا ہے کہ عہد جدید نے مغربی ادب سے متاثر ہو کر نہایت تیزی کے ساتھ ہر کارآمد موضوع کو اردو میں رائج کرنے کی کوشش کی، تنقید، تاریخ، سوانح عمری، ڈرامہ، ناول، صحافت وغیرہ سب کے سب انگریزی ادب کے خرمن سے چنے جانے لگے تاکہ بزم اردو مال دار ہو جائے اور مفلسی و کم مائگی کا الزام جاتا رہے۔ لیکن ذخیرہ کو مقدار میں زیادہ لانے کے بجائے اگر بیج کو اپنی سرزمین پر پھولنے پھلنے کے لئے کاشتکار کے صبر و سکون سے کام لیتے تو اچھا تھا۔ اس غیر منظم جد و جہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی صنف تدریجی طور پر ترقی کر کے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی نئی چیزوں کو مقبول ہوتے دیکھ کر لکھنے والوں نے ترقی سے زیادہ تقلید پر نظر رکھی۔ کاش انگریزی ادب کے محاسن و اصول کو ذرا غور سے دیکھتے سوچتے اور سمجھتے بھی۔

بحیثیت رہنمایان ادب کے عہد جدید کے لکھنے والے قابل صد ستائش و ہزار تشکر ہیں کہ انھوں نے ادب کو نئے راستے دکھا دئے میلانات کو تنگ دائرے سے نکال کر وسیع میدان عطا کر دیے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ابتدا ہی میں

الغرض زبان و ادب کے بہترین نمونے پیش کر دیے جن سے آگے بڑھنا آج تک ممکن نہ ہوا
انگریزی ادب پر عبور نہ ہونے کی وجہ سے خامیاں ضرور رہ گئیں۔ اس کی تہہ کو یا تو
پوری طرح سمجھ نہ سکے یا پھر کسی وجہ سے نباہ نہ سکے ترقی و تکمیل کیلئے آئندہ نسلوں کا انتظار کرنا پڑا
درحقیقت کسی ادبی صنف کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں علاوہ اور باتوں کے
عموماً بڑی مدت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے بھی زیادہ قدر دانی و ہمت افزائی
کے سامان درکار ہیں۔ ہندوستان اور خاص کر اردو ادب کی کس مپرسی ضرب المثل رہی ہے
اول تو معاشیاتی حالت مالی امداد سے روکتی ہے اور اگر کبھی وہ اجازت دیتی بھی ہو
تو مزاج اس اعانت کو فضول خرچی سمجھ کر روک دیتا ہے۔ کتابیں خریدنے کو
بھی بدعت بتاتا ہے۔ دوسری وجہ ان اصناف کے حسب خواہش ترقی نہ ہونے میں
یہ ہوئی کہ تعلیم یافتہ طبقہ اس قسم کی چیزوں کو انگریزی میں پڑھنا باعث فخر سمجھتا تھا اور
اس جذبہ سے مرعوب ہو کر اپنے یہاں کی چیزوں کو کم مایہ اور قریب قریب بیکار سمجھ
کر نظر انداز کرتا رہا۔ اگر یہی طبقہ یعنی انگریزی سے واقف کار ہمدردی و خلوص سے
تنقید کرتا رہتا تو ممکن تھا کہ بہت کچھ خامیاں دور ہو جاتیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ یہاں تک آ کر ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ دور
جدید نے مغربی ادب کے اکثر جواہر پاروں کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی
زمانہ کا رجحان بدل دیا۔ کارآمد نئی چیزیں اردو کو نصیب ہوئیں یہیں سے
وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں فرسودگی و اضمحلال و قنوطیت کے رنگین و
نشہ آور ادب سے نکل کر ہمارا ادب تخلیق، ندرت، رجائیت اور بعض لحاظ
سے ادب العالیہ کی طرف قدم رکھتا ہے۔

موجودہ رجحانات کا تجزیہ

جیسا ہم پہلے لکھ چکے ہیں ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سے جو کشمکش اور دقتیں پیدا ہوئیں ان کا اثر ہندوستان پر بھی کافی پڑا۔ سیاسی و معاشرتی زندگی کے علاوہ ادبی دنیا کو بھی انقلاب کے لیے تیار ہونا پڑا۔ شاعری نے اپنا رخت کہن اتارنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ نئے ملبوس سے تیزی کے ساتھ آراستہ ہوئی۔ نثر نے بھی تبدیلی کی طرف قدم بڑھایا۔ نئے خیالات و رجحانات کی ترجمانی ضروری تھی اس خدمت کو انجام دینا شروع کیا نئے رجحانات و خیالات کیا تھے، یہ آپ حصہ نظم میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ دوبارہ بیان کرنا تحصیل حاصل ہے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اردو نثر نے ان کا اثر کتنا لیا اور کیا کیا داخلی یا خارجی تبدیلیاں ہوئیں۔

جس طرح ۱۸۵۷ء سے دور جدید کے رجحانات عہد قدیم سے الگ ہونے لگے تھے اسی طرح ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سے دور حاضر نئی راہیں پیدا کرنے لگا۔ گویا شاہراہِ زندگی میں یہ دوسرا موڑ تھا۔ چیزوں کی گرانی، جنگ کے ہنگامے، عوام و متوسط طبقہ کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوئے دنیاوی تکلیف کے ساتھ روحانی مصائب کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ترکوں کی شکست، بیت المقدس کا نکل جانا مسلمانوں کے لیے کچھ کم روح فرسا نہ تھا۔ دل جذبات سے لبریز

ہو چکے تھے اور خیالات دوسرے ملکوں کی آزادی سے متاثر تھے لوگوں نے بے باکی سے اپنے مطالبات اخبار و رسائل میں پیش کرنا شروع کر دیا۔

جلیان والا باغ کا واقعہ اور خلافت کا مسئلہ کانگریس کی سیاسی سرگرمی کے لئے پس منظر بن گئے۔ تمام ملک میں ایک مذہبی و سیاسی لہر دوڑ گئی کچھ مذہبی جوش اور کچھ سیاسی پہلو دونوں نے نثر میں ہمیشہ سے زیادہ ابھار اور وزن پیدا کر دیا جنگ نے علاوہ اور صورتوں کے اخبارات کے ذریعہ سے مغرب کی ترقی یافتہ دنیا کے خیال سے ہندوستان کو بھی متعارف کر دیا تھا۔ یہ سلسلہ بعد جنگ بھی قائم رہا۔ سائنس و اقتصادیات کے نئے مسائل کی روشنی سے دنیا کو بیدار کیا جانے لگا۔ اردو دانوں نے بھی اثر لیا۔ ان نظریوں کو اپنی زبان میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف مسائل وجدید طرز تخیل سے اردو نثر نگاری نے اپنا دامن وسیع کر لیا۔ زور و منطقی استدلال سے طرز تحریر میں ایک خاص ندرت و شگفتگی کا نمود ہوا۔

۱۹۱۸ء کے بعد ہی سے سیاسی احساسات کی بیداری نے اردو نثر نگاری میں جوش و تیزی اثر کو نمایاں کرنا شروع کر دیا۔ جس میں فارسی کی ترکیبیں اور عربی کے اصطلاحی الفاظ، بندش کو پُرزور اور پیرایہ بیان کو ٹھوس بنانے میں عام طور سے معاون ثابت ہوئے۔ سیاسی و مذہبی مطالبات حق و واقعیت پر مبنی تھے۔ اس وجہ سے تحریر میں خلوص و صداقت کے عناصر زیادہ نمایاں ہونے لگے۔ تنگ نظری، دل آزاری، کے ساتھ ساتھ مذہب و ملت کے وہ محدود و پیچیدہ راستے جو اب تک فرقہ بندی کے باعث پیدا ہو جاتے تھے ختم ہو گئے

نتیجہ یہ ہوا کہ نثر میں ایک خاص قسم کی فراخ دلی، وسیع النظری رواداری اور خودداری آگئی۔ مذہب کی اعانت کے لئے سیاسی وبین الاقوامی امور سے دلچسپی لینے کی لوگوں کو ضرورت محسوس ہوئی۔ ان کے افادی پہلو پر غور کرنے اور اپنے معاملات میں ان سے فائدہ اٹھانے کی فکر ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ تحریر میں فکری عنصر بڑھنے لگا۔ تنوع مضامین کے ساتھ ساتھ عبارت میں جوش، زور، زیادہ ہونے لگا جس کو ذہن نشین کرنے کے لئے جملوں میں انگریزی اسلوب نگارش کا بھی سہارا لینا پڑا۔

جس کو ہم موجودہ دور سمجھ رہے ہیں اس میں کسی نئی صنف کا نثر میں اضافہ نہیں ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ بڑی حد تک الفاظ و زبان دونوں ویسے ہی رہے جیسے ۱۹۱۴ء سے پہلے تھے۔ ہاں یہ البتہ ہوا کہ ضرورت کے لئے نئے نئے اصطلاحی الفاظ پہلے سے زیادہ وضع کئے گئے۔ اس دور کا کارنامہ زیادہ تر گذشتہ عہد کے کارناموں کو سنوارنا اور ترقی دینا ہے۔ جو چیزیں اس سے پہلے اردو نثر میں آچکی تھیں ان میں فنی خامیاں بہت سی رہ گئی تھیں موجودہ دور نے ان کو درست کرنے کا بیڑا اٹھایا لیکن پھر بھی ابھی تک اپنے مقصد کو نہیں پہنچ سکا۔

سیاسی ذہنیت کا سب سے پہلا حملہ بدیشی چیزوں پر ہوا اور ایسی صورت میں بالکل فطری طور پر اپنی چیزوں سے رغبت بھی پیدا ہونے لگی ہندوستان کو اپنا ملک اور اردو کو عام طور سے لوگ اپنی زبان سمجھنے لگے زبان کی ترقی اور بہبود کے لئے جدوجہد کی اب وہ پہلی سی مغائرت د

بے اعتنائی اور زبان کی مفلسی کا احساس لوگوں کو نہ رہا۔ فارسی اور عربی
داں اصحاب نے بھی سمجھ لیا کہ اب یہ زبانیں ہندوستان میں مفید مطلب
نہ ہوں گی۔ مغرب زدہ طبقہ بھی اب اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ نہ ہم انگریز
بن سکتے ہیں اور نہ انگریزی ہماری مادری زبان ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں طبقے
اس نتیجے پر پہنچے کہ بجز اردو نوازی کے اور کوئی ذریعہ انفرادیت واتحاد خیال
کا ناممکن ہے۔ انگریزی داں طبقہ اُن اصناف کے اصولوں سے بھی کافی واقف
ہو چکا تھا جن کو عہد جدید نے اردو نثر میں آکر مغربی ادب سے لے لیا تھا۔ یعنی
تنقید، ناول، سوانح عمری، افسانہ، ڈراما وغیرہ۔ لہٰذا اب جو کچھ لکھا لیا وہ زبان
کے لحاظ سے چاہے کچھ ناقص ثابت ہو لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ
فن کے اعتبار سے یقیناً نقش اول میں اضافہ ہے۔

علمی رجحان اردو کو ملکی زبان بنانے کا رجحان یوں تو عام ہو چلا تھا۔
لیکن باقاعدہ کوشش موجودہ نظام حیدرآباد کے ہاتھوں
سے شروع ہوئی۔ علاوہ اور باتوں کے "دارالترجمہ" کی بنیاد ڈالنا ایک اہم
کارنامہ تھا۔ اردو کو زمانہ سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اسے
موجودہ سائنس وسیاسیات، اقتصادیات، فنون وغیرہ سے پوری طرح آراستہ
کیا جائے۔ اعلیٰ پیمانہ پر ایک ایسے محکمہ کی سخت ضرورت کو پورا کرنے کے
لئے "دارالترجمہ" کا وجود ظہور میں آیا۔

اس محکمہ نے بڑی تندہی اور قابلیت سے کام لیا۔ مغربی اور بالخصوص
انگریزی کی ضروری وقابل قدر کتابوں کا ترجمہ شروع کر دیا اور بیس

پچیس سال کی محنت میں سینکڑوں کتابیں اردو میں آگئیں۔ ان کتابوں میں تاریخ، فلکیات، فلسفہ، سائنس، اخلاقیات، غرض کہ ہر طرح کی کارآمد چیزیں شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں اصطلاحات کے ترجمہ کی بھی ضرورت پڑی جہاں تک ہوسکا خوبی کے ساتھ نئی اصطلاحیں بھی وضع کی گئیں۔

یوں تو اس محکمہ کا خاص منشا جامعہ عثمانیہ کے ہر درجہ کے نصاب کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا تھا لیکن اس سلسلہ میں اور بھی مفید کتابیں اسکی بدولت اردو میں آنے لگیں۔

۱۹۱۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام اردو کے لئے نہایت اہم و مفید امداد تھی۔ ہندوستان میں پہلی مثال تھی کہ جہاں اپنی زبان میں اس طرح اور اس پیمانہ پر تعلیم شروع ہوئی۔ بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ ہر درجہ کی پڑھائی اردو میں باقاعدہ ہونے لگی۔ ضرورت کے لحاظ سے نئی کتابیں اور نئی ذہنیت مرتب ہونے لگیں۔ اب تک زیادہ تر لوگ انگریزی ہی میں سوچا کرتے تھے اور پھر ان خیالات کو اردو میں منتقل کرتے تھے۔ اب جن لوگوں نے اس 'جامعہ عثمانیہ' میں تعلیم پائی ان کو سوچنے کا بھی ملکہ اردو ہی میں ہوا تقریر و تحریر بلکہ ساری فضا میں اردو آگئی۔ اپنی زبان کی اہمیت ان کی نظروں میں ہمیشہ سے زیادہ ہوگئی۔ اس یونیورسٹی سے نہ صرف حیدرآباد والوں کو آرام پہنچا بلکہ تمام ہندوستان میں جہاں کہیں اہل ذوق تھے سب کو ذہنی طور پر اپنی کوششوں کے لئے ایک سہارا نظر آنے لگا۔

انجمن ترقی اردو - یوں تو اس انجمن کی بنیاد ۱۹۰۳ء سے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلہ میں پڑ چکی تھی لیکن برائے نام زندہ تھی جان اس وقت سے آئی کہ جب مولوی عبدالحق نے مسیحائی کی۔ مولوی عزیز مرزا کے بعد عبدالحق کا انتخاب اس کی ناخدائی کے لئے ہوا۔ یہ ۱۹۱۲ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت سے اس انجمن کی سرگرمی شروع ہوئی۔ تصنیف و تالیف کا کام باقاعدہ ہونے لگا۔ علاوہ اس کے ایک بڑا اہم کام یہ بھی ہوا کہ قدیم نظم و نثر کی کتابیں جو اب تک نایاب تھیں وہ بڑی عرق ریزی سے اس انجمن نے حاصل کیں اور تحقیقی مقدمات کے ساتھ شائع کر دیں "انجمن ترقی اردو کی کہانی" میں مولوی غلام ربانی ۱۹۳۷ء میں لکھتے ہیں کہ "انجمن ترقی اردو اب تک تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں تیار کر چکی ہے جن میں سے چند زیر طبع ہیں اور باقی چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ اس کی اکثر کتابیں بلند پایہ ہیں اور بعض ایسے موضوعوں پر ہیں جن پر اس سے قبل کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا" اس انجمن کی خدمات تاریخ اردو میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ گوناگوں مسائل سے اردو کے دامن کو وسیع کرنا اور مغرب کے مختلف رجحانات سے تعارف کرنا یہ اس اہم انجمن کے ایسے کارنامے ہیں جو کبھی بھلائے نہیں جا سکتے موجودہ عہد میں علاوہ اردو کی نشر و اشاعت کے زیادہ توجہ اس انجمن کی اردو ہندی کے نزاعی مسئلہ پر رہی ہے۔ ہندی والے ملک کی زبان کو ہندی بنانا چاہتے ہیں اور اردو والے کہتے ہیں کہ اردو زبان عرصہ دراز سے ہندوستان کی مشترکہ زبان رہی ہے اسی کو رہنا چاہئے۔ یہ انجمن سر تیج بہادر سپرو صاحب

کی صدارت میں اس تحریک کو کامیاب بنانے کی قابل قدر کوشش کر رہی ہے اور اسی مقصد کے لئے دہلی سے "ہماری زبان" کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکال رہی ہے۔

انجمن ترقی اردو کی شاخیں تمام ہندوستان کے شہر و دیہات میں بھی ڈاکٹر عبدالحق کی کوششوں سے قائم ہو گئی ہیں جن کا مقصد زبان و ادب کی خدمت کرنا اور لوگوں کے مذاق و رجحان کو سنوارنا ہے۔ اس انجمن کی سرگرمی مہذب دنیا تک محدود نہیں۔ حال ہی میں اردو کی اشاعت کے لئے سہیل عظیم آبادی کی نگرانی میں ایسے مقامات پر بھی مدرسے قائم کئے گئے ہیں جہاں نیم مہذب کول وبھیل بستے ہیں۔ یہ حالات ۱۹۴۷ء کے پہلے کے ہیں تقسیم ہندوستان کے بعد دوسرا نقشہ ہے

دارالمصنفین اس انجمن کے علاوہ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں اردو کی خدمت واشاعت کے لئے متعدد کارآمد ادارے قائم ہو گئے ہیں۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں دارالمصنفین اور ہندوستانی اکیڈمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دارالمصنفین (اعظم گڈھ) شبلی کے پرجوش خلوص کا نتیجہ ہے ان کی زندگی ہی میں اردو وادب کی خدمت کے لئے یہ ادارہ قائم ہو چکا تھا مختلف اہل قلم کو دعوت تصنیف وتالیف دے کر بیش بہا اردو کی کتابیں پیش کرتا رہا ہے۔

یہ ادارہ اب تک علم وادب کی قابل قدر خدمت انجام دے رہا ہے اعلیٰ پیمانہ کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ 'معارف' یہاں کا مشہور رسالہ ہے جس کے مدیر کبھی سلیمان ندوی بھی تھے۔ دارالمصنفین

نہ صرف عمدہ کتابیں اردو میں پیش کرتا ہے بلکہ عمدہ طباعت کا بھی خیال رکھتا ہے۔ یہاں کے مصنفین زیادہ تر علوم مشرقیہ کے ماہر ہیں مذاق کے لحاظ سے قدامت پسند ہیں چنانچہ یہاں سے زیادہ کتابیں مذہبی یا نیم مذہبی شائع ہوتی ہیں۔ تاریخ و سیرت نگاری پر خاص توجہ ہے

ہندوستانی اکیڈیمی: ہندوستانی اکیڈیمی کا وجود اترپردیش گورنمنٹ کی توجہ کا نتیجہ ہے ۱۹۲۷ء میں اردو اور ہندی کی خدمت کے لئے یہ ادارہ الہ آباد میں قائم کیا گیا۔ صوبہ کے سربرآوردہ لوگوں کو اس انجمن کا ممبر بنایا گیا۔ کچھ اہل قلم اس خدمت پر مامور کئے گئے کہ دوسری زبانوں سے اردو ہندی میں کتابیں منتقل کریں یا کارآمد موضوع پر قلم اٹھائیں یا تالیف کی طرف توجہ کریں۔ اس ادارہ کا رجحان عرصہ تک یہ رہا کہ جس قدر ممکن ہو سکے ہندی اور اردو کو قریب کر دیا جائے وہی الفاظ زیادہ کام میں لائے جائیں جن کو دونوں زبان والے آسانی سے سمجھ سکیں۔ الفاظ کا املا درست کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو رسم الخط کا بھی قصہ طے کیا جائے۔ لیکن اب یہ رجحان بالکل بدل گیا ہے۔

اس اکیڈیمی کی توجہ دیکھ کر صوبہ کے سررشتۂ تعلیم نے بچوں کے لئے درسی کتابیں بھی اس اصول کو مدنظر رکھ کر تیار کرائیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو اور ہندی دونوں میں زبان و بیان کے خفیف تغیر کے ساتھ یکساں ہوں تاکہ ان کتابوں کے پڑھنے والوں کا رجحان آگے چل کر الفاظ اور جملوں کی ساخت کے اعتبار سے ایک ہو جائے ممکن ہو کہ کسی زمانہ میں یہ بُعد جو اردو ہندی میں پیدا ہو گیا ہے مٹ جائے اس

تحریک کا نتیجہ اچھا ہی رہا۔ قدیم اسکول والے تو سختی کے ساتھ مخالفت
کرتے رہے کہ یہ نئی اپج نہ ہندی ہے نہ اردو، دونوں زبانوں کو نقصان
پہنچ رہا ہے۔ لیکن ترقی پسند مصنفین نے اس تحریک کو سراہا اور اپنے طرز
نگارش میں اس اصول کو پیش نظر رکھا۔ اس کے ماننے والوں کو ہندوستانی
قومیت کی تعمیر کے لئے یہ آلہ کارگر نظر آیا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ گورنمنٹ کے
لئے جہاں تک دفتری کارروائی کا سوال ہے، وہ بہت کچھ حل ہو جاتا ہے۔
تقریر اور کاروبار میں ہندی اور اردو کی اجنبیت دور ہو جائے گی۔ ایک
دوسرے کی بولی اور مفہوم آسانی سے سمجھ سکیں گے۔
تقسیم ہند کے بعد یہاں کا نظام بدل گیا ۱۹۵۴ء سے اس کا ہر کام
ہندی میں ہونے لگا ہے گو اردو بھی ابھی تک اکیڈیمی میں چل رہی ہے مگر
دیکھئے کب تک چلتی ہے وہ مضمون کتاب کی صورت میں شائع ہو جاتا ہے
جو معلومات کے لئے کارآمد ضروری ہوتا ہے۔

جامعہ ملیہ اس درس گاہ کا وجود ترک موالات کی تحریک کا ممنون
ہے ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی اور شوکت علی نے مسلم
یونیورسٹی کو ترک موالات کی دعوت دی۔ کچھ طلبا کالج چھوڑ کر مولانا محمد علی
کے ساتھ چلے آئے۔ انھوں نے قومی نصب العین کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک
راستہ پر طالب علموں کو چلانا چاہا۔ ایک ادارہ "جامعہ ملیہ" کے نام سے علی گڈھ
میں قائم کیا جس کا مقصد مولانا محمود الحسن کے اس خطبہ سے کسی قدر واضح
ہوتا ہے جو ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو یوم تاسیس مناتے ہوئے پڑھا گیا۔ مولانا[1]

---
[1] ایک معلم کی زندگی۔ ص ۶۵-۱۶۶

اس خطبہ میں جامعہ اور مسلمانوں کی تعلیم کا مقصد ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں یہ مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد، کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا لب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور اُن عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنالیا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔"

علی گڈھ سے دہلی اوکھلے (جامعہ نگر) تک برابر جامعہ ملیہ نے اپنے نظریہ تعلیم میں رواداری اور آزاد خیالی کا پہلو مدنظر رکھا۔ خوش قسمتی سے اس ادارہ کو کام کرنے والے ایسے لوگ ملے جو قومی و سیاسی نقطۂ نگاہ سے نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ہندوستان میں ایک خاص مرتبہ و کردار کے مالک تھے، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری جس انجمن کے روح رواں ہوں وہاں ایثار و استقلال کے ساتھ اگر وسیع النظری نہ پائی جائے تو تعجب ہے آج بھی اس سلسلہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین و ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ جس قابلیت و ایثار کا ثبوت دے رہے ہیں وہ تمام ملک میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے۔

یہ ادارہ علاوہ تعلیم دینے کے اردو کی تصنیف و تالیف میں بھی خاص حصّہ لے رہا ہے۔ اس سلسلہ میں جامعہ ملیہ کی خاص توجہ افادی پہلو پر ہی

ہے مختلف و کارآمد موضوعات پر کتابیں لکھ کر اردو کے کمزور پہلو کو تقویت پہنچانے کی فکر رہتی ہے۔ ذریعۂ تعلیم اردو میں ہونے کی وجہ سے مغربی جدید خیالات کو بھی آسانی سے منتقل کرنے کی صلاحیت اردو میں پیدا کرنا اپنی جگہ پر اس ادارہ کا اہم کارنامہ ہے؛ جامعہ، اس ادارہ کا نہایت وقیع رسالہ ہے جس میں خاص علمی و ادبی مضامین نکلتے رہتے ہیں۔

سینما دور حاضر میں سینما کا رواج اتنا عالمگیر ہوگیا ہے کہ دلچسپی کے اعتبار سے جنت نگاہ و فردوس گوش کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس کو ایک ایسی مرکزیت حاصل ہوگئی ہے کہ شہروں کے لئے ایک درس گاہ بن گیا ہے جہاں عوام و خواص، عالم و جاہل بیک وقت فیضیاب ہوتے ہیں روزانہ سیکڑوں کی تعداد میں ذوق و شوق کے ساتھ لوگ آتے ہیں اور مختلف پہلوؤں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ لطف دل و دماغ کی تفریح کے علاوہ افسانہ نویسی، تنقید، اور فن کاری کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اردو کے بعض ممتاز ڈراموں نے سینما کی توجہ سے قبول عام کا شرف حاصل کیا۔ قصوں پر اپنی رائے کردار کے حرکات و سکنات پر تنقید، تصویر کشی اور واقعات کے متعلق آپس میں گفتگو یہ سب چیزیں ذہن کو بالیدگی و وسعت کی طرف بڑی آسانی سے پہنچاتی رہتی ہیں۔ کیونکہ عوام نے جمالیات و فن کاری کو بیک وقت مشاہدہ کرنے کا غالباً زرین موقع سینما میں پایا۔

سینما میں ذاتی تفریح مقصود ہوتی ہے اس لئے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے زبان و بیان کو بڑی غور سے دیکھا جاتا ہے۔ مفہوم و

نکات کو سمجھنے کے لئے پوری کوشش ہوتی ہے۔ الفاظ، اشعار، محاورات ذہن نشین ہوتے رہتے ہیں جس کا اثر روزمرہ کی گفتگو پر بھی پڑتا ہے اور اخلاق و عادات پر بھی۔ چونکہ سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ سماجی نقطۂ نگاہ بہتری کی طرف مائل ہے اس لئے سنیما کے افسانے بھی پستی سے ابھر کر بلندی کی طرف جا رہے ہیں عموماً ہندوستانی فلم زبان و خیال کے لحاظ سے اچھی آنے لگی ہے۔ لوگوں کا مذاق اپنے ماحول کے مطابق ہوتا جا رہا ہے اس لئے کہ بغیر بحث و مباحثہ کے سماج کی جکڑبندیاں اپنی خرابیاں تسلیم کرا دیتی ہیں۔ حالات و واقعات ذہن کو قیود سے بغاوت کی طرف مائل کرتے رہتے ہیں۔ سماجی تبدیلیوں سے لوگوں کو واقف و وابستہ ہونے کا یہاں کافی موقع ملتا ہے۔ ندرت و جدت کے اعتبار سے اردو زبان بھی یہاں اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اشاعت کا بہترین موقع پا کر مذاق نو کو سنوارنے کی کافی کوشش ہے عموماً با اثر جملے موقع و محل سے افسانوں میں پیش کئے جاتے ہیں اور بلا کسی تکلف کے اردو سے کم دلچسپی لینے والے بھی خوشی سے قبول کرتے ہیں۔
اس سلسلہ میں ابھی زباں کی درستی پر سنیما والوں کو کافی توجہ کی ضرورت ہے۔ عکاس خانہ میں اردو ابھی اتنی حسین نہیں نظر آتی جتنی واقعی وہ ہے غزل اور گیتوں میں زبان و مذاق کی پختگی تشنہ نظر آتی ہے۔ تشبیہہ و استعارے میں ضرور جدت و شگفتگی ہے لیکن ہماری زبان کی کمی اکثر ان کوششوں کو با اثر نہیں ہونے دیتی۔ کبھی کبھی ایک عیب اور بھی نمایاں ہوتا ہے۔ بعض وقت ایسے لوگوں کی زبان سے فارسی و عربی آمیز اردو سنائی جاتی

ہے جو اپنے ماحول و کردار کی مجموعی حیثیت سے صرف ہندوستانی یا خالص اردو بولنے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ اس کی تلافی اسی وقت ممکن ہے کہ جب اردو والے خود کمپنی قائم کریں۔

ہمیں خوشی ہے کہ فضلی برادران نے بنگال میں اور امتیاز علی تاج نے پنجاب میں ان خرابیوں کو دور کرنے کے خیال سے فلم کی درستی کی طرف خاص توجہ کی ہے اس کے علاوہ اور بھی بعض کمپنیوں نے مشہور اہل قلم کی خدمات حاصل کر لی ہیں چنانچہ منجملہ ان لوگوں کے جوش، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، سدرشن، شاہد لطیف، آرزو، کمال امروہی واقف مرادآبادی خواجہ احمد عباس، عصمت شاہد لطیف وغیرہ کسی نہ کسی حیثیت سے مختلف فلموں کو اپنی دماغی کاوشوں سے سرفراز کرتے رہے ہیں امید ہوتی ہے کہ ان حضرات کی موجودگی سے فلم اور اردو دونوں کو جلد ہی ایک خاص فروغ حاصل ہوگا لیکن ۱۹۵۶ء میں جب ہم سہراب مودی کی پیش کردہ تصویر "مرزا غالب" دیکھتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ اردو کا مستقبل مایوس کن کے بجائے ہمت افزا ہے۔

ریڈیو

سینما سے بھی زیادہ ریڈیو نے اردو کے علمی رجحان کی نشوونما میں مدد کی اس کے موضوعات بھی سینما سے زیادہ ہیں اور حلقہ اثر بھی۔ اس کا دائرہ شہر سے بڑھ کر اب دیہات تک پھیل رہا ہے سینما کی طرح اس میں انفرادی خرچ کا سوال بھی نہیں۔ ایک شخص آلہ نشر خرید لیتا ہے یا گورنمنٹ اپنے خرچ سے مہیا کرتی ہے اور ہر

ایک شخص مفت سن سکتا ہے۔

ریڈیو نے مختلف عنوانات پر تقریروں کا انتظام کرکے اردو میں نئے الفاظ و نئی اصطلاحات کا سامان پیدا کر دیا۔ اور چونکہ ہر دلعزیزی و ہمہ گیری حاصل کرنے کا جذبہ پیش رہتا ہے اس لئے جہاں تک ہوسکتا ہے الفاظ کے ترجمے عام فہم زبان میں پیش کیا کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ریڈیو کا وہ پہلو قابل قدر ہے کہ جب وہ خالص علمی و ادبی موضوعات پر خاص خاص لوگوں سے تقریر کراتا ہے۔ تقریر کرنے کے لئے چونکہ وقت بہت کم ہوتا ہے اس لئے مقرر بھی اختصار و جامعیت کو مدِ نظر رکھتا ہے اور بڑی محنت سے اپنی تقریر تیار کرکے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور اب علمی مباحثوں کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے جس میں ایک شخص کسی دوسرے شاعر یا ادیب کے کلام پر اعتراض کرتا ہے اور دوسرا جواب دیتا ہے اس طرح پندرہ ۱۵ منٹ میں شخص یا کلام زیر بحث کی خصوصیات سننے والوں کے سامنے آسانی و دلکشی سے آجاتی ہیں۔

ریڈیو میں مشاعروں کے اہتمام نے دلچسپی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ ملک کے قابل قدر شعرا کو اپنے خرچ سے ایک جگہ ایک وقت پر اکٹھا کرکے ہر شخص کو موقع دیا جاتا ہے کہ موجودہ شعرا کا کلام خود شاعر کی زبان سے گھر بیٹھے سن سکے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ریڈیو میں اردو کے سر برآوردہ شعرا و ادیب کا کبھی کبھی 'دن' منایا جاتا ہے شاعر یا نثار کے کلام پر مختلف حضرات اپنی اپنی رائے پیش کرتے ہیں جس سے یہی نہیں

ہوتا کہ سننے والوں کو فائدہ پہنچے بلکہ تنقید کا ایک مجموعہ ہمیشہ کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

موجودہ جنگ کی روزانہ خبریں جو ہندوستان میں غیر ممالک سے آیا کرتی ہیں ان سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ باہر والے بھی ہمارے ملک کی زبان اردو ہی تسلیم کرتے ہیں۔ برلن، انقرہ، طہران، کابل اور لندن وغیرہ سے جو خبریں نشر کی جاتی ہیں ان کی زبان اچھی اردو کا نمونہ ہے اور چونکہ خبروں کا سننا عام دلچسپی کا باعث ہے اس لئے ہر شخص خواہ اردو سے دلچسپی نہ بھی رکھتا ہو اس زبان کو سمجھنے کی کوشش میں اردو سے مانوس ہو جاتا ہے۔

ریڈیو کی گوناگوں دلچسپیوں نے ایک زمانہ کو اپنا گرویدہ کر رکھا ہے اور چونکہ اس کے ہر پروگرام کو آواز و الفاظ سے تعلق ہے اس لئے ہر موقع پر زبان کی لطافتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ موسیقی، مکالمہ، خبر بیانات میں بھی زبان کی اہمیت پر نظر رہتی ہے تاکہ مقصد پر اثر ہو جائے اور یہ چیز سننے والوں کے علمی رجحان کی سطح در پردہ بلند کرتی ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر شخص کے علم و فہم میں اضافہ ہوتا ہے۔

تعلیمی رجحان :- عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کا ذریعہ تعلیم قرار پانا علم و تعلیم کے لئے ایک نیا باب تھا۔ اپنی زبان میں درس لینے کی آسانیوں نے دل و دماغ کے لئے ایک ایسا سکون پیدا کرا دیا جو اس سے پہلے تعلیمی دنیا کو حاصل نہ تھا۔ غیر زبان میں اظہار خیال اور تحریر کی دقتیں

ہندوستانی طلبا، معلمین دونوں کے لئے ہر وقت کی کوفت تھیں۔ زبان کی دشواریاں ذہن ونطق پر بارگراں تھیں۔ اب یہ مصیبت دور ہوگئی۔ اردو میں پڑھنا پڑھانا انگریزی زبان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ آسان وزود فہم ہوگیا۔

حیدرآباد کے باہر بھی ہندوستان کے دوسرے صوبوں نے اس ذریعہ تعلیم کی تقلید شروع کی ہے۔ اپنی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دی جانے لگی اور بعض بعض صوبے تو ثانوی تعلیم بھی اپنی ہی زبان میں دنیا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ صوبہ متحدہ آگرہ واودھ میں سر رشتہ تعلیم اسی پر زور دے رہا ہے کہ یہی رویہ اختیار کیا جائے۔ جامعہ ملیہ تو ابتدا ہی سے اپنے یہاں ہر درجہ کی تعلیم اردو ہی میں دے رہا ہے۔ علاوہ اور باتوں کے اس سے زبان کا ذخیرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے۔ نئے الفاظ ومحاورات ہماری زبان میں تیزی کے ساتھ آرہے ہیں۔ تاریخ، جغرافیہ، سائنس وغیرہ پر برابر اردو میں کتابیں تصنیف یا ترجمے کے ذریعہ سے آرہی ہیں۔ کاش حیدرآباد کی طرح اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بھی مادری زبان ہو جائے تو اور زیادہ تیزی کے ساتھ بلند پایہ کتابیں بھی ہر جگہ اپنی زبان میں منتقل ہو جائیں۔

اس رویّہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خط وکتابت، دفتری کارروائی غرض کہ جملہ باتیں اردو ہی میں ہوتی رہتی ہیں جس کا اثر یہ ہے کہ زبان کی تمام منتشر صلاحیتیں یک جا ہو کر اس کی اہمیت کو روز بڑھاتی ہیں۔

عہد جدید میں بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ نصاب تعلیم مرتب کرتے وقت

بچوں کے مزاج و ذہن کا خیال مدنظر تھا۔ موجودہ دور میں اور زیادہ
توجہ کی گئی۔ ان کی نفسیاتی نشوونما کو دیکھتے ہوئے ایسی صورتیں تعلیم کے لئے
اختیار کی گئیں جو ذہن کی بالیدگی میں معاون ہوں۔ مانٹی سوری، طریقہ تعلیم
میں اس کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ بچوں کو کھیل کود ہی میں فطری طور پر
سبق دئے جائیں جہاں تک ممکن ہو کتابوں سے گریز کیا جائے تاکہ کتابی الفاظ
ذہن پر بار نہ ہوں اور بچوں کی معلومات میں آسانی سے اضافہ بھی ہوتا جائے۔

حال ہی میں ذاکر حسین کمیٹی نے اس طریقہ تعلیم میں بھی ترمیم کی قابل قدر
کوشش کی اور ایک نیا اصول دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کمیٹی کی کاوشوں
کو مرکزی حکومت نے مستحسن سمجھا اور صوبہ متحدہ نے اس کے نفاذ کا حکم بھی
جاری کر دیا۔ مانٹی سوری طریقہ تعلیم میں صنعت و حرفت سے کوئی مدد نہیں لی
گئی تھی۔ اس اصول میں تعلیمی رجحان کو آسان اور دلچسپ بنانے کے لئے
صنعت و حرفت کا سہارا تلاش کیا گیا جس سے ضمنی طور پر کسب معاش میں
بھی آسانی ہو سکتی ہے۔

اس اسکیم کو پسند کرنے کے بعد گورنمنٹ نے عمل کرنے کے لئے دو درس
گاہیں بیسک ٹریننگ کالج کے نام سے کھولیں۔ جن کے لئے بنارس والہ آباد
منتخب ہوئے۔ لڑکیوں کے لئے بنارس اور لڑکوں کے لئے الہ آباد۔ لیکن
بعد میں دونوں الہ آباد ہی میں کر دئے گئے۔ ایسے دونوں کالج ڈاکٹر عباد الرحمان
خاں کی قابل قدر رہنمائی میں کام کر رہے ہیں۔ پڑھانے والے تعلیم حاصل کرنے
کے بعد ہر جگہ مانگے جا رہے ہیں۔ دوسرے صوبوں اور ریاستوں میں اس

طریقہ تعلیم کے افادی پہلو کی وجہ سے اس کو رائج کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ریاست کشمیر نے بھی اس طریقہ تعلیم کو اپنے یہاں اختیار کرنے کی فکر کی ہے اور ریاست رام پور نے بھی یہی سلسلہ شروع کر دیا ہے۔

تعلیمی رجحان کے بڑھنے کی ایک اور وجہ بھی قابل ذکر ہے یونیورسٹیوں اور گورنمنٹ نے طریقہ تعلیم کے اصول سے واقف کرانے کے لئے مختلف مقامات پر مخصوص درس گاہیں کھولیں اس سلسلہ میں سب سے اونچا درجہ M. ED. کا ہے جو الہ آباد یونیورسٹی میں چار سال سے قائم ہے۔ اس سے نیچے درجوں کا نام L.T. یا B.T. تھا اور اس سے کم معیار کے طلباء کے لئے C.T. اور اردو و ہندی داں طلباء کے لئے نارمل اسکول یہاں سے کامیابی کی سند لینے کے بعد کچھ تو روپیہ کی ضرورت سے مجبور ہو کر اور کچھ ذہنی ترقی اور اصول تعلیم کے فروغ کے لئے لوگوں نے طریقہ تعلیم کی طرف زیادہ توجہ کی۔ کتابیں بھی پڑھیں اور سوچا بھی۔ ہندوستان سے باہر مغرب کی درس گاہوں میں بھی نظام تعلیم کے سلسلہ میں مطالعہ کی غرض سے گئے اور نمایاں ترقیاں حاصل کیں۔

ان لوگوں میں خواجہ غلام السیدین صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پہلے آپ مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج میں پرنسپل تھے۔ وہاں سے آپ کی خدمات ریاست کشمیر نے بحیثیت ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم حاصل کیں یہاں کشمیر میں تین سال تک کامیابی سے کام کرنے کے بعد آپ کی خدمات ریاست رامپور نے حاصل کر لیں جہاں وزیر تعلیمات کی حیثیت سے اپنے

فرائض انجام دئے اور اب مرکزی حکومت کی وزارت میں بحیثیت نائب معتمد کے کام کر رہے ہیں۔ آپ نے اصول تعلیم پر نہایت مستند کتابیں لکھی ہیں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان کے باہر بھی خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اب ہمارے ملک میں طریقہ تعلیم کی طرف کافی توجہ ہے فلسفۂ تعلیم، مبادیات تعلیم جیسے اہم موضوع پر لوگ قلم اٹھاتے ہیں اور اپنے ملک کی جملہ خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے حسب ضرورت اصول تعلیم مرتب کرنے کی برابر فکر کیا کرتے ہیں چنانچہ ترجمہ اور تصنیف دونوں طریقوں سے مستقل کتابیں اس موضوع پر اردو میں آگئی ہیں مثال کے لئے چند کتابوں کا نام لکھ دینا بیجا نہ ہوگا 'اصول تعلیم' مصنفہ خواجہ غلام السیدین۔ 'نظام تعلیمات' مصنفہ ڈاکٹر ضیاء الدین 'مصلحان تعلیم' از فیض احمد صدیقی۔ 'تعارف طریقہ تعلیم' مصنفہ شری نرائن چترویدی و مترجمہ علی احمد جعفری، ان کے علاوہ ایک اور طریقہ سے بھی اردو اپنے اس رجحان کے بڑھنے کا ثبوت دے رہی ہے۔ متعدد رسالے ایسے نکلتے ہیں جن کا خاص مقصد اصول تعلیم کا فروغ ہے۔ مثلاً 'نئی تعلیم' جامعہ ملیہ دہلی سے اور 'ایجوکیشنل گزٹ' الہ آباد سے نکل رہے ہیں۔ اسی طرح کے کئی ایک مخصوص رسالے اور بھی ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اردو اور بچوں کا لحاظ رکھتے ہوئے صرف و نحو کی کتابیں بھی تیار کی گئیں اُبتک خالصاً قواعد فارسی کے اصول پر مرتب کئے جاتے تھے۔ اب اردو کی اہمیت

اور انفرادیت کا اندازہ کرکے فارسی کی تقلید کم کردی گئی بچوں کے لئے ایسی کتابیں تیار کی گئیں جو اردو کی جملہ خصوصیات اپنے دامن میں لئے ہوں اور لڑکوں کے لئے آسان بھی ہوں ایسی کتابوں میں ڈاکٹر عبدالحق کی 'قواعد اردو' کافی مشہور ہے۔ اس طرح ملک کے تعلیمی رجحانات کے سلسلہ میں اردو نے بھی کافی ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔

تنقیدی رجحان - عہد حاضر صحیح معنوں میں 'دور تنقید' سمجھا جاتا ہے صرف ادب ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر انتقادی نظر ڈالی جاتی ہے۔ سائنس کی روز افزوں ترقی نے ہر چیز کی حقیقت پر غور کرنے کی ذہنیت مرتب کر دی ہے۔ حسن و قبح کے نئے نظریے نئے اصول قائم ہو گئے ہیں۔ تنقید کے درجے مقرر کئے گئے ہیں۔ اقسام بتائے گئے ہیں تخریبی۔ تعمیری نقد و تبصرہ کی ماہئیت و اہمیت پر زیادہ توجہ جانے لگی ہے ایسے ماحول میں اردو ادب بھی قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ تنقید کے مختلف نظریے اس کے چلانے میں کارفرما ہیں

دور جدید میں آزاد، حالی اور شبلی وغیرہ نے جو کچھ نقد الادب کی طرف توجہ کی، اصول بتائے یا تنقید پیش کی وہ دور حاضر کے لئے ایک خاکہ ہو گیا۔ اب اس کی تفصیلات کی بھی خانہ پری ہونے لگی ہے۔ عمق و وسعت سے کام لیا جا رہا ہے۔ ادب برائے ادب، کے نظریہ کے علاوہ دوسرے نظریوں سے بھی ادب کو جانچا جا رہا ہے۔ 'ادب برائے زندگی' کے اصول پر بھی اردو کو تیزی کے ساتھ لے چلنے کی فکر ہو رہی

ہے۔حیات کی مختلف و متعدد قوتوں کا جائزہ لینا تنقید کا خاص کام و ہر دلعزیز معیار ہو گیا ہے۔ زندگی کی پیچیدہ راہوں کو جذباتی نگاہ سے کم افادی اور واقعاتی نقطۂ نظر سے زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ فکری عنصر فن تنقید میں تیزی سے پیدا ہو رہا ہے۔ ترقی پسندی کے مختلف معنوں پر غور کیا جا رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ زبان و محاورات پر زیادہ توجہ نہیں کی جاتی۔ فن کاری و دور رسی پر البتہ کافی زور ہے اور ان ہی مختلف خیالات کی بنا پر ادب کی تخلیق بھی ہو رہی ہے غرضکہ تنوع و مغز کے لحاظ سے آج کا تنقیدی رجحان ہر دور کے سرمایہ و میلان سے برتر ہے۔

ہمارے فن تنقید پر بھی مغربی اثر غالب ہے۔ مشرق سے بہت کم اس صنف کو فائدہ پہنچایا جا سکا۔ اول تو یہاں اس کا ذخیرہ قلیل اور دوسرے نئے نظریوں کا فقدان اور پھر علوم مشرق سے عدم واقفیت اور علوم مغرب سے نسبتاً زیادہ دلچسپی یہ جملہ خصوصیات اردو تنقید کی رگوں میں زیادہ تر مغربی خون دوڑا رہی ہیں۔ انتقادی اصول سے مختلف لوگوں کے کلام پر ایسی ناقدانہ بحثیں کی گئی ہیں کہ مستقل کتابوں کا وجود ظہور میں آگیا ہے جو کئی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ روح تنقید تنقیدی مقالات، اردو شہ پارے، جدید اردو شاعری گنجینۂ تحقیق، ادب اور زندگی، سیر المصنفین، ارباب نثر اردو، اردو شاعری پر ایک نظر، اردو تنقید پر ایک نظر، تاریخ و تنقید، تنقیدی جائزے، ترقی پسند ادب،

ادب اور انقلاب وغیرہ اس سلسلہ کی مشہور و کارآمد کتابیں ہیں ۔ کچھ ایسی بھی تصانیف ہیں جن میں اصناف سخن کی نشوونما اور ذہنی ترقی پر رائے زنی کی گئی ہے ۔ ان کتابوں میں شعر الہند، منشورات، اسالیب بیان، افسانہ نگاری، اردو میں ڈرامہ نگاری کیفیہ وغیرہ نہایت دلچسپ و پُر از معلومات ہیں ۔

"ہماری شاعری" لکھ کر ادیب نے ایک بڑی کمی پوری کر دی ہے "مقدمہ شعر و شاعری" میں حالی نے اردو کے صرف معائب پر تنقید کی تھی، ضرورت تھی کہ محاسن پر بھی کوئی قلم اٹھائے ورنہ تصویر کا صرف ایک پہلو ــــــ اور وہ بھی تاریک نظر آتا تھا ۔ ادیب نے دوسرا رُخ پیش کرنے کی سعی مشکور کی ۔ بلکہ اس کی خوبیاں بھی ذہن نشین کرا دیں علاوہ اس کے بعض اہم فنی اصطلاحات کی خصوصیات پر بھی قابل قدر بحث کی ۔ تاکہ جوش، سادگی، تڑپ وغیرہ کا مفہوم واضح ہو جائے ۔

اس سلسلہ میں اس رجحان کا بھی ذکر ضروری ہے کہ ناقدانہ انداز میں اس دور نے کئی ایک اردو ادب کی تواریخ پیش کیں اور خاص طور پر یہ بتانا ہے کہ اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی تاریخیں لکھی گئیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اردو سے دلچسپی لینے والوں کا دائرہ کتنا وسیع ہو گیا ہے ۔ ان میں رام بابو سکسینہ کی A History of Urdu Litrature ۔ اگرام بیلی کی History of Urdu Literature دیوانہ کی Charcteristics & Tendencies of Modern Urdu Poetry .

کافی مشہور کتابیں ہیں! ان کے علاوہ ڈاکٹر عبداللطیف کی دو کتابیں Influence of Ghalib اور English Literature on Urdu Literature اور عبداللہ انور بیگ کی Poet of the East بھی تنقیدی نقطۂ نظر سے خاص کارنامے ہیں۔ ان کتابوں پر رائے زنی کرنا فی الحال ہمارے دائرہ بحث سے الگ ہے یہاں پر بتانا یہ تھا کہ اردو کی ہمہ گیری اس دور میں مسلم ہو گئی ہے اس سے دلچسپی لینے والے خواہ ہندوستان میں ہوں یا انگلستان میں اس کی اہمیت سے متاثر ہو رہے ہیں اور اپنے تاثرات کا عملی ثبوت بھی تھوڑا بہت دیتے رہتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں خطبات و مقالات گارساں دی تاسی کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ اپنے وجود کے لحاظ سے یہ عہد قدیم کی چیزیں ہیں لیکن اردو میں ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۵ء میں شائع ہونے کے لحاظ سے دور حاضر میں جگہ پا سکتی ہیں۔ یہ کتاب مشہور مستشرق گارساں دی تاسی کے ان خطبات اور مقالات کا مجموعہ ہیں جن کو فرانس میں ایک علمی انجمن کے سامنے وہ ہر سال پیش کرتا تھا یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی قابل قدر معلومات کا ذخیرہ ہیں اور اس عہد کی ادبی تاریخ بھی جس کے کارناموں کا پتہ اور کسی ذریعہ سے بمشکل معلوم ہو سکتا تھا۔

گارساں دی تاسی کا ہمیں ممنون ہونا چاہیے کہ باوجود فرانس میں رہنے کے ہماری زبان سے اس نے غیر معمولی دلچسپی لی۔ اردو ہندی کے اخبارات، رسائل، مصنفین، تذکرے اور دوسرے کارناموں پر ناقدانہ انداز

میں برابر روشنی ڈالتا رہا۔ خطبات کا سلسلہ ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۸۶۹ء تک قائم رہتا ہے۔ اردو کی رفتارِ ترقی کو بڑے غور سے گارساں دی تاسی نے دیکھا ہے۔ اس کی روز افزوں ترقی، وسعت، ہر دلعزیزی کا تاریخ وار جائزہ لینا اور رجحانات پر روشنی ڈالنا اس عہد میں آسان کام نہ تھا ان خطبات کی روشنی میں اردو کے کارنامے ہمیشہ سے زیادہ اجاگر و باوقعت نظر آتے ہیں۔ تاریخی مواد تلاش کرنے والے کو ایسی چیزیں و تفصیلات مل جاتی ہیں جو نایاب معلوم ہوتی ہیں۔

اردو میں بھی کئی ایک تاریخیں آبِ حیات کے بعد سے لکھی جا چکی ہیں شمال و جنوب دونوں حصوں کے کارنامے انتقادی و تاریخی پہلو سے جانچے جا رہے ہیں۔ دکن میں اردو[1]، اردوئے قدیم[2]، پنجاب میں اردو[3]، مختصر تاریخ ادبِ اردو[4]، داستانِ اردو[5]، شعر الہند[6]، داستانِ تاریخِ اردو[7]، وغیرہ ایسی کارآمد کتابیں ہیں جو باوجود خامیوں کے گذشتہ دور کے اس رجحان پر اضافہ ضرور ہیں۔

دورِ حاضر میں ڈاکٹر مسعود حسن خاں نے "تاریخ زبان اردو" کے نام سے اردو کی ابتدائی نشو و نما کو خوبی سے پیش کیا۔ احتشام حسین نے ہندی میں اردو کی تاریخ لکھ کر ایک نئی بات پیدا کی۔

ان کتابوں کے علاوہ بھی تنقید کا سلسلہ رسالوں میں برابر جاری رہتا

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ [2] شمس اللہ قادری۔ [3] پروفیسر محمود شیرانی۔ [4] اعجاز [5] نواب نصیر حسین خیال [6] مولانا عبدالسلام ندوی۔ [7] پروفیسر حامد حسین قادری۔

ہے جن کو اگر یک جا کر لیا جائے تو ایک زبردست کارنامہ تیار ہو سکتا ہے۔
ان تنقیدی مقالات میں بعض اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ تنقید عالیہ تک ان کا مرتبہ پہنچ جاتا ہے نیازؔ، فراقؔ، مجنوںؔ، عندلیبؔ، شادانی، احتشام، آل احمد سرور، اختر اُرینوی، سبط حسن، خواجہ غلام السیدین، زورؔ، تاثیرؔ، اختر رائے پوری، اختر علی تلہری وغیرہ اس سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔
ڈاکٹر عبد الحق کے وہ مقدمات جو انجمن ترقی اردو کی کتابوں کے سلسلہ میں ناقدانہ حیثیت سے وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں اپنی نوعیت و مواد کے لحاظ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ تصنیف زیر بحث کے مصنف یا مولف کے زمانہ کا رجحان لفظوں اور محاورات کی نشوونما قصہ یا مواد کے ماخذ کا پتہ، مضامین کے امتیازی پہلو ہیں۔ یہ مضامین اب دو جلدوں میں "مقدمات عبد الحق" کے نام سے شائع بھی ہو گئے ہیں۔ اسی طرح سلیمان ندوی کے مختلف مضامین "نقوش سلیمانی" کے نام سے چھپ گئے ہیں جو طرز استدلال تنوع اور وسیع مطالعہ کے نہایت اچھے نمونے ہیں۔

اس دور کا یہ کارنامہ بھی تنقید کے میدان میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کہ مختلف شعرا و نثار کے کلام پر ناقدانہ انداز میں مستقل کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ جن سے مصنف اور اس کے کلام کی پوری حقیقت نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔ سلیمان ندوی کی تصنیف "عمر خیام" غالباً اردو میں خیام پر بہترین کتاب ہے، انیسؔ، دبیرؔ، امیرؔ، داغؔ، غالبؔ، مومنؔ، حسرتؔ وغیرہ کے علاوہ اقبالؔ پر جو کتابیں، جوہر اقبال، روح اقبال وغیرہ کے نام سے شائع ہوئی

ہیں۔ ان سے اس دور کے تنقیدی رجحان کی وسعت و دلچسپی کا آسانی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

عہد حاضر میں تنقیدی نقطۂ نگاہ کے لحاظ سے دو اسکول ہو گئے ہیں ایک کا نظریہ یہ ہے کہ فن برائے فن اور دوسرے کا کہنا ہے کہ فن برائے حیات، اول الذکر کا مقولہ یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر چیز میں افادی پہلو بھی ہو۔ جمالیاتی و فنی پہلو خود اپنی جگہ پر احساسات و تاثرات کی دنیا لئے ہوتا ہے۔ حسن ترتیب یا تکمیل فن، روحانی مسرت کا ذریعہ بن جاتا ہے جو ایک فن کار کے ذوق کو انتہائی عروج پر پہنچا کر حیات جاوید کا سرچشمہ ہو جاتا ہے اور یہی فن کی سب سے بڑی قیمت ہے کہ اپنے خدمت گزار کو غم دنیا سے نکال کر اپنی تکمیل میں جذب کر لے۔

دوسرے اسکول کا خیال ہے کہ زندگی میں انسانی عمل کا کوئی مقصد ہوتا ہے اور چونکہ ادب زندگی سے براہ راست متعلق ہے اس لئے اُسکا بھی کوئی مقصد ہونا چاہئے اسے صرف فنی تکمیل کے لئے وقف کر دینا تنگ نظری و فراریت کی دلیل ہے۔ قدرت نے کوئی چیز دنیا میں بغیر مقصد کے نہیں پیدا کی اور انسان قدرت کا سب سے بڑا شاہکار ہے اس کی پیدا کی ہوئی چیز بھی بغیر کسی مقصد کے نہ ہونا چاہیے۔ تکمیل فن ایک مقام ہونا چاہیے نہ کہ منزل۔ دنیا کی ہر شئے انسانی تعمیر کا سہارا ہے اور جب سماج کی کشتی منجدھار میں ہو تو پھر گرد و پیش کے ادنیٰ و اعلیٰ ایک ایک عنصر کو پتوار بنا لینا چاہئے۔ گرداب کی خوفناک موجوں سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ راہ فرار کیسی

ہی دلکش ہو تجدید حیات کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔" کبھی موج سے لپٹنا، کبھی کھیلنا بھنور سے" ایک ڈوبنے والے کا مشغلہ نہ ہونا چاہیے۔ ایسے وقت میں لہروں کے ترنم اور ساحل کے حسن پر مفتون ہونا موت کا بلانا ہے ہمت مردانہ ایسے عالم میں سپردگی کی اجازت نہیں دیتی وہ مردانہ وار جدوجہد کے لئے ابھارتی ہے۔

پہلا اسکول اپنے اصول تنقید میں قدامت پرست ہے وہ الفاظ و زبان کے حسن پر ہر شئے کو نثار کر دینا جائز سمجھتا ہے۔ جمالیاتی اور وجدانی ذوق کی آڑ میں فراریت اور رومانیت کا علمبردار ہے۔ تخئیل، حقیقت و حیات سے اسے زیادہ سروکار نہیں۔ وہ اپنی تنقید پیش کرتے وقت چند اشعار سے کر معنی و بیان پر رائے زنی کرتا ہے۔ الفاظ کی خوبی و خرابی محاورات کی بندش پر زیادہ زور دیتا ہے۔ خیالات کی بلندی یا منشا کے افادی پہلو پر یونہی تبصرہ کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ مصنف کے نظریۂ حیات اور نفسیاتی تحلیل کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا۔

دوسرا طبقہ سب سے پہلے افادی[1] پہلو پر نظر دوڑاتا ہے وہ خیالات کی ندرت و عمق کو اچھی طرح سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے شاعر یا ادیب کے نفسیاتی پہلو پر غور کرتا ہے اس کے مقصد کی چھان بین کرتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ فنی نکات کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ وہ معنی و بیان کے جملہ حقوق کو مدنظر رکھتا ہے۔ تنقید کے وقت ان چیزوں کو بھی غور سے دیکھتا ہے اور کافی اثر لیتا ہے۔ لیکن یہیں رک نہیں جاتا وہ قنوطیت سے گھبراتا ہے۔

---

[1] اسی نظریہ کے تحت میں اختر انصاری صاحب کا ایک کتابچہ "افادی ادب" پٹنہ سے شائع ہوا ہے۔

تمام کلام پر اس کے غلبہ کو بیماری سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ ادب کو حقیقت اور واقعیت سے الگ نہیں کرنا چاہتا۔

اس اسکول میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اردو ادب کا مطالعہ اچھی طرح نہیں کیا اسی لئے ان کو اس سے وہ ہمدردی بھی نہیں جو ہونی چاہیئے۔ وہ ذہنی طور پر انگریزی ادب سے اتنے مرعوب و متاثر ہیں کہ اس کے ہر اصول کو بنیادی و تفصیلی امور میں بھی انگریزی ادب کی کسوٹی پر جانچنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام اردو ادب میں خرابی ہی خرابی دیکھتے ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ تنقید کے اساسی اصول ہر ادب میں بڑی حد تک ایک ہو سکتے ہیں لیکن تفصیلات میں فرق ہونا ضروری ہے ہر ملک کا ادب اپنی روایات، طرز معاشرت۔ آب و ہوا اور کشمکش حیات کے اثر سے طرز تخئیل و نکتہ رسی میں دوسرے ملک کے ادب سے الگ ہوتا ہے۔ اس کی تمثیلات، رمزیات، استعارات وغیرہ مختلف و منفرد ہوتے ہیں ان کے سمجھنے کے لئے ادب کے ارتقائی پہلو اور قوم کی سیاسی و معاشی زندگی اور فلسفۂ حیات کا مطالعہ نہایت ضروری ہے جو لوگ اس بنیادی اصول سے بے نیاز ہو کر ادب پر تنقید کرتے ہیں وہ گویا ساحل پر کھڑے ہو کر سطحی نظر سے دریا کی گہرائی اور اس کے رازہائے سربستہ کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایسی تنقید میں پروفیسر کلیم الدین کی کتاب اور مثال، اردو تنقید نگاری میں بہت نمایاں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی ادب سے متاثر

ہو کر انھوں نے اردو ادب کا جائزہ لینا شروع کیا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے ہر شاعر میں خرابی نظر آئی اردو کی ہر صنف داغ دار دکھائی دی کاش وہ اردو کی تلمیحات، رمزیات و استعارات کو مشرقی انداز سے سمجھنے کی کوشش کرتے خواہ فن تنقید کے اصول کو سمجھتے یا نہ سمجھتے۔

تنقید کا نیا رجحان ادب کو عام زندگی سے قریب تر کرنے کی کوشش کر رہا ہے اسے اپنے سماجی تعلقات کی درستی کا آلہ بنانا چاہتا ہے۔ مبالغہ اور رسمی باتوں سے گریز کرنا چاہتا ہے۔ بیباکی و صاف گوئی کی قدر و قیمت اس کے یہاں بہت زیادہ ہے۔ وہ انسانی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے زندگی کا معیار قائم کرتا ہے۔ وہ حسن و عشق کے معاملات میں پہلے سے کچھ الگ ہے۔ جنسی خواہشات کو دبے الفاظ میں نہیں بیان کرنا چاہتا خوبصورتی کے ساتھ صاف صاف اس کی اہمیت و فائدہ بتا دیتا ہے۔ معشوق کو ہر جگہ ظالم و بیوفا رسمی طریقہ پر نہیں کہنا چاہتا۔ اس کی وفاؤں اور مجبوریوں کو بھی سراہتا ہے اپنی خامیوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس کے ماننے والے یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات صرف حسین نہیں بلکہ اس میں بدصورتی اور مفلسی کے داغ بھی ہیں۔ اور ادب میں ان چیزوں کا ذکر نہ کرنا حقائق سے گریز ہے حسن و عشق کے افسانوں اور مسرت و شادمانی کے ترانوں کے علاوہ ایک ادیب کو مفلسی و تکلیف کی چیخوں اور موت کی سسکیوں کا بھی احساس ہونا چاہیے اور اسے ادب سے وہ کام لینا چاہیے جس کا وہ اہل ہے تاکہ غلط نظام کو ختم کر سکے۔

ان سب باتوں کے باوجود ابھی اردو میں تنقید عالیہ کی بہت کمی ہے

غالباً اس کی وجہ بلند پایہ ادب کا فقدان ہے۔ موجودہ دور نے اردو ادب کا پایہ ضرور بلند کیا لیکن ابھی منزل مقصود کوسوں دور ہے۔ غیر فانی وہمہ گیر ادب مجموعی حیثیت سے بھی اور تنوع کے اعتبار سے بھی کم پیدا ہوا اور فی الحال کوئی قوی امید بھی نہیں اس لئے کہ جس دور سے ہمارا ادب گزر رہا ہے وہ انتہائی انتشار و انقلاب کا زمانہ ہے۔ ایسی ہل چل میں کسی زبردست ادب کی تخلیق محال نہیں تو دشوار ضرور ہے اور جب کوئی بھی مہتم بالشان ادبی ذخیرہ سامنے نہ آئے گا تو ظاہر ہے کہ بلند پایہ نقد و تبصرہ بھی آسانی سے نہیں پیدا ہو سکتا۔

سیرت نگاری موجودہ دور میں سیرت نگاری کا رجحان کسی قدر وسیع ہو گیا ہے ہندوستان اور ہندوستان کے باہر بھی اکثر قابل قدر و صاحب کمال کی سوانح عمری اردو میں لکھی گئی۔ اس سلسلہ میں ترجمہ و تالیف و تصنیف ہر ایک کا دروازہ کھلا رہا۔ رسالوں کے خاص نمبر بھی اکثر لوگوں کے حالات زندگی پیش کرتے رہے جیسے زمیندار کے پیغمبر نمبر میں رسول خدا کے سوانح وغیرہ زیب رقم کئے گئے۔ نگار کے ظفر نمبر، مومن نمبر، مصحفی نمبر، نظیر نمبر، اور ریاض نمبر سب کے سب ان شعرا کے حالات و کارناموں پر مبنی ہیں۔ غرضکہ دنیا پر چھا جانے والی ہستیوں پر خواہ وہ کہیں کی ہوں اردو سیرت نگاری کی نظر پہنچتی رہتی ہے۔

تصنیف کے سلسلہ میں ان سوانح عمریوں کا بھی ذکر ضروری ہے جو قومی و ملکی خدمات ادا کرنے والوں کے ایثار و قابل قدر خصوصیات کو

مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئیں، مثلاً مولانا محمد علی، کمال اتاترک، نادر شاہ، اسٹالین، لینن، گاندھی جی، محمد علی جناح وغیرہ کی حیات و کارناموں پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے پوری پوری کتابیں لکھ دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی انگریزی کی سیریز کی طرح سوانح حیات کا اردو میں سلسلہ قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ چیز اردو میں نئی نہیں شبلی نے سلسلہ آصفیہ اس سے پہلے قائم کر کے الفاروق، النعمان، المامون وغیرہ لکھ کر ابتدا کر دی تھی اسی نقش قدم کو زیادہ اُجاگر کیا گیا اور یہ رجحان بھی تیز ہوتا جارہا ہے۔

اولاد حیدر فوق بلگرامی نے بھی ایک سلسلہ میں رسول و اولاد رسول کی سوانح عمریاں کئی جلدوں میں مرتب کر کے شائع کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ دار المصنفین (اعظم گڈھ) کا وہ سلسلہ جن میں صحابہ کرام کے کارنامے و سوانح حیات دس جلدوں میں مرتب کئے گئے ہیں اور سر سید رضا علی کی خود نوشت سوانح عمری "اعمال نامہ" موجودہ اردو سیرت نگاری میں قابل قدر اضافہ ہیں۔

ترجمہ کے ذریعے سے بھی کئی عمدہ کتابیں اردو میں منتقل ہوئیں مثلاً گاندھی جی کی خود نوشت سوانح عمری، تلاش حق، کے نام سے جامعہ ملیہ نے اردو کو دی اور جواہر لال نہرو کی 'میری کہانی' بھی۔ یہ مذاق اتنا بڑھ رہا ہے کہ بعض انگریزی 'سلسلہ کا' ترجمہ اردو میں کیا جا رہا ہے مثلاً How They Did it ایک سیریز ہے جس میں مشاہیر عالم کی حیات انگریزی میں پیش کی جا رہی ہے۔ اردو والے اس کو

اپنی زبان میں منتقل کر کے اس رجحان سے دلچسپی لینے کا ثبوت دے رہے ہیں جب کبھی کوئی عظیم المرتبت ہستی دنیا سے گذر جاتی ہے تو اکثر اخبارات و رسائل میں اس کی زندگی کے حالات اور کارنامے برابر شائع ہوا کرتے ہیں۔ ریڈیو اور سینما سے بھی کبھی کبھی اس مذاق کی داد ملتی رہتی ہے۔ کلام کے مجموعوں کے ساتھ بھی بعض اوقات مصنف کے حالات ضبط تحریر میں آتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں حیات محمد قلی قطب شاہ اور حیات مومن دونوں ڈاکٹر زور نے لکھی ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے نام سے طالب الہ آبادی نے اور بزم اکبر کے نام سے قمرالدین نے اکبر الہ آبادی کے حالات لکھے ہیں۔ "گورکی کی آپ بیتی"۔ "یاد رفتگاں" اور "کیا خوب آدمی تھا" اور مولانا محمد علی کے "سفر یورپ" سے بھی بعض مشہور شخصیتوں کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

غرض مختلف و متعدد ذرائع سے اس رجحان کو مدد پہنچائی جا رہی ہے اور خوشی اس کی ہے کہ سوانح عمری میں اب تذکرہ یا مدح کی بحث سے آگے بڑھ کر تحقیق و تنقید کا عنصر زیادہ شامل ہوتا جاتا ہے لیکن ابھی صحیح معنوں میں یہ مذاق اردو میں نہیں پیدا ہو سکا۔ ہیرو پرستی کا جذبہ ابھی تک اپنا کام کر رہا ہے۔ خامیوں کو معائب سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہ چیز ہیرو کے محاسن کا پس منظر بن کر تمام کردار کو روشن تر بنا سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں بعض رسائل کے وہ رجحانات بھی قابل قدر ہیں جن سے

وہ اہل قلم کی روزمرہ کی زندگی، ان کے مزاج کی خصوصیات وغیرہ پر مخصوص نمبر شائع کرتے ہیں مثال کے لئے نقوش (لاہور) کا شخصیات نمبر ملاحظہ ہو جو ادارہ نے بڑی محنت سے جنوری ۱۹۵۵ء میں شائع کیا ہے۔

تاریخی رجحان سیرت نگاری کی طرح یہ مذاق بھی پہلے سے زیادہ ہو چلا ہے۔ اصول تاریخ نویسی و تحقیقات پر کافی توجہ ہے جس کی خاص وجہ ہے کہ سائنٹیفک طریقہ پر ہر چیز کو دیکھنے کی ذہنیت ہی دور نو نے مرتب کر دی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مغربی زبانوں سے واقفیت نے تاریخی مطالعہ کو نیا کر دیا اور پھر نصاب تعلیم اردو میں ہونے سے یورپ کی تاریخیں بھی اردو میں انگریزی وغیرہ سے منتقل کی گئیں جو زیادہ قاعدے اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ ان کو پڑھ کر لوگوں کو مورخ کے فرائض اور تاریخ اصول نویسی زیادہ تربیت یافتہ شکل میں نظر آئے نصاب میں شامل ہونے کی وجہ سے تاریخ کا مطالعہ زیادہ دلچسپی اور زور کے ساتھ کرنا پڑا جس سے چاروناچار ایک طبقہ کو مانوس ہونا ہی پڑا۔

انگریزی و عربی زبان سے بہت سی مشہور کتب تاریخ دارالترجمہ نے اردو میں منتقل کر دی ہیں یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے جس سے علاوہ اور باتوں کے یہ بھی فائدہ ہوا کہ اس طبقہ کو بھی تاریخ کے مطالعہ کا موقع ملا جو انگریزی کم یا بالکل نہیں جانتا تھا۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ انگریزی میں جتنی بھی تاریخیں لکھی گئیں وہ مستند یا بے لوث ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ

یورپ کی تاریخ نویسی نے خواہ ہندوستان کی تاریخ مرتب کرنے میں جانب داری سے کام لیا ہو یا ممکن ہے کہ اپنے گھروں کی تاریخ میں بھی رنگ آمیزی کی ہو لیکن مختلف اور متعدد اہل قلم کی رائیں دیکھنے سے اس قوت کو وہ ترقی حاصل ہوتی رہی جس کو تحقیق و استدلال سے براہ راست واسطہ ہے اور پھر اس میں شک نہیں کہ مغربی مورخین نے موجودہ زمانہ میں فن کو سائینٹفک طریقہ پر لانے میں زیادہ کوشش کی جن سے دوچار ہونے پر ہمارے تاریخی رجحان کو سنوارنے کا بہت اچھا موقع ملا۔

ترجمہ کے علاوہ اردو میں مستقل تصانیف آتی رہتی ہیں۔ اکبر خاں بجنوری، ڈاکٹر ایشوری پرشاد، ڈاکٹر حبیب، ڈاکٹر طاہر رضوی، مولانا عبدالرزاق اور مقبول احمد صاحب صمدنی اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے بڑی محنت سے مختلف و متعدد تاریخی کتابیں اردو ادب کو اپنے زور قلم و قابلیت سے بہم پہنچائیں شیخ محمد اکرم نے "آب کوثر" اور موج کوثر" کے نام سے دو جلدوں میں مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ پر مشرقی اور مغربی دونوں ذرائع سے روشنی ڈالی ہے۔ بقول سرور صاحب" مصنف محض سطحی اور اوپری نظر نہیں رکھتا حالات اور واقعات کا غائر مطالعہ کرتا ہے۔"

اس سلسلہ میں ہمیں رسالوں کو بھی نہ بھولنا چاہیئے جن میں اکثر تاریخی مضامین شائع ہوا کرتے ہیں 'معارف' کی تو زیادہ توجہ اسی فن کی طرف رہتی ہے۔ علاوہ جستہ جستہ مضامین کے بعض رسالے تو ایسے

تھے یا ہیں جن کا موضوع ہی 'تاریخ' ہے. مثلاً 'شمع' اور 'عبرت' ان کے تمام تر مضامین تاریخی ہیں اور نئی معلومات بہم پہنچانے کی برابران کی کوششیں رہیں۔

دارالمصنفین (اعظم گڈھ) کی خدمات بھی خاص طور پر قابل قدر ہیں مختلف اہل قلم تاریخ کی چھان بین کے بعد نئی روشنی میں زمانے کے سامنے مواد پیش کرتے رہتے ہیں. اس انجمن کے روح رواں سید سلیمان صاحب ندوی کا فطری رجحان تاریخی معلوم ہوتا ہے. آپ کا مشہور مقالہ "عرب و ہند کے تعلقات" اردو میں ایک نئی چیز ہے. عبدالسلام صاحب کی تاریخ الامم، اور تاریخ دولت عثمانیہ وغیرہ بھی قابل قدر کتابیں ہیں پھر بھی تاریخی رجحان ابھی تشنہ ہے۔ اور ترقی کے بہت سے امکانات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

دور جدید کے اسی سلسلہ میں اکثر سفر ناموں اور سیاحت ناموں کا بھی ذکر آچکا ہے موجودہ دور میں ہم عبدالماجد دریابادی اور قاضی عبدالغفار کے سفر ناموں کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے. ان دونوں حضرات نے اپنے سفر کے تجربات و معلومات کو بہت شگفتہ و دلکش انداز میں پیش کیا ہے عبدالماجد دریابادی کا سفر نامہ کتنا رنگین اور دلچسپ ہے. یہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنھوں نے موصوف کی دوسری کتابیں بھی دیکھی ہیں. یہی حال قاضی عبدالغفار کے "نقش فرنگ" کا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر نامہ نہیں، دلچسپ کہانی ہے جو کہے جانے کے لئے قاضی عبدالغفار کا قلم چاہتی تھی اس قسم کے سفر نامے

صرف ہماری دلچسپی ہی کا باعث نہیں، بلکہ ان سے بہت سے اور قابل قدر پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ خود مصنف اپنے بے تکلف لمحات میں اس طرح ہمارے سامنے آتا رہتا ہے کہ اس کی شخصیت پوری طرح اجاگر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اکثر تاریخی و نیم تاریخی اشخاص کے حالات و واقعات، جغرافیائی و علمی معلومات کا بھی ایک بیش بہا ذخیرہ ان سفرناموں کے دامن میں چھپا رہتا ہے۔ حال ہی میں خواجہ احمد عباس نے "مسافر کی ڈائری" کے نام سے ایک سفرنامہ مرتب کیا جس میں مختلف ملکوں کے باشندوں کے حالات کا بہت اچھا خاکہ پیش کیا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی یہ ڈائری دلکش ہے۔

ناول دور حاضر میں ناول سے دلچسپی لینے والی دو الگ الگ جماعتیں ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس نے انگریزی ادب کی مدد سے بہترین ناولوں کے مطالعہ کا موقع پایا اور فن ناول کے عناصر ترکیبی اور اصطلاحات پر غور کرتا رہا۔ اس کا مطمح نظر اتنا بلند ہو گیا کہ وہ معمولی ناول سے خوش نہیں ہو سکا۔ بلند پایہ اور ترقی یافتہ کتابوں کی جستجو کرتا رہا۔ اردو اس تلاش میں زیادہ اعانت نہ کر سکی۔ راشد الخیری، رسوا، فیاض علی، پریم چند، وغیرہ اتنا سرمایہ ناول کا بہم نہ پہنچا سکے کہ انگریزی داں طبقہ کو سیری ہوتی۔

دوسری جماعت وہ ہے جو دور جدید میں ناول نے پیدا کر دی تھی۔ نیم تاریخی افسانے یا عشقیہ ناول حقیقت سے دور ہوں یا قریب، فن کی کسوٹی پر پورے اترتے ہوں یا نہ اترتے ہوں اپنی رنگینی اور جدوجہد کے عناصر

سے اس جماعت کے لئے جنت نگاہ ہونے کو کافی ہیں۔ ایسے ناول اردو میں بے شمار ہیں اور کئی لحاظ سے بہت مقبول ہیں۔ ان کے پڑھنے والے بھی کثرت سے نظر آتے ہیں۔ ان کا کوئی فنی مطالبہ ناول سے نہیں ہوتا اس جماعت میں عام طور سے وہ لوگ ہیں جو انگریزی یا مغربی ادب سے زیادہ واقف نہیں اور مذاق کے لحاظ سے بھی "گزشتہ خاک نشینوں" کی یادگار ہیں۔ ان کا نقطۂ نگاہ مثالی ہے۔ ان کو ہیرو، منظر، جذبات سب مثالی چاہئے ماحول کی کشمکش اور انسانی کمزوریوں کے بھنور کے باوجود وہ کسی کو مثالیت سے پیچھے ہٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔

یہ ماننا پڑے گا کہ دور حاضر میں اچھے ناولوں کی پیداوار کم ہو گئی ہے مسلم الثبوت ناول نگار معدودے چند ملتے ہیں جس کی ایک بڑی وجہ مختصر افسانہ کا غلبہ ہے زیادہ تر اچھے لکھنے والے اسی صنف کی طرف متوجہ ہیں۔ مختصر افسانہ اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ وہ سب کچھ اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جو تفریح و معلومات کے لئے ضروری سامان سمجھا جاتا ہے۔ افسانویت، رنگینی، اختصار غرضکہ ہر چیز ماحول اور مذاق کے مطابق اس میں ایک جگہ بیک وقت ایسی مل جاتی ہے کہ قصہ پڑھنے والوں کا ناول سے ہٹ کر ادھر آجانا کوئی تعجب کی بات نہیں ادھر بہت تیزی کے ساتھ جاسوسی ناولوں کو اردو میں جگہ مل رہی ہے مگر تصنیف کم ہے ترجمہ زیادہ۔ انگریزی اور مغرب کی بعض دوسری زبانوں سے بے شمار ناول اردو میں منتقل ہوئے۔ ندرت و واقعات کی پیچیدگی میں افسانوی انہماک کو ایک نیا میدان مل گیا۔ غیر ممالک کے سماجی حالات

اور در پردہ زبردست کارروائیوں کا نقشہ کتابوں میں دیکھ کر حیرت و دلچسپی کی انتہا نہ رہی۔ لوگوں نے انگریزی کی پوری 'سیریز' (سلسلہ) کی ضخیم کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ کچھ ذہین اہل قلم نے اپنے ملک کے حالات و واقعات میں جاسوسی ناول لکھنے کی کوشش کی۔ مثلاً ظفر عمر نے نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری وغیرہ لکھ کر اپنی قابلیت اور اردو کی وسعت و صلاحیت کا پُر زور ثبوت دیا۔

اس دور میں بھی ناول کا مذاق اردو میں ہمہ گیر ضرور رہے۔ اس کی حکومت خواص و عوام دونوں پر رہے بلکہ پہلے سے زیادہ اس کا حلقۂ اثر وسیع ہو گیا ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مختلف ناول نویسوں نے اپنے مواد کا دائرہ مختلف طبقوں میں ڈھونڈنا شروع کر دیا ہے۔ شہر و دیہات کی زندگی میں انقلابی نظریوں میں، ہر جگہ ان کا ذہن اپنے قصے کے لئے مواد تلاش کر لیتا ہے۔ اس سے پہلے زیادہ تر خواص اور شہر کے لوگوں کا افسانہ ناولوں میں ہوتا تھا لیکن دور حاضر میں حقیقت و وسعت اس لئے زیادہ ہو گئی کہ سیاسی تحریک نے دیہات کو ایک خاص اہمیت بخش دی ہے کاشتکاروں کی زندگی مزدوروں کے حالات گاؤں والوں کے خیالات لکھنے والوں کو ذاتی طور پر حاصل ہوئے۔ غریبوں کی کشمکش و کمزوریوں کو دکھا کر ایک دنیا سے متعارف کر دیا۔ ناول پڑھنے والوں کو بھی ادب میں نئے زاویے۔ نئی بات چیت اور ایک خاص سادگی و خلوص ضیافت دل و دماغ کے لئے نئے سامان معلوم ہوئے۔

اس سلسلہ میں پریم چند کا کارنامہ خاص طور پر قابل ذکر ہے انھوں نے عوام کی دیہاتی زندگی کی صحیح ترجمانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ان کی طرز معاشرت، بول چال، مردانگی جہالت اور عشق کا نقشہ ادبیت و حقیقت کے ساتھ نہایت خوبی سے پیش کر دیا ہے۔ ان کا مشہور ناول "گئودان" اس کا بیّن ثبوت ہے۔ یوں تو انھوں نے ہندوستان کی وطنی اور قومی تحریک کے کئی نقشے پیش کر دیئے لیکن گئودان میں ان کا خاکہ زندگی کے تمام اہم مسائل کو سمیٹ لیتا ہے۔ سجاد ظہیر نے "لندن کی ایک رات" میں نے انقلابی نظریہ کے تحت میں زندگی کے مسائل پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ سدرشن نے بھی زندگی کے مسائل اخلاقی رنگ میں پُر اثر بنا کر ایک دلچسپ دکار آمد اصلاحی پہلو پیدا کر دیا ہے۔

متوسط طبقہ کی زندگی کی ترجمانی بھی ایک طرف فیاض علی نے اور دوسری طرف راشد الخیری نے نہایت خوبی سے کی ہے۔ فیاض علی نے "شمیم" "انور" میں نہایت حسن کے ساتھ اس طبقہ کی رومانی زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ راشد الخیری نے اس طبقہ میں صنف نازک کی قابل رحم حالت کی موثر تصویریں پیش کی ہیں۔

ان ناولوں کے علاوہ دوسری زبانوں کے شاہکار ناولوں کے اچھے ترجمے بھی اردو اپنے دامن میں سمیٹ رہی ہے۔ مثلاً "گورکی" کی (Mother) کا ترجمہ بنکم چندر چٹرجی شرت چندر اور ٹیگور کے بعض مشہور ناولوں کے ترجمے، جن سے فنی حیثیت کے علاوہ معیار و ندرت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اچھے طبع زاد ناولوں کی کمی اس طرح بھی پوری ہوتی نظر آتی ہے۔

ان تمام کوششوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ اردو ناول نویسی نے ابھی اپنی راہ متعین نہیں کی ہے۔ اس میں فدا علی خنجر اور ندیم صہبائی کے ناولوں سے لے کر سجاد ظہیر کی "لندن کی ایک رات" اور کرشن چندر کی "شکست" تک ہمارے پیش نظر ہیں۔

۱۹۵۰ء کے قریب سے اردو ناول نویسی کا مذاق پھر تیز ہو گیا ہے سیکڑوں ناولیں وجود میں آ گئی ہیں، عزیز احمد، رئیس احمد، محبوب طرزی، عصمت چغتائی، وغیرہ نے اس ذخیرہ میں بہت کچھ اضافہ کر دیا ہے۔

مختصر افسانہ مختصر افسانہ کے لئے زیادہ تر ہم مغربی اور بالخصوص انگریزی ادب کے رہین منت ہیں جس کی وجہ سے یہ بیش قیمت چیز اردو کے ہاتھ لگی۔ پہلے تو دوسری زبانوں سے مختصر افسانے اردو میں ترجمہ ہو کر آتے رہے پھر رفتہ رفتہ طبع زاد افسانے بھی لکھے جانے لگے۔ غالباً سجاد حید یلدرم پہلے شخص ہیں جنھوں نے ترکی افسانوں کو پہلے پہل اردو میں منتقل کرنا شروع کیا تھا۔ اور بعد میں بحیثیت مصنف کے بھی میدان میں آ گئے!

مختصر افسانے اس تیزی کے ساتھ ایک قلیل مدت میں ہمارے ادب کی جان ہو گئے کہ نثر میں اتنی کامیابی کسی صنف کو کبھی نہیں ہوئی تھی۔ رسالے اخبارات، مجموعے ہر ایک اپنے کو اس سے آراستہ کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ زیادہ پڑھے لکھے اور معمولی علم کے لوگ بھی مختصر افسانہ کی طرف متوجہ ہیں۔ اردو کے اہل قلم میں آج بڑی تعداد افسانہ نویسوں کی ہے اور پڑھنے والوں کا بھی یہی حال ہے۔ ہر چیز سے زیادہ مختصر افسانہ پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسس

صنف کی ہر دلعزیزی کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ ناول کو ادبی میدان سے کسی قدر اس کے مقابلہ میں پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔

مختصر افسانہ کی کامیابی کی کئی وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ دنیا کاروباری اقتصادی معاملات میں اتنی معروف ہے کہ وقت زیادہ نہیں بچا سکتی، چاہتی ہے کہ تھوڑے سے وقت میں تفریح و معلومات دونوں ہو جائیں مختصر افسانہ اس کے لئے اپنے اختصار و اطلاعات پیش کر کے لوگوں کی اس خواہش کو بڑی آسانی سے پورا کر دیتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نئی چیز ہونے کی حیثیت سے بھی زیادہ پُرلطف ولذیذ معلوم ہوا اور اردو کے گذشتہ ناولوں کے مقابلہ میں اس کو زندگی سے زیادہ قریب پا کر پڑھنے والوں نے اس کو سینہ سے لگایا اور پھر ایک سبب یہ بھی ہے کہ تھوڑے عرصہ سے اس صنف پر مغرب بھی خاص توجہ کر رہا ہے اس کا اثر دنیا کی دوسری زبانوں پر پڑنا ضروری ہے اردو بھی اپنی زندہ دلی اور زندگی کا ثبوت دے رہی ہے۔

موجودہ افسانہ نویسوں کا موضوع سماج ہے۔ نیم مذہبی و نیم جذباتی پردے میں جو سماجی دقتیں پیدا ہو گئی تھیں ان کو ترقی کی راہوں سے ہٹانا ہمارے افسانہ نویسوں کی توجہ کا مرکز ہے مفلسی و بیکاری کے برے نتیجے اور سرمایہ داری و جاگیرداری کی تکلیف دہ داستانیں ہمارے افسانوں کا مقبول رجحان ہے۔ پہلے تو ادب کا خاص سرچشمۂ حیات شہر تھا مختصر افسانہ نے اپنی دنیا دیہات میں بھی بسائی۔ گاؤں کی زندگی، سڑکیں، بازار، گفتگو سادگی، عشق، کھیت، کھلیان وغیرہ افسانوں کے بہترین ذخیرے ہیں جہاں

سے لوگ نت نئے مواد حسب تخیل و مشاہدہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔
ان افسانوں کی وجہ سے دیہاتی الفاظ و محاورے بھی آہستہ آہستہ اردو کے خزانے میں شامل ہو رہے ہیں فی الحال تو ان کا شمول ایک طبقہ کو پسند نہیں مگر کارآمد اور ایک خاص مفہوم کو صرف وہی الفاظ و محاورات ادا کرتے ہیں اس لئے امید ہے کہ رفتہ رفتہ سب مانوس ہو جائیں گے۔ دیہات کی طرف توجہ کرکے افسانوں نے اردو کو زندگی سے اسی طرح قریب کر دیا جس طرح جوش و مجاز، سلام مچھلی شہری اور مطلبی وغیرہ کی بعض بعض نظموں سے لوگوں کو محسوس ہونے لگا ہے کہ اردو صرف شہر والوں کی زبان نہیں صرف ان ہی کی زندگی کا نقشہ نہیں پیش کرتی بلکہ دیہاتی عوام کی روئداد و سرگزشت کی بھی تصویریں اس میں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح افسانوں میں دیہات کی زندگی نظر آتی ہے دیہات کی زندگی یوں تو قریب قریب ہر موجودہ افسانہ نویس کے یہاں ملتی رہتی ہے مگر جن لوگوں نے کامیابی و اثر کے ساتھ اس پر قلم اٹھایا ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔ پریم چند، پنڈت سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی، سہیل عظیم آبادی، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری وغیرہ
کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مختلف نظریوں سے دیہاتی زندگی کے علاوہ شہر کے متوسط متمول طبقوں کی زندگی کے نقشے پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے چند مثلاً نیاز، مجنوں، اختر رائے پوری، سعادت حسن منٹو وغیرہ عشق و حسن کی داستانیں موجودہ مذاق و روشنی میں کسی قدر بیباکی مگر

خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتے ہیں نفسیات و جنسیات کی تہ در تہ جنبشوں کو فنی انداز سے ابھار کر بیان کرنا ان لوگوں کا خاص کارنامہ ہے۔

کچھ لکھنے والے ایسے بھی ہیں جو واقعات کا مشاہدہ غور سے کرتے ہیں اور بغیر کسی ذاتی رائے کے ہو بہو ایک تصویر پیش کر دیتے ہیں اور بعض اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر واقعات کو بھی اپنے مزاج کے موافق بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ترقی پسند افسانہ نویس ایک خاص مقصد سامنے رکھ کر سماجی نظام پر تنقید کرتے ہیں تاکہ اس طرف معاشرت کی کھوکھلی بنیادوں کا پتہ چل سکے اور ایک صحیح نظام و عمرانی فلسفہ کی ضرورت در حقیقت بھی نظر کے سامنے آجائے یہ لوگ بھی حسن و عشق کی داستانیں پیش کرتے ہیں لیکن پس منظر کے طور پر اس طبقاتی کشمکش کی جھلک دے دیتے ہیں جو ہماری پوری نفسیات پر چھائی ہوئی ہے۔ دیہات میں کاشتکار کی زمیندار اور ساہوکار سے جنگ اور وہ مجبوریاں جن کی سمومیت سے بہت سے دلوں کی کلی کھلنے ہی نہیں پاتی یا پھر کھلتی بھی ہے تو قبل از وقت مرجھا جاتی ہے۔

اسی طرح شہر کے متمول و متوسط طبقوں، طالب علموں، مزدوروں، خادموں یا طوائفوں کی زندگی کے جس پہلو کی بھی ترجمانی کرتے ہیں خواہ وہ جنسی ہو یا کاروباری خیال سے متعلق ہو یا عمل سے ہر جگہ "روپیہ" کی صاف صاف وہ کھنک سنائی دیتی ہے جس کے اشاروں پر موجودہ سماج میں زندگی چل رہی ہے۔ اور جس کے تال پر ہمارے جذبات و خیالات رقص کرتے کرتے بے دم ہو کر رہ گئے ہیں۔

ان لوگوں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اختر رائے پوری، سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، خواجہ احمد عباس، احتشام رضوی، احمد علی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، حسن نذیر، حمید، ابراہیم جلیس، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری، عصمت، شاہد لطیف، اپندر ناتھ اشک، مہندر ناتھ اور پروفیسر رام پرتاپ بہادر (مصنف ٹوٹے ہوئے دل) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مختصر افسانہ تبلیغ و سماج کی درستی میں بہت کام آیا۔ اپنے نظریہ اور جذبات کے تحت میں ہر شخص نے سماجی خرابیوں کو دور کرنے کی صورتیں بتائیں اچھی بری ہر قسم کی رائے حسب فکر ملتی رہی کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے جو اس نظام میں سرعت کے ساتھ انتہا پسندانہ انداز میں انقلاب چاہتے ہیں۔ ہر چیز کو مادی حقیقت کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں اس مذاق کا بہترین ثبوت "انگارے" سے ملتا ہے جس نے باوجود اپنی فنی ندرت و خوبی کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرکے تمام اسلامی ہندوستان میں آگ لگا دی۔

اس افسانہ کے مجموعہ کے سلسلہ میں وقار عظیم صاحب نے بڑی معقول بات کہی ہے کہ "مغرب[1] دن بدن مادیت کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے وہ ہر چیز میں حقیقت شعاری کے دیکھنے کا متمنی ہے۔ افسانہ، شاعری، مصوری اور موسیقی میں اس کے لئے اس وقت تک کوئی اثر نہیں جب تک یہ چیزیں حقیقت کی سچی تصویریں بن کر اس کے سامنے نہ آئیں۔ وہ ہر چیز اور اس کی فطرت کو برہنہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اسکا سب سے بڑا اخلاق خود فطرت اور اس کے پوشیدہ رازوں کی عقدہ کشائی ہے اس لئے وہ جو کچھ دیکھنا یا سننا چاہتا ہے اس میں اسے صرف حقیقت کی تلاش ہے

---

[1] ہمارے افسانے ص۵۳

دنیا میں ایسی حقیقتیں بھی ہیں جن کے اظہار کو اخلاق نے اب تک گناہ سمجھ رکھا ہے اور اس لیے ان کی حقیقی تصویریں بھی شاعرانہ نا دلوں اور فنی عکسوں کے پردہ میں جلوہ گر ہوتی تھیں۔ لیکن اب شاعری اور فن اس کے نزدیک صرف حقیقت کی سچی اور برہنہ مصوری کا نام ہے۔ اس روش کے عام ہونے کا جو نتیجہ ہونا چاہیے ظاہر ہے افسانوں میں حقیقی زندگی کے ایسے ایسے واقعات پیش کیے گئے جنھیں ہماری آنکھیں باوجود ان کی صداقتوں پر ایمان رکھنے کے دیکھنا گوارا نہیں کر سکتیں۔"

آگے چل کر "انگارے" کے متعلق لکھتے ہیں: "انگارے" کے مصنفین میں سے بعض کے یہاں اس طرز نگارش کے بے حد کامیاب نمونے موجود ہیں جو خواہ کسی اور نقطۂ نظر سے پسندیدہ نہ سمجھے جائیں لیکن فن اور اس کی بلندیاں ان چیزوں کو اپنی بزم کی سب سے بڑی زینت سمجھتی ہیں۔" الفاظ و زبان اور واقعات کے انتخاب کی خرابیاں بتانے کے بعد وقار عظیم صاحب لکھتے ہیں کہ "انگارے" اردو میں اپنی قسم کی بالکل نئی چیز ہیں۔ ان میں جذبات کی شدت، ان کے انقلابات، خیال کی جدت تیکھاپن اور ان سب سے زیادہ طرز بیان کی تیزی، جدت، آزادی بے باکی فن کے نزدیک بہت پسندیدہ چیزیں ہیں، اخلاقی اور سماجی نقطۂ نظر سے قطع نظر عنوان کے لحاظ سے سجاد ظہیر اور رشید جہاں کے دو افسانے بے حد بلند ادبی نمونے ہیں۔ اردو کو ابھی آئندہ آنے والے دور میں اگر کسی چیز میں سب سے زیادہ ترقی کرنی ہے تو وہ صرف فن ہے اور فن کی بلندی کے لحاظ سے اردو والوں کو

لہ ہمارے افسانے صہ ۸۶

ان دو افسانوں کا دست نگر ہونا پڑے گا۔"

"انگارے" ہی میں سجاد ظہیر نے اردو کے طرز بیان میں ایک اور رجحان پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً یہ کاوش بھی مغربی اور خاص کر جیمس جوائیس کے اثر کا نتیجہ ہے جس کو ہم شعوری بہاؤ (Stream of Consciousness) کا طرز تحریر کہہ سکتے ہیں۔ انسان جب ایک بات سوچنے لگتا ہے تو اس سلسلہ میں تحت شعور کے اور بہت سے دھارے ابل پڑتے ہیں اور بچاسوں واقعات غیر متعلق کسی خیال کا سہارا لے کر دماغ میں ایسے آجاتے ہیں کہ سوچنے والا ان ہی کے سیلاب میں بہہ جاتا ہے۔ ایک بات سے دوسری بات اور ایک موضوع سے دوسرا موضوع ایک سلسلۂ لامتناہی کی طرح دل و دماغ پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ اور مرکز سے ہٹ کر بھی خیالات کا مجموعہ بجائے خود ایک دلچسپ افسانہ ہو جاتا ہے اس طرز نے کسی حد تک اب رجحان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اکثر رسالوں میں کافی ایسے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کا افسانہ "پاگل" نہایت دلچسپ اور نفسیاتی پہلو کا آئینہ دار ہے۔ اسی طرح ان کا افسانہ "ہتک" ایک بیسوا کی نفسیاتی کیفیات کو بہت خوبی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

نظموں کی طرح افسانے کی جاذبیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس چمن کی آبیاری میں عورت و مرد دونوں دوش بدوش قلمی خدمت انجام دے رہے ہیں صنف نازک کی اچھی خاصی تعداد افسانہ نگاری میں دلچسپی لے رہی ہے لیکن جنھوں نے اپنا سکہ دنیائے افسانہ میں جما لیا ہے اور

ایک خاص شہرت کی مالک ہیں ان میں سے بلقیس جمال، حجاب امتیاز علی، رشید جہاں، عصمت شاہد لطیف، طاہرہ دیوی شیرازی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور صدیقہ بیگم ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے افسانے قبول عام کا شرف حاصل کر چکے ہیں اور خاص خاص رسالوں کو ان کی افسانہ نویسی کی اشاعت کا فخر حاصل ہے۔

موجودہ دور میں مزاح کا عنصر عالمگیر نظر آتا ہے۔ نظم و نثر دونوں اس کی شگفتگی سے مالا مال ہیں اور افسانوں میں تو ایک خاص فن ہو گیا ہے جس میں لطیف مذاق، اپنی معنویت و تاثیر کے ساتھ ایک خاص مقصد کے تحت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ادب سے قنوطیت کم کرنے کا یہ بھی ایک بہت عمدہ پیرایہ نکل آیا ہے۔ جو فرض سنجیدگی و متانت نہیں ادا کر سکتی ذہنیت کی تبدیلی میں جہاں اور حربے ناکامیاب دکھائی دیتے ہیں وہاں مزاحیہ پہلو کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ ہنسا ہنسا کر اپنا کام کر جاتا ہے۔ اور اشارے اشارے میں وہ ساری باتیں کہہ جاتا ہے جو متانت و سنجیدگی کے بس کی نہ تھیں۔

اردو کے مزاحیہ افسانے نہایت تیزی کے ساتھ بلندی پر پہنچے ہیں۔ پختگی، جدت، لطافت اور متانت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اس قسم کی بہت سے مختصر افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو اپنی ندرت و دلکشی کی وجہ سے مقبول عام و قابل قدر ہیں۔ فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، اسلم، شوکت تھانوی اردو کے ممتاز مزاحیہ افسانہ نگار ہیں۔ 'پطرس' کا ذکر اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہے حالانکہ بقول وقار عظیم صاحب

"پروفیسر[1] بخاری کے مضامین کے مجموعہ کو اب تک مضامین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لوگ انھیں افسانے کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ . . . . پطرس کے مضامین میں سے ایک آدھ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں جو افسانہ نگاری کے مقررہ حدود میں نہ آجاتا ہو۔ کسی میں پلاٹ ہے تو کسی میں کردار یا ماحول کی ترجمانی کسی میں ان تینوں میں سے دو چیزیں ہیں تو کسی میں تینوں، ان کے یہاں ادبیت، نفسیاتی پہلو، طرز بیان اور افسانویت سے امتیازی وانفرادی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جو اور لوگوں کو کم نصیب ہے۔"

"انگارے" میں بھی سجاد ظہیر نے اپنے ایک افسانہ میں افسانویت اور انشائیت کو اس طرح ملا جلا دیا ہے کہ دونوں میں امتیاز کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس رجحان کو پطرس کے علاوہ کرشن چندر، اختر رائے پوری، احمد علی وغیرہ نے اور آگے بڑھایا ہے، اور ایک بالکل نئی صنف یعنی افسانوی انشا کی بنیاد ڈال دی ہے جس میں افسانہ کے جملہ لوازمات پلاٹ، کردار، ماحول کے علاوہ انشا (Essay) کی ادبی لطافت، تفکر و تنزل، سپردگی اور جذبات (Moods) کا ایک خاص تسلسل، سبھی کچھ موجود ہوتے ہیں۔ اس طرز خیال میں ابھی بہت کچھ ترقی کے امکانات نظر آتے ہیں۔

ڈراما دورجدید سے عہد حاضر تک آتے آتے آغا حشر کے مذاق و فن ڈراما نویسی میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ متانت و پختگی کے علاوہ فنی محاسن کا بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے: ذاتی جذبات و الفاظ کی ندرت سے مغلوب ہو کر پلاٹ یا کردار کو صدمہ نہیں پہنچنے پاتا۔ ناٹک ساگر میں بالکل صحیح لکھا ہے: "کہ پرانے نقائص بہت

---

[1] پروفیسر احمد شاہ بخاری

حد تک مٹ گئے تھے اور اب ان کا قلم فن کے قریب پہنچنے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے۔" خود آغا حشر کا اپنے آخری ایام میں کہنا تھا کہ: "اگرچہ میرے قویٰ کمزور ہوتے جاتے ہیں دماغ روز بروز قوی تر ہوتا جاتا ہے اور مجھے وہ نکتے سوجھتے ہیں جن کا عالم جوانی میں گمان نہ تھا۔"

حشر نے اس مذاق کی اشاعت و بلندی میں جس دلچسپی سے کام لیا تھا۔ اس سے موجودہ دور کو آگے بڑھنے کا کافی سہارا مل گیا۔ عام رجحان ترقی یافتہ شکل میں نمایاں ہونے لگا ادبیت و عمرانیت کی کمی پوری کی جانے لگی جس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ اردو کا علمی مذاق اب نکھر کر سطح سے کافی بلند ہو چکا ہے اور تھیٹر کی کمپنیوں کے زوال نے شوقیانہ مذاق سے ایک حد تک ڈراما کو علیحدہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ لکھنے والوں کی نظر عوام کو خوش کر کے روپیہ کمانے پر کم رہتی ہے۔ فن اور نفسیاتی پہلو پر زیادہ پڑتی ہے سیاسی اور سماجی بیداری نے بھی ڈراما کے رجحان کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج کافی تعداد میں ڈرامے زندگی اور سماجی کشمکش کو اصل صورت میں پیش کر کے ان کی اہمیت بڑھا رہے ہیں۔

سینما، ریڈیو، رسائل نے ڈراما کے مذاق کو عام کرنے میں اس وقت جو کام کیا ہے وہ گذشتہ دور میں شاید تھیٹر کی کمپنیاں بھی نہیں کر سکتی تھیں عوام و خواص اور شہر و دیہات سب سینما، ریڈیو، رسائل وغیرہ سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ لکھنے والے زیادہ سے زیادہ محنت کے ساتھ اس فن کی طرف توجہ کر رہے ہیں تاکہ سامعین و قارئین کو مایوسی نہ ہونے پائے۔ اس تفریح کو بھی عام زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

موجودہ دور میں رسائل کے ذریعہ سے ایک ایکٹ کا ڈراما کثرت کے ساتھ اردو میں جگہ پا رہا ہے عموماً انگریزی ادب کی اصطلاحات اور باریکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھنے والے قلم اٹھاتے ہیں۔ مستقل کتابی صورت میں ڈراما لکھنے والے دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو مستقل سینما کمپنیوں کے ملازم ہیں اور دوسرے وہ جو کمپنیوں سے آزاد ہو کر لکھا کرتے ہیں آخر الذکر طبقہ میں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر اشتیاق حسین، فضل حق قریشی، انصار ناصری، اُپیندر ناتھ اشک وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موجودہ دور کے ڈراما کی تنقید نامکمل رہ جائے گی اگر امتیاز علی تاج کے "انارکلی" کا ذکر نہ کیا جائے جتنا مقبول عام یہ ڈراما ہوا اتنا اور کوئی نہ ہو سکا۔ فن وادب کے لحاظ سے اس ڈراما میں اتنی خوبیاں آگئی ہیں کہ تاج ہر لحاظ سے قابل مبارک باد ہیں۔ قصہ کی ہمہ گیری اور شخصیتوں نے ایک زمانہ کو مسخر کر رکھا ہے۔

بولتے سینما نے فن ڈراما میں ایک اور تغیر پیدا کر دیا ہے تھیٹر میں ایکٹر اپنے مکالمہ سے تماشا دیکھنے والوں کو متوجہ رکھتا تھا اب مکالمہ کے عوض واقعاتی پہلو نمایاں کر کے زمان و مکان کے اتحادی اثر کو قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تصویر کے چہرہ وخط وخال سے خاطر خواہ دلکشی پیدا کر کے ڈراما کی نزاکتوں کے ہر گوشہ کو نمایاں کرنے کی صورت پیدا کی جاتی ہے۔ سینمائی ڈراموں کے معائب بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ ابھی تک ایک طبقہ ایسا ہے کہ جس کا مذاق پست ہے اس طبقہ کو خوش کرنے کے لئے ڈراموں میں فن کا اتنا خیال نہیں ہوتا جتنا عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کا۔ آزاد ہو کر لکھنے والوں کے بھی ڈرامے جب فلم ہونے

لگتے ہیں تو اپنی ضرورت کے لحاظ سے ڈائرکٹر اتنی کتربیونت کر دیتے ہیں کہ بعض وقت ڈراما اور فن دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

چند کمپنیوں نے سینما کے فن پر زیادہ توجہ دے کر سینمائی ڈراموں کو بھی بلند کرنے کی کوشش ہر لحاظ سے کی ہے۔ اب سے کچھ سال پہلے تک نیو تھیٹرز بمبئی ٹاکیز وغیرہ اس سلسلہ میں کافی نمایاں تھیں مگر ادھر حال میں ان کی توجہ اردو زبان سے کچھ ہٹ سی گئی ہے متروامویٹون، نیشنل اسٹوڈیوز، محبوب پروڈکشنز اور فضلی برادران آج کل اپنی زبان و انداز بیان سے ڈراما کو جو فائدہ پہنچا رہے ہیں وہ کافی امید افزا ہے۔ ریڈیو کے ڈراموں میں عمل کے عوض مکالمہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ جس میں صوتی اصولوں کو مدنظر رکھ کر ڈراما نگاری کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں شوکت تھانوی اور سعادت حسن منٹو خواجہ احمد عباس، شاہد لطیف کی خدمات قابل قدر ہیں۔

موجودہ حالت میں ڈراما کا مستقبل امید افزا نظر آتا ہے اس طرف توجہ کرنے والوں میں ایسے حضرات ہیں جن کی قابلیت، انشاپردازی، انگریزی ادب کی واقفیت، ڈرامائی ادب کی ترقی کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ حیدرآباد، پنجاب اور دہلی کی سرپرستی اس وقت کی اعانت کے لئے اگر کافی نہیں تو غنیمت ضرور ہے۔

مقالہ نگاری دور جدید میں (Essay) کے مفہوم و خصوصیات کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ اس تعریف کی روشنی میں عہد حاضر بھی اس صنف میں کوئی نمایاں رجحان ادب نہیں پیدا کر سکا اصول پر اگر سختی کے ساتھ نظر ڈالی جائے تو حسن نظامی کے علاوہ مشکل سے اور کوئی صاحب قلم اس میدان میں نظر آتا

ہے آپ کے مقالات کے مجموعے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ کی ساری خوبیاں موجود ہیں، زبان کی ترقی، طرز تحریر کی دلکشی، ذاتی تجربات و محسوسات معمولی موضوع میں بھی اہم موضوعات کی بلندی، یہ جملہ خصوصیات بیک وقت ان کے مقالات میں نہایت خوبی کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ شروع سے آخر تک بغیر ختم کئے ہوئے مقالہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا نہ ذہن پر کوئی بار ہوتا ہے اور نہ کہیں دلچسپی میں فرق آتا ہے۔ بلکہ بہ آسانی بلندی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔

یہ رویہ اردو میں زیادہ نہیں پایا جاتا۔ عام طور سے مضمون لکھنے والے کسی خاص غرض کی تحت میں کام کرتے ہیں ان کے پیش نظر زیادہ تر مقصد فائدہ ہوتا ہے۔ نرمی اور ہلکی سی رنگینی کی دل کو تلاش ہوتی ہے۔ مگر نہیں ملتی! ایسی تحریروں میں علمی و تحقیقی پہلو زیادہ مدنظر ہوتا ہے عبارت بھی عام فہم و زود اثر نہیں ہوتی! البتہ موضوع کی اہمیت یا طرز تحریر بذات خود دلچسپ و با اثر ہو جائے تو دوسری بات ہے۔

چونکہ اس قسم کا ذخیرہ جس میں غرض و غایت پنہاں ہو اور عبارت بھی کسی قدر ادق ہو موجودہ اردو ادب میں کافی و قابل قدر ہے۔ اور اگر صحیح معنوں میں اس کو 'مقالہ' کہنے میں تکلیف ہے تو ایسی تحریروں کو کسی رجحان میں لانے کے لئے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو ہم اردو میں مقالہ کا مفہوم وسیع کریں اور افادی و علمی پہلو کو بھی اس میں شامل سمجھیں یا پھر ان سب کو 'مضامین' کے عنوان سے یہاں جگہ دیں بہر حال ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مقدار و اہمیت کی وجہ سے ان کو جو خاص مرتبہ حاصل ہو چکا ہے اس سے چشم پوشی، تنگ نظری کا ثبوت ہوگی۔

اس قسم کے مضامین نوے فی صدی تو رسالوں میں نکلا کرتے ہیں اور مثل

فیصدی کسی ادبی مجموعے یا دیوان کے ساتھ۔ نوعیت کے اعتبار سے رسالوں میں شائع ہونے والے مضامین زیادہ تر نقد و تبصرہ پر مبنی ہوتے ہیں جن میں عموماً تحقیق و بالغ نظری سے کام لیا جاتا ہے۔ ادب کی ماہیت و نفسیات پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالی جاتی ہے موجودہ دور میں الفاظ و محاورات سے زیادہ توجہ طرز تخئیل و وسیع النظری پر ہے۔ غرض کہ تحریروں میں فلسفیانہ کوششوں کی جھلک عموماً نظر آتی ہے۔

اِن مضامین میں کبھی کبھی علاوہ اور باتوں کے تاریخی وانتقائی پہلو پر بھی زور دیا جاتا ہے ماخذ کی طرف اشارہ کر کے کردار یا نفس مضمون کے تغیرات پر غور کیا جاتا ہے موضوع کی ترقی و تنزل پر بحث کر کے مضمون نگار کی صلاحیتوں پر تنقید ہوتی ہے جذبات سے الگ ہو کر حقیقت کی روشنی میں عقائد و رسوم کو جانچنے کی کوشش ہوتی ہے۔

علمی و تنقیدی مضامین کے علاوہ تاریخی، اقتصادی اور سماجی مضامین بھی ہمارے مضمون نگار سپرد قلم کرتے رہتے ہیں جن میں نئی معلومات پر بحث ہوتی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبہ جات کو ایک دوسرے سے متحد و متاثر بنانے کی طرف ذہنی رجحان مائل نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ فنی اعتبار سے اس صنف میں کافی ترقی ہو رہی ہے۔ تنوع مضامین کے لحاظ سے بھی اردو ادب کا یہ حصہ تمام ادبی کاوشوں سے زیادہ ہمہ گیر ہے۔ سائنس، فراست الید، علم الاصنام، فنون لطیفہ، غرض کہ لکھنے والوں کی فکر ہر طرف تلاش مضمون میں دوڑا کرتی ہے ایسے مضامین ندرت و اطلاعات کی وجہ سے زیادہ تر دلچسپ و ذہن افروز ہوتے ہیں۔ حالانکہ

زبان بہت کافی مشکل ہوتی ہے اصطلاحات کی وجہ سے خیالات جلدی نہیں سمجھ میں آتے غور وفکر کی بھی زحمت اٹھانی پڑتی ہے لیکن باوجود ان دقتوں کے بھی اردو کی دلچسپی اس رجحان سے زیادہ ہوتی جاتی ہے، پڑھنے والے نہایت شوق سے ان مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں۔

مضامین کے سلسلہ میں ہمیں ان تحریروں کو بھی نہ بھولنا چاہیے جو رسائل و اخبارات کے ابتدائی حصہ میں ہوتی ہیں اور جن میں مدیر اپنے ذاتی خیالات و تجربات سپرد قلم کرتے رہتے ہیں۔ یہ مختصر مضامین معلومات و اختصار کا مجموعہ ہوتے ہیں زبان وطرز بیان کے لحاظ سے بھی مدیر قلم سنبھال کر لکھنے کی کوشش کرتا ہے اس وجہ سے ایسے ملاحظات، یا شذرات، یا اڈیٹوریل، عموماً دلچسپ و کارآمد ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نیاز فتحپوری کے 'استفسارات' خاص اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ لوگوں کا مختلف امور کے متعلق سوال کرنا اور مدیر نگار کا جواب لکھنا ایک مستقل سلسلہ ہو گیا ہے۔ جس سے علمی، ادبی، سیاسی مسائل پر کافی اچھی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ استفسارات کو کتابی شکل میں شائع کرکے نیاز نے اردو میں گویا ایک کارآمد لغت مرتب کر دیا ہے جس میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو دوسرے لغتوں میں ڈھونڈھنے سے نہیں مل سکتیں۔

جستہ جستہ مضامین جو رسائل یا اخبارات میں شائع ہوتے ہوتے دور حاضر میں کتابی صورت اختیار کر چکے ہیں ان کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کے مصنفین کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً مہدی افادی، سلیمان ندوی، سجاد انصاری، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس

احتشام حسین، آل احمد سرور، اختر اورینوی وغیرہ کے مضامین اردو ادب میں ایک خاص اہمیت کے مالک ہونے کی وجہ سے اتنے ہر دلعزیز ہیں کہ اردو پڑھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ان سے واقف ہے۔

مہدی افادی اپنے وقت کے زبردست انشا پرداز تھے۔ ان کی تحریروں کو دیکھ کر مولانا شبلیؔ نے فرمایا تھا کہ "نذیر احمد و آزادؔ کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے"[1]۔ مہدی کی مضمون نویسی کا سلسلہ ۱۸۹۹ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۱۹ء میں ختم ہوتا ہے۔ اس بیس سال کی مدت میں انھوں نے انشا پردازی میں خاص شہرت حاصل کر لی تھی۔ صحت زبان و لطافت خیال کے لحاظ سے ان کے مضامین، ہر باکمال مضمون نویس کے لئے باعث فخر ہو سکتے ہیں، اسلوب نگارش متانت، بیان، شوخی ادا کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ ایک سکون آمیز دلچسپی اور ایک خاص قسم کا تغزل ان کی نثر میں محسوس کرتے ہیں۔ ان کی رائے کی قطعیت و زور خیالات کو پُر اثر بنا دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں صاف صاف کہہ دیتے ہیں وسیع مطالعہ کی وجہ سے ان کے تنقیدی مضامین بڑی معلومات پر مبنی ہیں۔ افسوس ہے کہ عمر نے بے وفائی کی ورنہ بقول عبدالماجد صاحب اردو کے لئے آزادؔ ثانی پیدا ہونا ناممکن نہ تھا[2]۔ ہمیں مہدی بیگم کا شکر گزار ہونا چاہئے جنھوں نے مضامین کا مجموعہ شائع کر دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ "ان کی یاد میں" ایک نہایت ہی پاکیزہ مضمون مہدی افادی کے حالات زندگی پر سپرد قلم کیا ہے۔ یہ مضمون طرز بیان کی وجہ سے بجائے خود

---

[1] افادات مہدی (ان کی یاد) از مہدی بیگم ص۱۲ [2] افادات مہدی دیباچہ

ایک دلچسپ تحریر اور سوز و گداز کا مرقع ہو گیا ہے۔

سلیمان ندوی کے مضامین عموماً معلومات و پختگی کے لحاظ سے نہایت قابل قدر ہوتے ہیں۔ علمیت و ادبیت سے وہ اردو انشاپردازی کو نوازنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ باوجود مولوی ہونے کے ان کی زبان میں ترقی، اور عبارت میں ایک لطیف رنگینی، بیان کو موثر بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے طرز استدلال سے مفہوم کو واضح اور دلکش بناتے رہتے ہیں۔ ٹھوس مضامین میں بھی مشکل سے خشکی محسوس ہوتی ہے ان سب خصوصیات کے علاوہ ان کے مضامین کی وقعت کا راز ان کی تحقیقات اور نکتہ رسی میں مضمر ہے۔

سجاد انصاری بہت جلد مر گئے ورنہ طرز تخیل و تحریر سے عبدالرحمان بجنوری کی طرح اردو انشاپردازی کو ایک نئے اور شاندار راستہ پر لگا دیتے زور کے ساتھ ندرت و اختراع ان کے اسلوب نگارش کا خاص جوہر ہے لب و لہجہ کی بلندی، بیان میں جوش اور ابھار، ذہن کو بالیدگی کی طرف فوراً رجوع کر دیتے ہیں۔ طرز تحریر کی دلکشی میں اگر معنویت بھی شامل کر لیجئے جو ان کے یہاں کثرت سے ملتی ہے، تو پھر اتنا بلند پایہ مضمون نگار آپ کو اردو میں شاید کوئی نہ ملے گا۔ وہ اپنے خیالات کو پیش کرنے میں جس بیباکی و جرات رندانہ سے کام لیتے ہیں وہ پڑھنے والے کو اس طرح مسحور کر لیتی ہے کہ اگر کہیں اختلاف رائے بھی ہو تو کچھ خلاف کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہر ہر قدم پر ان کے کمالات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

مضامین کے سلسلہ میں دوسرے مضمون نگاروں کا تذکرہ یا تو رسائل کے

ساتھ ہوگا یا مزاح کے عنوان میں آئے گا۔ یہاں تک مضامین کے کتابی مجموعوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رجحان روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ داخلی پہلو پر زیادہ توجہ ہے تنوع مضامین سے دائرہ وسیع کیا جارہا ہے۔ اظہار خیال میں ذات پات سے الگ ہوکر نفسیات پر غور کیا جارہا ہے موضوع کے ارتقا و شباب پر اکثر حکیمانہ و مورخانہ انداز سے بحث چھیڑی جاتی ہے جس سے مضمون کی وقعت کافی اہمیت اختیار کرلیتی ہے۔

اس سے بھی انکار نہیں کہ جیسے ہر صنف میں کچھ لوگ ایسے آجاتے ہیں جو محض لکھنے کے لیے لکھتے ہیں۔ ویسے ہی مضمون نویسی کے میدان میں بھی تیسرے درجہ کے مضمون نگار پیدا ہو گئے ہیں جو کچھ ادھر سے، کچھ ادھر سے خوشہ چینی کرکے اپنا کام نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ نام و نمود کی خواہش میں مضمون نگاری کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ لیکن تحریریں جان ہوتی ہے نہ مواد میں ـــــ کاش یہ لوگ لکھنے سے زیادہ مطالعہ کی فکر کرتے

مزاح دور حاضر میں مزاح کا ایک مستقل رجحان ہوگیا ہے اور خوشی اس کی ہے کہ ترقی یافتہ صورت میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اردو کے اخبارات و رسائل میں ایسی تحریریں عام ہو چکی ہیں۔ مزاحیہ مضامین آئے دن چھپتے رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ متانت کے ساتھ بلندی بھی اختیار کرتے جاتے ہیں۔ گرد و پیش کے واقعات اور روزمرہ کے مسائل حیات پر ظریفانہ انداز میں تنقید کرنا ان مضامین کی عام خصوصیت ہے۔ گھریلو اور مقامی زندگی، اس کی جزئیات کا مطالعہ، اور پھر اس کی اصلاح، ہمارے مزاح نگاروں کا عام مقصد ہے۔

اعداد و شمار کے لحاظ سے تو کافی سے زیادہ مزاح نگار پیدا ہو گئے ہیں جو اخبارات و رسائل کو اپنی بذلہ سنجی سے شگفتہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر لکھنے کے لئے لکھتے ہیں، ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گو خود ہنسنا نہیں جانتے۔ طرز بیان و طرز تخئیل دونوں میں سوقیت اور پھیکاپن نمایاں رہتا ہے۔ نہ ان کے مذاق کا کوئی پس منظر ہوتا ہے اور نہ خود ان کا کوئی مقصد، بجز اس کے کہ لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہو جائیں۔

مزاحیہ رجحان اور ظریفانہ ادب کی سطح بلند کرنے والوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ، پروفیسر رشید احمد، پطرس، عظیم بیگ کنھیا لال کپور، فکر تونسوی وغیرہ ہیں ان کی نظر فن و ادب دونوں پہلوؤں پر رہتی ہے۔ ان میں اکثر اہل قلم ایسے ہیں جو اپنے مذاق کو بلند رکھنا چاہتے ہیں وہ کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کی تعمیر میں جو امور کار فرما ہیں ان کا تجزیہ کریں اور مزاحیہ انداز میں اپنے مشاہدات پیش کر دیں تاکہ سمجھنے والے اپنے گرد و پیش کے واقعات سے انبساط قلب حاصل کر لیں اور اگر ممکن ہو تو زندگی کو بھی سنوار لیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے مضامین کو خاص ذکاوت و انشا پردازی سے اتنا دلکش بنا دیتے ہیں کہ غیر دلچسپ مواد بھی غیر معمولی شگفتگی پیدا کر دیتا ہے زبان کی لطافت، جملوں کی چستی، زور طبیعت مجموعی حیثیت سے ایک ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں جس میں معنی خیز تبسم کی ایک لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ اسلوب نگارش کی خوبی واقعیت کی کمی کو زیادہ نہیں ابھرنے دیتی۔ پاکیزگی و حسن ادا ان کے مضامین کے خاص جوہر ہیں۔

رشید احمد صاحب نے اردو مزاح نگاری میں ایک ایسی کمی پوری کر دی جس کے بغیر ہر شے میں کچھ کمی نظر آتی تھی۔ زبان و لطافت پر تو دوسرے لوگ بھی توجہ دے رہے تھے لیکن علمیت کا فقدان ظریفانہ ادب کے پلڑے کو ہلکا کر دیتا تھا۔ رشید احمد صاحب نے اپنی قابلیت و طباعی سے رفتہ رفتہ اس کمی کو بھی پورا کر دیا۔ ان کے مضامین میں فکری عنصر اور لطیف اشارے نہایت وسیع و عمیق ہوتے ہیں۔ مقامی واقعات اور کبھی کبھی ملک کے دیگر مسائل پر بھی ایک خاص عالمانہ انداز میں اس طرح بحث کرتے ہیں کہ گویا الفاظ میں مسکراہٹ اور مفہوم میں گدگدی پیدا ہو گئی ہے۔

طوالت پسندی آپ کی مزاح نگاری کا طرہ امتیاز ہے۔ بیان و عبارت دونوں میں یہ عنصر نظر آتا ہے۔ ایک بات کہتے کہتے اپنے مرکز سے ہٹ جاتے ہیں اور پھر "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا" "یا آدم بر سر مطلب" کہہ کر اصلی بات پر آجاتے ہیں۔ اس انداز سے کسی قدر الجھن ضرور ہوتی ہے مگر فطری گفتگو کا لطف بھی آجاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسی چیزیں بھی اپنے مضامین میں قلم بند کرتے ہیں جو بالکل مقامی ہوتی ہیں اور عام طور سے پڑھنے والے ماحول کی ناواقفیت سے لطف نہیں اٹھا سکتے۔ مگر اس میں مضمون نگار کی خطا کم ہے شکایت کرنے والوں کی زیادہ!

پطرس نے اپنی ذکاوت و نکتہ رسی سے ظریفانہ ادب میں چار چاند لگا دیئے۔ ان کی محاکاتی صلاحیت اور بیان و زبان کو حسب ماحول تربیت دینے کی قابلیت ذہن کو ہر وقت دلچسپی سے وابستہ رکھتی ہیں۔ ان کے مضامین ادبیت سے آراستہ ہونے کی وجہ سے شگفتگی کے ساتھ کیف بھی پیدا کرتے رہتے ہیں

جس کی وجہ سے دل و دماغ دونوں بیک وقت لطف اندوز ہوتے ہیں اور اثر بھی دیرپا ہو جاتا ہے۔

مزاحیہ رنگ میں کردار نگاری پطرس کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ ہر شخص اور چیز کی خصوصیات پر خاص نظر رکھتے ہیں اور اس طرح بیان کرتے ہیں کہ صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سنجیدگی و اعتدال کا ان کو ہر وقت خیال رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی طرز تحریر سے مسرت و انبساط کا ہر گوشہ شگفتہ ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ انھوں نے اب لکھنا ترک کر دیا ہے۔ جس سے کہ نمایاں کمی محسوس ہو رہی ہے کیونکہ اس فن کو ترقی دینے کی ان میں کافی صلاحیت تھی۔

ملا رموزی نے اپنی گلابی اردو سے مزاحیہ افسانہ کو ایک نیا راستہ بتا دیا شوکت تھانوی نے خانگی زندگی کو اس خوبصورتی کے ساتھ مزاحیہ رجحان میں شامل کر لیا کہ جو مجموعی حیثیت سے پورے طرز معاشرت کا آئینہ بن گئی۔ فرد کی بد مذاقی یا کمزوری سے جو کل سماج پر اثر پڑ سکتا ہے وہ خانگی زندگی کی تہہ میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ وہ مواد کی کمی کو اپنی عبارت آرائی و زور طبیعت سے پورا کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی شاید کثرت فرمائش یا عجلت کی وجہ سے شوکت کی بعض تحریریں ان کے عام معیار تک نہیں پہنچتی ہیں۔ پھر بھی فطری شگفتگی و برجستگی ہر جگہ نمایاں ہے لیکن اگر ان کی ذہانت وطباعی کا بہترین نمونہ دیکھنا ہے تو "سودیشی ریل" ملاحظہ فرمائیے جو مجموعی حیثیت سے ہر مزاح نگار کے لئے باعثِ فخر ہو سکتی ہے۔

امتیاز علی تاج بھی خانگی زندگی سے اپنے مزاح کا مواد حاصل کرتے ہیں

کردار کی مذبوحی حرکات میں نمک مرچ لگا کر ہنسنے ہنسانے پر مائل کرتے ہیں، ظرافت نگاری میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ "چچا چھکن" ہے جو اردو میں 'حاجی بغلول' کی طرح ایک مستقل کردار بن گیا ہے۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اب اس صنف سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کا کمال یہ ہے کہ وہ واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں یعنی صورت حال کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ کردار اور ان کے کارنامے مضحک ہو جاتے ہیں۔ "ان کے مضامین کا مواد عموماً مار پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور مار پیٹ کی ...... مختلف حالتوں کو الفاظ کی صورت دیتے ہوئے (چغتائی) نہ صرف مزاح کو صحیح تحریک دیتا ہے بلکہ زندگی اور حقیقت کی بھی ترجمانی کرتا ہے اس کے کردار تقریباً ہمیشہ وہ نوجوان لڑکے لڑکیاں ہوتے ہیں جن کا خون تازہ اور گرم، جن کے دل امنگوں سے لبریز، اور جن میں روح حیات کی مچلتی ہوئی موجیں ایک دوسرے سے ٹکرانے کو بیتاب ہوتی ہیں۔"[1]

"ہری چند اختر نہ صرف 'پیروڈی' بہت لطیف لکھتے ہیں بلکہ ان کے مزاحیہ مضامین کا پایہ بھی بہت بلند ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 'غالب کی سوانح عمری' ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے اردو کے بہترین مزاحیہ مضامین کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔"

جدید طنز نگاروں میں سالک اور کنھیا لال کپور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ان کے چبھتے ہوئے جملے اور لطیف طنز ترقی یافتہ و پاکیزہ ذوق کا پتہ دیتے ہیں۔ کپور کی طنزیات کا مجموعہ "شیشہ و تیشہ" شائع ہو چکا ہے۔

---

[1] ادبی دنیا نومبر ۱۹۴۲ء

مزاح نگاری کا یہ رجحان اور لکھنے والوں کی یہ رفتار فنی لحاظ سے کافی اطمینان بخش ہے۔ اردو اپنی صلاحیتوں سے عمدہ لکھنے والوں کی ہمت افزائی اور معمولی یا یوں ہی لکھنے والوں کی کانٹ چھانٹ میں معروف ہے جن میں فطری ذوق یا وسیع مطالعہ کی کمی ہے وہ آگے نہیں بڑھ رہے ہیں لیکن جو صحیح معنی میں صاحب ذوق و علم ہیں وہ قلم سنبھال کر قدم روکتے ہوئے میدان ظرافت میں معقول طریقہ سے چل رہے ہیں۔ اور اعلیٰ ظریفانہ ادب پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب وہ دن زیادہ دور نہیں کہ اس صنف کو ایک بلند فنی حیثیت حاصل ہو جائے۔

اخبارات دور حاضر میں اخبارات بھی ادبی و سیاسی فضا سے متاثر ہیں۔ زبان، اسلوب، تخیل ہر ایک پر ماحول کا غلبہ ہے موجودہ جذبات نگاری و انشاپردازی میں زبان سہل استعمال کرنے کا عام خیال ہو گیا ہے۔ اس لئے اخباروں کی بھی زبان عموماً آسان و عام فہم ہے۔ اس سے پہلے اصطلاحی الفاظ انگریزی زبان سے مستعار لئے جاتے تھے لیکن اب زیادہ تر اردو ہی کے الفاظ ان کی جگہ صرف کئے جاتے ہیں۔ خواہ اس کو آپ 'دارالترجمہ' کی برکت سمجھیں یا لوگوں کا اپنی زبان سے انس کا ثبوت خیال کریں۔ بہر حال عام رویہ یہی ہے کہ خانہ ساز الفاظ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ طرز نگارش میں سادگی و تاثیر پر زیادہ توجہ ہے الہلال یا زمیندار کی علمیت و دقت پسندی کا رواج ختم ہو چکا ہے، تحریر میں جو خطابت کا عنصر شامل ہو گیا تھا وہ بھی کم ہو گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ختم ہو گیا ہے۔ ہاں بعض اخبارات ایسے ضرور ہیں جن میں ضرورت سے زیادہ ہندی الفاظ آتے رہتے ہیں زبان کے اعتبار سے ان کی عبارت آج بھی دکنی اردو کی طرح عام فہم نہیں رہ جاتی۔

سیاسی مسائل پر زیادہ پُر مغز و جاندار مضامین اخبارات میں آتے ہیں عام ذہنی سطح کے بلند ہونے کی وجہ سے اخباروں کا بھی مطمح نظر اپنے حدود میں عموماً بہتر اور قاعدہ کا ہوتا جا رہا ہے۔ جذبات سے زیادہ ذہن کو دلائل سے متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے چونکہ خبر رسانی کے ذرائع زیادہ آسان ہو گئے ہیں اس لئے خبریں بھی جلد اور صحیح ملنے لگی ہیں۔

دور حاضر میں ان ترقیوں کے بعد اس تنزل کا بھی ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ اخباروں کو وہ بلند پایہ مدیر نہ نصیب ہو سکے جو اپنی انشاپردازی و قابلیت اور ہر دلعزیزی کی وجہ سے دور جدید میں ایک خاص اعزاز و احترام کے مالک تھے۔ اس کے ثبوت کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ریاض، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، سجاد حسین، ممتاز حسین و سید جالب یہ ایسے ایڈیٹر تھے کہ جن کے علم و فضل کا احترام ہر دل میں تھا۔ ان کی وجہ سے آسمانِ صحافت میں چار چاند لگ گئے تھے۔ آج ایسے بلند پایہ ایڈیٹر کہیں نظر نہیں آتے۔

اردو اخبارات کی راہ ترقی میں جو مالی دقتیں ہیں ان کی وجہ سے یوں تو مختلف نتائج ظہور میں آتے رہتے ہیں لیکن سب سے بڑا اثر ذہنیت پر پڑتا ہے جس کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مضمون نگار لکھتا ہے کہ "(۱) وہ اخبار جن پر ہمارے لیڈروں کی طرح ابھی تک انگریزی حکومت کا رعب چھایا ہوا ہے ....
(۲) وہ جو ذرا اس منزل سے آگے ہیں مگر پھر بھی زیادہ دور جاتے ہوئے انھیں ڈر لگتا ہے .... (۳) وہ جو بہت آگے نکل گئے ہیں لیکن چونکہ قوم ان کے پیچھے نہیں اس لئے صرف چند ساتھیوں کے ساتھ سنسان بیابانوں میں اکیلے

گھوم رہے ہیں........ چوتھا طبقہ ان اخبارات کا ہے جن کے ارباب کار کا
مقصد اپنی لیڈری کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں. چنانچہ یہ اخبارات ہر مسئلہ
کو صرف اپنی لیڈری کی آنکھ سے دیکھتے ہیں لیڈری کی آنکھ کے علاوہ اور کوئی
آنکھ ان کے پاس نہیں ہوتی. ...... پانچواں طبقہ وہ ہے جس میں......
چند لیڈروں کے مجموعہ کو سراہنا ہے. چھٹی قسم وہ ہے جس میں صرف نام پیدا کرنے
یا بے روزگاری سے تنگ آکر کچھ پیسے کمانے کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں ہوتا."
اس ذہنی تجزیہ میں ایک نظریہ یہ بھی کارفرما ہے کہ مذہبی و فرقہ دارانہ جذبات
سے شاید کوئی اخبار خالی نہیں اور نظام معاشرت و سیاست پر تبصرہ کرنے میں عموماً
اسی نقطۂ نگاہ سے کام لیا جاتا ہے. رواداری اور وسیع النظری فضا میں عام نہیں
ہو سکی اور غالباً ابھی بہت عرصہ تک کسی صحت بخش و آزاد رویہ کا انتظار کرنا پڑے گا.
اس سلسلہ میں "انجمن ترقی اردو کے پندرہ روزہ اخبار" ہماری زبان" کا
ذکر کرنا بھی ضروری ہے. کچھ عرصہ سے یہ اخبار موجودہ اردو ہندی نزاع کے سلسلہ
میں اردو کی زبردست حمایت کے لئے جاری کیا گیا ہے. آئے دن مفید اور پُر از
معلومات مضامین نکالتا رہتا ہے اور اردو کے معترضین کو دنداں شکن جوابات دیتا رہتا ہے.
موجودہ جنگ کی وجہ سے گورنمنٹ کی طرف سے بھی ایک پندرہ روزہ اخبار
"مرکزی اطلاعات" کے نام سے شائع ہو رہا ہے جس کی طباعت دیدہ زیب ہے
اس میں جنگ سے متعلق خبریں، تصویریں وغیرہ برابر شائع ہوتی ہیں اور اس
زمانہ کی مشینی لڑائی کے سلسلہ میں سیکڑوں نئے الفاظ دوسری زبانوں سے ترجمہ
ہو کر آرہے ہیں آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے بھی ایک اخبار "آواز" کے نام سے شائع

ہوا ہے جو بہت سی صوری و معنوی خوبیوں کا حامل ہوتا ہے اکثر ضروری الفاظ
معلومات بہم پہنچاتا رہتا ہے۔

اس قسم کے اخباروں سے ہماری صحافت کا صوری معیار تو ضرور بلند ہو گیا ہے۔ مگر ابھی ہمارے اخبار دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے اخبارون کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ اور پھر اس لڑائی کے زمانہ میں کاغذ اتنا عنقا ہوتا جا رہا ہے کہ صحافت اس کی وجہ سے اور دبی جا رہی ہے حالانکہ بہت پہلے ہی سے اردو صحافت سرمایہ کی کمی محسوس کر رہی تھی۔ ممکن ہے دنیا کے بدلتے ہوئے نظام میں اور ہندوستان کی آزادی کے بعد ہماری صحافت بھی قومی ضروریات کی وجہ سے جلد وہ بلند درجہ حاصل کرلے جو ہر ترقی یافتہ زبان کی صحافت کے لئے ضروری ہے۔

رسائل

دورِ جدید اور دورِ حاضر کے رسالوں میں کافی فرق نظر آتا ہے معناً کے لحاظ سے سطح بلند ہو گئی ہے۔ فکری عنصر و داخلی پہلو پر زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ انگریزی الفاظ ہمیشہ سے کم استعمال کئے جا رہے ہیں۔ عبارت میں سادگی و تاثیر پیدا کرنے کا احساس رفتہ رفتہ عام ہوتا جا رہا ہے۔ حصۂ نظم میں غزلوں کے بجائے نظموں کا قبضہ کچھ تیزی کے ساتھ بڑھ گیا ہے۔ پنجاب کے رسالوں کو طباعت واشاعت کا بھی خاص خیال رہتا ہے۔ سرورق کو تصویر اور مختلف رنگوں کے امتزاج سے دیدہ زیب بنانا ان کا خاص کارنامہ ہے یہ فن کاری یہیں نہیں ختم ہو جاتی بلکہ لکھائی وچھپائی میں بھی حسن پیدا کرنے کی سعی مشکور نمایاں ہے۔ اس خوبصورتی کا اثر صرف پنجاب تک محدود نہیں بلکہ یہ مذاق عام ہو گیا ہے اور تمام

اردو رسالے متاثر ہو رہے ہیں۔ حسب توفیق اپنے کو سنوارنے میں مصروف ہیں۔ مذاق و موضوع کے لحاظ سے رسالوں میں وہ تمام چیزیں آتی رہتی ہیں جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے مثلاً تنقید، تاریخ، افسانہ، ڈراما، سیرت نگاری وغیرہ۔ طرز تحریر و تخئیل کی خصوصیات کم و بیش وہی ہیں جن کا بیان آپ مختلف رجحانات کے سلسلے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یہاں [illegible] تفصیل حاصل ہے۔

اس دور کے رسالوں میں [illegible] زیادہ ادبی و علمی پہلو نمایاں ہے۔ قریب قریب ہر مدیر اس اصول کو پیش نظر رکھ کر اپنے رسالے کا خاص نمبر شائع کرتا ہے جس میں کسی ادیب یا شاعر پر مبسوط تنقید ہوتی ہے یا کسی دور کی شاعری یا ایک صنف پر مختلف اہل قلم کے مضامین ہوتے ہیں جو بحیثیت مجموعی ایک مستقل تصنیف کا کام دیتے ہیں مثلاً نگار کا مومن نمبر، نظیر نمبر، ساقی کا افسانہ نمبر، اردو کا اقبال نمبر، زمانہ کا حالی نمبر، پریم چند نمبر، ایشیا کا مکاتیب نمبر، اور الہ آباد یونیورسٹی کے نیساں کا جوبلی نمبر، کارواں (الہ آباد) کا خاص نمبر، اسی طرح کے اور بہت سے رسائل کے مخصوص و مختلف نمبر اردو ادب میں اپنی کارگزاریوں سے اضافہ کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

خاص نمبر کے علاوہ رسالوں کے سال نامے بھی ایک نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ ضخامت و تنوع کے لحاظ سے مدیر چاہتا ہے کہ مختلف اہل قلم سے مضامین لکھا جائیں اور جہاں تک ممکن ہو جامع و مانع ہوں۔ چونکہ خاص التزام سے سال نامے شائع ہوتے ہیں اس لیے لکھنے والے بھی کافی توجہ کے ساتھ مضمون تیار کرتے ہیں۔ یہ مضامین موضوع کے اعتبار سے ایک ہی شخص یا صنف کے متعلق نہیں ہوتے گوناگوں مسائل و اصناف سخن کی وجہ سے خاص دلچسپی و تفریح کا سامان اپنے دامن میں لئے

ہوئے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہمیں ان رسالوں کو بھی نہ بھولنا چاہیے جن کو ایک خاص شعبہ جاتی حیثیت حاصل ہے اور جو ایک مخصوص فن کی ترویج و ترقی کے لئے کوشاں ہیں، مثلاً بعض رسالے صیغۂ تعلیم سے متعلق ہیں بعض فن طب سے وابستہ ہیں بعض صرف سینما سے دلچسپی لیتے ہیں اور بعض زراعت کو سرسبز کرنا چاہتے ہیں اور بعض دینیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان سب رسالوں کی اجتماعی حیثیت نہایت بامعنی و کارآمد ہے فنون و علوم کا کارآمد ذخیرہ ان کی وجہ سے اردو میں بڑھ رہا ہے اور ایک ایسا خزانہ زبان میں آرہا ہے جو شاید کسی اور طریقہ سے ممکن نہ ہوتا۔

دورِ حاضر میں جو رسالے اردو کی دنیا میں زیادہ نمایاں و ادبی ہیں، ان میں اردو، سائنس، ہندوستانی، نگار، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، ساقی، زمانہ، ادب لطیف، ہمایوں، نیا ادب، کلیم، جامعہ، معارف، ایشیا، سب رس، اپنی خدمات کی وجہ سے ایک خاص شہرت کے مالک ہیں۔ ان کا مذاق باعتبار زبان و موضوع ادبی و علمی معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ مضامین عموماً پرمغز و کارآمد ہوتے ہیں سیاسی اقتصادی تاریخی، تنقیدی مسائل پر اچھے مضامین برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

رسالوں کا رجحان اس عہد میں تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے علاوہ اور خوبیوں کے ایک یہ بھی پہلو دیکھنے کے قابل ہے کہ زیادہ تو نہیں مگر کافی تعداد میں ایسے رسالے بھی جاری ہیں جو بچوں اور عورتوں کی دلچسپی و ذہنیت کو مدنظر رکھتے ہیں اپنے مخصوص حلقوں کی ذہنی ترقی پر نظر رکھنا ان کا خاص منشا ہے۔ لیکن مالی دقتوں اور حسب خواہش دلچسپی نہ پانے کی وجہ سے معیار اتنا نہیں بلند ہو سکا جتنا انگریزی رسالوں

کا ہے۔

ہم اس سے بھی بے خبر نہیں کہ کافی تعداد میں ایسے رسالے نکلتے ہیں جو نام ونمود یا کھانے کمانے کے لئے ہوتے ہیں۔ ان کا مذاق ومعیار دونوں پست ہیں۔ یہ حشرات الارض کی طرح آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور چند دنوں کے بعد مر جاتے ہیں لیکن جلد ختم ہو جانے والے رسالوں میں کبھی کبھی مالی دقتوں کی وجہ سے ایسے رسالے بھی بند ہو جاتے ہیں جو واقعی ادبی خدمت کے جذبات لے کر دنیائے ادب میں آتے ہیں۔ ایسے رسالوں میں منجملہ اور رسالوں کے "ادب" لکھنؤ اور "کاروان" لاہور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخرالذکر کے صرف دو ہی نمبر لاہور سے نکل سکے تھے لیکن صوری ومعنوی خوبیوں سے اس رسالے کو جو دو نمبروں میں اہمیت و وقعت نصیب ہوئی وہ ہر رسالے کے لئے باعث رشک ہو سکتی ہے۔

مالی دقتوں کی وجہ سے ہمارے رسالوں کا معیار حسب خواہش بلند نہیں ہو رہا ہے۔ نہ رسالے نامہ نگاروں کی پوری دلجوئی کر سکتے ہیں اور نہ نامہ نگار رسالوں کو اپنی کاوش سے سرفراز کر سکتے ہیں۔ اچھے لکھنے والے اردو میں تھوڑے سے ہیں اور اس میں بھی بہت کم ایسے ہیں جو "غم روزگار" سے بے نیاز ہوں اور بغیر کسی صلہ کے زیادہ توجہ اور وقت مضمون لکھنے میں صرف کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بلند پایہ مضامین یا افسانے زیادہ تعداد میں ہمارے سامنے نہیں آتے۔

اردو نثر کے اس جائزہ سے اس کی وسعتوں اور صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ اردو شاعری کے دوش بدوش چل کر زندگی کو تمام

اہم مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی ہے۔ لوگوں کی روز افزوں توجہ اور خود نثر کی ارتقائی قوتیں ایک زرین مستقبل کا پتہ دیتی ہیں۔ مگر پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک مختلف علوم و فنون پر اردو نثر نے کافی توجہ نہیں کی۔ ریاضیات جمالیات، فلسفۂ سیاسیات، اقتصادیات، مصوری وغیرہ پر اگر ڈھونڈھئے تو تصنیفات نہ ملنے کے برابر ملیں گی اور یہ کمی غالباً اس وقت تک حسب خواہش پوری نہ ہو سکے گی۔ جب تک زبان حکومت کی سرپرستی سے محروم ہے۔

پیروڈی

نوٹ۔ پیروڈی اور رپورتاژ اردو میں دورِ حاضر کی پیداوار ہیں
ان کے وجود کا راز علاوہ اور باتوں کے نئے تجربات کی تلاش
اور ہیئت و مواد کے نئے اسلوب کی فکر میں مضمر ہے مذاق نو کی
ناہمواری اور جنسی خواہشات کی شدت پر موجودہ پیروڈی
ایک اچھی خاصی تنقید ہے بہرحال اب یہ دونوں رجحانات
کی صورت اختیار کر چکے ہیں اس لئے اس تازہ ایڈیشن میں
ان کا بھی تذکرہ کرنا ضروری سمجھ کر پیش کیا جا رہا ہے۔

ہمارے ادب میں پیروڈی مغربی ادب سے آئی ہے گو اس کا وجود اردو میں فی الحال نوادر کی طرح ہے ابھی اس کو کوئی خاص مرتبہ نہیں مل سکا مگر اس کی خصوصیات نے دلوں کو اس کی طرف ایسا مائل کر دیا ہے کہ لوگ عام طور سے دلچسپی لینے لگے ہیں یہاں تک کہ اس نے ایک رجحان کی صورت اختیار کر لی ہے اس لئے اس کے متعلق بھی کچھ لکھنا نہ صرف مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پیروڈی یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مفہوم جوابی نغمہ ہے۔ دراصل اس صنف کی بنیاد یونان ہی میں پڑی تھی، جب فکر یہ لحات سے لوگوں کو فرصت ملتی اور جشن کا وقت آتا تو غم وفکر سے آزاد ہو کر شراب کا دور چلتا رقص و سرود کا بازار گرم ہوتا اسی وقت لڑائیوں کے پُر لطف مواقع اور کرداروں کا ذکر آتا، دیوتاؤں اور دوسری عظیم الشان ہستیوں کی مختلف سماجی یا تفریحی زندگی کا چرچا ہوتا اسی کے ساتھ ساتھ بڑے کرداروں کی طرح کم پایہ کرداروں کا بھی بیان ہوتا، مشہور نظموں کی بنیاد پر معمولی مسائل اور روزمرّہ کی زندگی کو بھی نظم کیا جاتا جس کا منشا زیادہ تر تفریح ہوتا۔ چونکہ ہنسنے ہنسانے کا مادّہ انسان میں روز ازل سے ہے وہ رونے سے زیادہ ہنسنا پسند کرتا ہے اس لئے یونان والے خوشی کے موقع پر کبھی کبھی بڑی مقبول نظموں کا لب ولہجہ لے کر اسی طرح کی دوسری نظمیں کہتے جن میں عموماً روزمرّہ کے حالات اور زندگی کے معمولی مسائل کا بیان ہوتا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ایک صنف کا وجود قائم ہو گیا جس کو 'پیروڈی' کے نام سے یاد کیا گیا۔ ارسطو نے بتایا ہے کہ یہ صنف پانچویں صدی قبل مسیح میں وجود میں آئی اس کا خیال ہے کہ ہیگومن نے پہلے پہل Giganto Machia دیوزادوں کی جنگ، لکھ کر پیروڈی کی داغ بیل ڈالی لیکن بعض ادبی مورخین کا خیال ہے کہ اس سے بھی پہلے ہپوناکس نے ہومر کی ایک نظم کی پیروڈی کی ہے ہومر کی نظم میں عظیم المرتبت سپاہیوں کے کارنامے بیان کئے گئے تھے۔ ہپوناکس نے اس کا لب ولہجہ و انداز بیان لے کر ایک نظم

لکھی جس کا عنوان اردو زبان میں یہ ہو سکتا ہے" مینڈھکوں اور چوہوں کی جنگ" اس نظم میں بھی فریقین، سپہ سالاروں کے لب ولہجہ میں گفتگو کرتے دکھائے گئے ہیں ان کے کردار بھی مبالغہ کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں مینڈھک اور چوہوں کے سپاہی بھی انسانوں کی طرح جنگ میں حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔ غرض کہ پیروڈی بہت قدیم زمانے سے شروع ہو گئی تھی۔

پیروڈی یونان سے نکل کر یورپ کے دوسرے ممالک پر بھی اثر انداز ہوئی چنانچہ انگلستان میں بھی اس کا چرچا نشاۃ الثانیہ کے ابتدائی دور میں ہو گیا تھا انگریزی کے دیگر اصناف کی طرح اس صنف کا بھی موجد چاسر سمجھا جاتا ہے اسی وقت سے نظم و نثر دونوں میں پیروڈی کا رواج انگریزی ادب میں ہونے لگا داستانوں میں نظموں میں لوگ اس صنف پر طبع آزمائی کرنے لگے لیکن رزمیہ موضوعات پیروڈی کے لئے زیادہ زرخیز میدان ثابت ہوئے ادبی محاسن کی طرف بھی اس صنف نے توجہ کی۔ وکٹوریہ کے عہد حکومت میں پیروڈی زیادہ تر چھوٹی چھوٹی نظموں میں آتی رہی۔ امریکہ میں اس کا رواج بہت دیر میں ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ صنف دنیا کے اور ادبی محاذ پر بھی نظر آنے لگی۔ یہاں تک کہ ناقدوں نے بھی توجہ کی اور اس کی خصوصیات کو مدنظر رکھ کر کچھ اصول مرتب کر لئے۔ ان کے نزدیک پیروڈی کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) لفظی۔ جس میں ایک لفظ کے بدلنے سے اصل تحریر مضحک ہو جاتی ہے جیسے غالب کا یہ شعر کہ :-

سو سال سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اس کو ایک مزاحیہ نگار نے یوں بدل کر پڑھا کہ

سو سال سے ہے پیشۂ آبا گدا گری　　کچھ ساعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

(۲) طرزی۔ جس میں کسی مصنف کی طرز تحریر کو کسی مزاحیہ موضوع میں صرف کیا جائے۔ جیسے غالب کا یہ شعر کہ

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا　　نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اس کو کسی نے اس طرح بدل لیا ہے کہ

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ در گڑھیا　　پڑے رہتے مثل مینڈھک وہیں غائیں غائیں کرتے

(۳) موضوعاتی۔ جس میں مصنف کی طرز تحریر، لفظوں کی سجاوٹ اور انداز فکر کو رد و بدل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اول الذکر دونوں اقسام مزاح پر مبنی ہیں لیکن تیسری قسم زیادہ ترسنجیدہ اور فن کاری کا نمونہ ہوتی ہے۔

پیروڈی کسی مقبول یا مشہور نظم و نثر کے زیر سایہ وجود میں آتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اصل نظم یا نثر جسم ہے اور پیروڈی اس کی پرچھائیں جب تک کوئی چیز پہلے سے نہ موجود ہو پیروڈی ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔

گویا پیروڈی کو اصلاً کسی نظم یا نثر سے واسطہ ہوتا ہے جس کو یہ مزاحیہ انداز میں کسی قدر تبدیلی کے ساتھ پیش کرتی ہے جس میں ایک تنقیدی عنصر بھی ہوتا ہے اسی لئے اچھا پیروڈی نگار وہی ہو سکتا ہے جو علاوہ اور باتوں کے اصل مصنف کی روح کو سمجھ سکا ہو جو یہ بھی سمجھتا ہو کہ مصنف کا مقصد کیا ہے اس کے مفہوم کی اہمیت کتنی ہے۔ پیروڈی نگار کو موزوں طبع

ہونے کے علاوہ لطافت پسند و سنجیدہ مزاج بھی ہونا چاہیئے یہ نہ محسوس ہونا چاہیئے کہ وہ یہ پیروڈی محض ہنسانے کے لیے لکھ رہا ہے۔ اس کا کلام دوسروں میں گدگدی پیدا کر دے مگر یہ نہ محسوس ہو کہ وہ گدگدانے کے لئے انگلیاں بڑھا رہا ہے۔

پیروڈی کا مقصد کسی کا مذاق اڑانا نہیں ہوتا بلکہ مصنف یا نظم کی طرف لوگوں کو بہ انداز دگر متوجہ کرنا بھی ہوتا ہے۔ اصل شاعر یا ادیب کی نظم یا نثر کو ایک تازگی ایک شگفتگی عطا کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔ پیروڈی نگار کو ہمیشہ آسان زبان اور سہل الوصول خیالات سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ اس کی بات آسانی سے دلوں میں جگہ پا سکے اس کو اصل نظم کے پیرایۂ بیان کو مبالغہ کے ساتھ اشعار میں پیش کرنا پڑتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کو یہ بات خاص طور پر مدنظر رکھنا پڑتی ہے کہ پیروڈی اتنی رواں دواں ہو یعنی الفاظ، بیان و خیال کے لحاظ سے اتنی جاذب توجہ ہو کہ اس کے ذہن نشین ہونے میں سننے والوں کو خاص دقت نہ ہو۔

یہی نہیں کہ اس صنف کی بنیاد کسی دوسری نظم یا نثر پر ہے بلکہ پیروڈی نگار کو کبھی کبھی اصل نظم یا نثر کے اقتباسات بھی خفیف تغیر کے ساتھ جابجا دوران تحریر میں پیش کرتے رہنا چاہیئے تاکہ لوگوں کا ذہن اصل نظم یا نثر کی طرف منتقل ہوتا رہے۔ پیروڈی اور اصل میں وہی نسبت ہے جو مصوری اور کارٹون میں جس طرح کارٹون بنانے والا شکل یا تصویر کو سامنے رکھکر کسی خاص عضو یا جوہر کو مبالغہ کے ساتھ نمایاں کرتا ہے اسی طرح پیروڈی

لکھنے والا اصلی نظم یا نثر کے مواد، تیور، طرزِ بیان، لب و لہجہ یا کسی خاص عنصر کو اپنے انداز بیان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ابھار کر قلم بند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عام خیال ہے کہ پیروڈی کا منشا تضحیک یا مزاح ہے یہ کُلیتاً صحیح نہیں جیسا ہم نے اُوپر عرض کیا اس کا مقصد شاعر یا ادیب کے کارنامے کو اور لوگوں کی یادداشت کو از سرِ نو تازہ کرنا رہتا ہے اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ پیروڈی میں مزاح کا عنصر غالب رہتا ہے لیکن یہ بھی سمجھنا ہے کہ یہ مزاح کیسا ہوتا ہے۔ پیروڈی اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہجو، طنز، یا ہزل سے بالکل جداگانہ چیز ہے۔ آخر الذکر اصناف میں شخصیات یا ذاتیات پر شاعر زیادہ توجہ کرتا ہے برخلاف اس کے پیروڈی میں ذاتیات کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ سنجیدگی کی لہر انداز بیان میں دوڑتی رہتی ہے اس کا مزاح شاعر کے انداز بیان یا طرز تخئیل پر مبنی ہوتا ہے۔ پیروڈی نگار کا مزاح تنقید کی لے پر دوڑتا ہے وہ اصل کلام کے جوہر کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہے طرزِ گفتار کو درپردہ سراہتا ہے وہ غیر شعوری طور پر یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کلام میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو مستحق توجہ و تنقید ہیں برخلاف اس کے ہجو کہنے والا زیادہ تر ادیب کے ذاتی معائب و نقائص پر نظر رکھتا ہے فنی خرابی کو ابھارنا چاہتا ہے ہزل گو بھی کسی کردار کی ذاتی خرابی یا مذاق عام کی پستی پر ایک تمسخر آمیز نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہے، ہجو یا ہزل گو کا مقصد بُرائی پر مبنی ہوتا ہے تنقید کے بجائے تنقیص مدنظر ہوتی ہے پیروڈی نگار کا مقصد ان

دونوں سے نسبتاً ارفع ہے۔ اس کو اُس نظم یا نثر کے مصنف سے محبت ہوتی ہے یا اس کے دل میں اس کا احترام ہوتا ہے جس کی وہ پیروڈی کرتا ہے پیروڈی اور ہجو یا ہزل کی حدیں بہت قریب سے گذرتی ہیں یہاں تک کہ بیک جنبش قلم پیروڈی کہنے والا ہجو گو ہو سکتا ہے اگر مذاق میں سنجیدگی یا بیان کے پس پشت تنقید کے بجائے تمسخر یا ذاتیات کا پہلو پیدا ہو جائے تو پیروڈی اپنی جگہ سے ہٹ کر ہجو کی حدوں میں داخل ہو جاتی ہے اس لیئے پیروڈی لکھنے والے کی ذمہ داریاں بہت ہیں ہر گام پر سمجھ بوجھ کر خیال آرائی کرنا پڑتی ہے ایک اور فرق ہجو، ہزل اور پیروڈی میں ہے۔ ہجو یا ہزل اپنی تخلیق ہو سکتی ہیں لیکن پیروڈی بغیر کسی اور تصنیف یا تخلیق کے وجود میں نہیں آسکتی گویا پیروڈی دو فنکاروں کی دست نگر ہے ایک تو وہ جو پہلے کوئی نظم یا نثر قلم بند کرتا ہے اور دوسرا وہ جو اس کی پیروڈی کرتا ہے اسی لئے نظم کی پیروڈی زیادہ ہوتی ہے نثر کی کم کیونکہ اوّل تو نثر طولانی چیز ہوتی ہے اس کا یاد رکھنا لوگوں کے لئے مشکل ہے اور دوسرے نثر کے اقتباسات کا درمیان تحریر پیش کرتے رہنا بھی کچھ عجب سا معلوم ہوتا ہے نظم میں عام طور سے یہ دقت نہیں ہوتی اس لئے بھی پیروڈی میں نظم کا ذخیرہ نثر سے زیادہ ہے۔ پیروڈی کی مدت حیات بھی اصل نظم یا نثر تک محدود رہے اگر اصل بے اثر ہو گئی یا لوگوں کے ذہن سے اتر گئی تو پیروڈی بھی بے کار ہو جاتی ہے وہ اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ اصل شے۔

یہ صنف اردو میں بالکل نئی ہے اس لئے بعض وقت پیروڈی لکھنے والے بہک جاتے ہیں کسی خاص موضوع کو سامنے رکھ کر مزاحیہ انداز میں کوئی نظم یا کہانی لکھ کر سمجھتے ہیں کہ پیروڈی ہو گئی مگر یہ خیال غلط ہے اس طرح پر تو پطرس، چغتائی، شوکت، کے کارنامے سب کو پیروڈی کہنا پڑے گا، ظریف، جعفری واکبر کے اکثر کلام کو پیروڈی سمجھنا پڑے گا حالانکہ ان لوگوں نے اپنے طور پر اوریجنل مضامین یا نظمیں کہی ہیں دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ ان لوگوں کے کارنامے اصل میں کسی دوسرے کارنامے کے سائے نہیں ہیں لہٰذا ان کو پیروڈی کہنا بالکل بے محل و نامناسب ہوگا۔

اردو میں جملہ خصوصیات کے ساتھ پیروڈی دور حاضر سے پہلے کہیں نہیں ملتی لیکن ہم اس کی گوناگوں خصوصیات پر نظر ڈالتے ہیں تو کافی اجزا ہمارے ادب میں ایسے ملتے ہیں جو پیروڈی کے مماثل ہیں یہ بالکل فطری بات تھی کہ شعرا ایک دوسرے کے اشعار پر کبھی کبھی اپنے طور پر تنقید کرتے ایک دوسرے کے کلام کا مذاق اڑاتے یا سراہتے اور اس جذبے کے تحت پیروڈی کی خصوصیات خود بخود پیدا ہو جاتیں چنانچہ یہ ہوا۔ مثال کے لئے انشا، مصحفی کی بعض نظموں کو لے لیجئے۔ مصحفی نے جب وہ غزل کہی جس کا مطلع ہے ؎

سر مشک کا ہے ترا تو کافور کی گردن ۔۔۔ نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

تو سید انشا نے اس غزل پر اعتراض کیا اور اسی زمین میں ایک

غزل کہی جس کا مطلع ہے ؎

توڑدوں گا خم بادۂ انگور کی گردن　　رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

اور اسی سلسلہ میں ایک قطعہ کہہ کر مصحفی کی غزل پر تنقید کی گویا غزل پیش نظر تھی اور اسی کی خامیوں کو مدنظر رکھ کر سودا نے غزل و قطعہ کہے اس طرح پیروڈی کا یہ مطالبہ پورا ہو جاتا ہے کہ کسی کے کلام کو موضوع گفتار بنایا جائے اس کا مذاق اڑایا جائے یا اس کی پیروڈی کی جائے کہ لوگوں کی توجہ اصل کلام کی طرف ہو جائے مگر پھر بھی صحیح معنوں میں اس ردیہ کو پیروڈی نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ انشا نے ذاتیات شامل کر لی ہیں۔

اس سلسلہ میں اردو شاعری کی دوسری خصوصیات بھی ایک ایک کر کے سامنے آتی ہیں اور دل و دماغ کو مجبور کرتی ہیں کہ ان پر بھی پیروڈی کے سلسلہ میں غور کر لیا جائے مثلاً کسی شاعر کی مشہور غزل کا ایک مصرع اس لئے مصرعہ طرح بنا دیا جاتا تھا کہ وہ غزل عام طور سے معیاری سمجھی جاتی تھی مثلاً رندؔ کی وہ غزل جس کا ایک شعر یہ ہے ۔

دکھایا کنج قفس مجھ کو آب ودانے نے　　وگرنہ دام کہاں میں کہاں، کہاں صیاد

یا غالبؔ کی اس غزل سے کوئی مصرع لے لیا جاتا تھا، جس کا ایک شعر یہ ہے ۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا　　اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

یا میرؔ یا کسی شاعر کی غزل کا کوئی مصرع لے کر اس پر دوسرے

شعرا طبع آزمائی کرتے تھے یا کرتے ہیں یہاں بھی ذہنی طور پر اپنے ہمعصر یا پیشرو شاعر کی عظمت پیش نظر سمجھئے غیر سعوری طور پر اصل غزل کا چرچا کچھ دیر کے لئے از سرِ نو ہونے لگتا سُننے والے اور شعر کہنے والے اس کو بغور سُنتے یا دیکھتے اور ساری فضا اصل شاعر کی غزل سے متاثر نظر آتی لیکن ایسے موقع پر بھی ہم کو پیروڈی کی شکل بھرپور نظر نہیں آتی ۔ اس مصرعۂ طرح پر ہر شاعر حسب استعداد اصل شاعر سے بڑھ جانے کی کوشش کرتا اپنی اپنی فکر میں ہر شخص رہتا بلکہ مسابقت کی روح پیدا ہو جاتی کسی کو یہ خیال نہ رہتا کہ میری وجہ سے اصل شاعر کو حیات نو نصیب ہو جائے یا اس کے تمسخر آمیز لب ولہجہ یا کلام سے اصل غزل ایک بار پھر فضا میں پوری توانائی کے ساتھ گونج اٹھے ۔ نہ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل شاعر کے موضوع یا طرز تخیل کو اتنا بدلنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پیروڈی کی تیسری قسم کا مطالبہ پورا ہو جائے ۔

اردو کے دوسرے اصناف میں بھی کبھی کبھی اس قسم کی جھلکیاں نظر آتی ہیں مثلاً مرثیہ میں اگر کبھی ایک مرثیہ گو کا کوئی بند یا شعر مقبول و مشہور ہو جاتا تو دوسرا مرثیہ گو متاثر ہو کر ویسا ہی یا اس سے بہتر نمونہ پیش کرنے کی کوشش کرتا مگر یہاں بھی بجز مسابقت کے اور کوئی ایسا جذبہ کارفرما نہیں معلوم ہوتا کہ ایسی کوششوں کو ہم پیروڈی کے ذیل میں لے آئیں اسی طرح بغیر مصرعۂ طرح کے کبھی کبھی شعرا کسی دوسرے شاعر کے شعر سے متاثر ہو کر خیال یا قافیہ ردیف لے کر اسی پیمانہ کا یا اس سے

بہترین شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے لیکن یہ بھی کوئی ایسی بات نہ ہوئی کہ پیروڈی سے اسے تعبیر کیا جائے۔

نثر کے میدان میں آئیے تو یہاں بھی ایسی ہی باتیں نظر آتی ہیں کہ جن میں پیروڈی کے اجزا، منتشر حالت میں نظر آتے ہیں مثلاً دورِ جدید کے پہلے تک افسانوں کے چربے زیادہ تر ایک سے ہیں کبھی کبھی جملے اور بیانات بھی ایک ہو گئے ہیں مثال کے لئے "فسانۂ عجائب" کو لے لیجئے۔ اس میں آرائش محفل، باغ و بہار، طلسم ہوش ربا وغیرہ کے اقتباسات جا بجا بغیر کسی اعتراف کے رجب علی بیگ سرور نے اپنے سمجھ کر پیش کر دئے ہیں مگر یہ کاوش بھی پیروڈی میں نہیں آتی گو یہ صاف ظاہر ہے کہ رجب علی بیگ سرور ان جملوں یا اقتباسات سے متاثر ہو گئے ہیں اور اصل مصنف کی قدر ذہنی طور پر کرتے ہیں لیکن یہ مقصد نہ تھا کہ اصل مصنف کو نمایاں کریں بلکہ اپنے افسانے کو زینت بخشنے کا خیال پیش تھا اس کو استفادہ یا تتبع کہہ سکتے ہیں پیروڈی نہیں۔

اردو میں پیروڈی کی ابتدا دورِ حاضر سے پہلے ہماری نظر میں نہیں البتہ دورِ جدید کے وسط سے کچھ نشانات ایسے ملتے ہیں جن کو ہم پیروڈی کے ضمن میں لا سکتے ہیں مثلاً حافظ کا یہ شعر ہے:۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا　　　که عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

اکبر۔ الا یا ایہا الچرچل نظر کن سوے ساحلہا　　　کہ جنگ آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

یا شیخ سعدی کی تصنیف کریما کو مد نظر رکھتے ہوئے تربھون ناتھ ہجر

نے مزاحیہ انداز میں کچھ اشعار کہے جن کا نمونہ یہ ہے۔

میرے ساقی پنڈو کا چھینٹا پلا | کہ ہستم اسیر کمند ہوا
یہ افیونیوں کی کمر خم نہیں | نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمین
میاں ہجر پینک میں آٹھوں پہر | بہ غفلت مبر عمر دروے بسر

بعض ایسے تفریحی اشعار ہیں جو تحریر میں نہیں حافظ میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً میور کالج میں ایک بار ایک صاحب کے ٹینس کا جال (net) کھو گیا انھوں نے گلزار نسیم کے طرز پر بہت سے اشعار کہہ ڈالے بکاؤلی جس طرح اپنے پھول کو یاد کر کے اظہار افسوس کرتی ہے اسی طرح انھوں نے بھی اپنے جال کا ماتم کیا تو کہا :

ہے ہے مرا جال لے گیا کون | ہے ہے مجھے جال دے گیا کون؟
نادر کے سوا چرانے والا | اوپر کا تھا کون آنے والا

اسی طرح سے بات آگے بڑھتی ہے اور اشعار وجود میں آجاتے ہیں مگر اس شعر گوئی کا منشا تفریح اور صرف تفریح تھا علاوہ اس کے یہ تفریحی مشغلہ بھی ضبط تحریر میں نہیں آیا اسی طرح کی اور بہت سی وقتی کاوشیں ہیں لیکن بنیادی اصول کے لحاظ سے ایسے اشعار پیروڈی میں مشکل ہی سے آسکتے ہیں اس لئے ہمارا خیال ہے کہ پیروڈی شعوری طور پر اپنی خصوصیات کے ساتھ اردو میں دور حاضر ہی کی پیداوار ہے۔

ابھی تک اردو میں پیروڈی کہنے والوں کی کمی محسوس ہوتی ہے جو کچھ کہا گیا ہے زیادہ تر تفریحی ہے۔ کہنے والوں میں کوئی نمایاں شہرت کا

مالک نہیں ہو سکا سب سے زیادہ مشہور نام اس سلسلہ میں کنھیالال کپور اور شفیق الرحمٰن کا لیا جا سکتا ہے۔ مگر جتنی قابلیت ان لوگوں کو طنز نگاری یا دوسرے اصناف میں ہے۔ اتنی ابھی پیروڈی لکھنے میں نصیب نہیں ہوئی اس لحاظ سے اردو ادب میں اس کا ذخیرہ ہنوز ناکافی اور ادبی لحاظ سے کم وقعت بھی ہے لیکن عام رجحان کا رُخ دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل قریب میں اچھا خاصا اور قابل قدر ذخیرہ ادب میں آجائے گا۔ نمونے کے لئے اردو کی کچھ پیروڈی ملاحظہ ہوں۔ مجاز کی مشہور نظم 'آوارہ' کے بعض بعض بند کی پیروڈی کنھیالال کپور نے اس طرح کی ہے سہ

مجاز

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

کپور

جی میں آتا ہے کہ اٹھ کر آج ساغر توڑ دوں
مار کر پتھر پہ خنجر اپنا خنجر توڑ دوں
توڑنے سے پہلے کشتی اس کا لنگر توڑ دوں
اپنا سر پھوڑوں نہ پھوڑوں غیر کا سر پھوڑ دوں
وائے حسرت کیا کروں اف ہائے حسرت کیا کروں

مجازؔ
بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

کپور
جی میں آتا ہے کہ اٹھ کر آشیاں کو پھونک دوں
پھونک دوں یہ چاند تارے آسماں کو پھونک دوں
پھونک دوں کشتی کو اپنی بادباں کو پھونک دوں
مہرباں کو پھونک دوں نامہرباں کو پھونک دوں
وائے حسرت کیا کروں اف ہائے حسرت کیا کروں

اختر شیرانی کی مشہور نظم "اے عشق کہیں لے چل" کی پیروڈی حسین میر کاشمیری نے جس طرح کی ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں مگر اچھا ہے ایک دو بند اصل نظم کے بھی یہاں لکھ دئے جائیں، سُنئے:

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہ عالم سے، لعنت گہ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے، اس نفس پرستی سے
دور ــــــ اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

آخری بند ہے :-

اک ایسی بہشت آئیں وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے آئیں

لے چل تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اے پیٹ کہیں لے چل — حسین میر کاشمیری۔
اے پیٹ کہیں لے چل
اس بھوک کی بستی سے
اس فاقہ پرستی سے
ذلت بھری ہستی سے
بالائے فلک لے چل
اے پیٹ کہیں لے چل

بھارت سے نہیں الفت
ایراں سے نہیں نفرت
مقصد ہے تری راحت
تو سیر رہے جس جا

بس مجھ کو وہیں لے چل
اے پیٹ کہیں لے چل

دن رات کے فاقے میں
جیتا ہوں نہ مرتا ہوں
دم تیرا ہی بھرتا ہوں
اے پیٹ کہیں لے چل
اے پیٹ کہیں لے چل

فیض کی مشہور نظم تنہائی کو ذہن میں رکھئے اور اس کی پیروڈی کنھیا لال کپور کی زبانی سنئے۔

فون پھر آیا دل زار نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

پیروڈی کا یہ بہترین نمونہ ہے جس میں اصل شاعر کے فن و تخیل کا پورا جائزہ لے کر پیروڈی نگار نے یہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ بغیر تشبیہ و استعارے کا سہارا لئے ہوئے طرز بیان کو ہلکے پھلکے مضامین میں کیسے صرف کیا جا سکتا ہے یہاں فیض کا مذاق اڑانا کپور کا مقصد نہیں بلکہ اس فن کو اپنے طور پر نمایاں کرنے کا خیال ہے تاکہ قدر دانوں کا دائرہ اور وسیع ہو جائے اصل نظم سے بعض الفاظ یا مصرعے لے لینے کا منشا نقالی نہیں بلکہ اس کو پھر سے ایک دائرے میں متعارف کرنے کا خیال ہے اور جذباتی طور پر فیض کو خراج تحسین ادا کرنا ہے۔

نظموں کے نمونے دیکھ کر جب ہم نثری کارنامے کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میدان میں بھی ہنوز تشنگی محسوس ہوتی ہے حالانکہ ابتدا، امید افزا ہے کنھیا لال کپور نے جس طرح میر کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے وہ قابل قدر ہے بات طولانی ہے مگر اس لئے ہم اختصار کے ساتھ اس کا مختصر سا اقتباس پیش کرتے ہیں یہ مقلوب پیروڈی کی بہت اچھی مثال ہے لکھتے ہیں :-

" میکڈوگل کے خیال میں مالیخولیا کی علامات یہ ہیں (۱) افسردگی (۲) بے خوابی (۳) نوحہ گری (۴) خودکشی کی خواہش (۵) جسم کا گھلنا' یہ پانچوں علامات میر میں یا یوں کہئے میر کی شاعری میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں افسردگی کو ہی لیجئے! میر کا مشہور شعر ہے ۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

سرِشام میرؔ پر گہری افسردگی چھا جاتی ہے ۔ آخر کیوں ؟ شام کے وقت تو عموماً شاعر لوگ نہایت خوش و خرم نظر آتے ہیں کیونکہ اس وقت وہ نئی نئی شیروانیاں پہن کر گلوں میں پان دبا کر مشاعروں میں جلوہ افروز ہوتے ہیں اور پھر میرؔ کو تو خاص کر خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ مشاعروں کے بادشاہ تھے ۔ مشاعرے تو کیا وہ تو عالم پر چھائے ہوئے تھے سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا' ظاہر ہے کہ دل کے بجھا سا رہنے کا سبب یہ نہیں کہ انھیں مشاعرہ میں سوداؔ سے ٹکر لینے کا ڈر تھا ۔ وجہ وہی ہے جو میکڈوگل نے بتائی ہے ۔ یعنی مالیخولیا !

نوحہ گری میرؔ کی شاعری کا جزو ہے ۔ اور میرؔ اُن لوگوں میں سے ہیں جو شبنم کی طرح نہیں بلکہ ابر کی مانند روتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کچھ عرصہ کے بعد رونا میرؔ کا روزگار ہو گیا تھا فرماتے ہیں ؎

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

رونے کے موضوع پر میرؔ نے لاجواب اشعار کہے ہیں اور جب ہم ان اشعار کی فنی خوبیوں کی بجائے ان کے پس منظر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ میرؔ کو مالیخولیا نے کہیں کا نہ رکھا تھا اور بے چارے کی ساری عمر رونے میں کٹی فرماتے ہیں ؎

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

اسی غزل میں ایک شعر ہے۔
یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا دن کو جوں توں شام کیا

گو یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ وہ دن کو زیادہ روتے تھے یا شب کو تاہم یہ ظاہر ہے کہ رات کے وقت بلند آواز سے روتے تھے۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہے گا

آگے چل کر لکھتے ہیں "یہ بات واقعی عجیب ہے کہ جنون اور جوہر قابل میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی ہے کہ عموماً اہل کمال جسمانی لحاظ سے ناکمل اور دماغی لحاظ سے بیمار ہوتے ہیں، ہومر، ملٹن سورداس اندھے تھے۔ بائرن لنگڑا، بی تھوون بہرا۔ مائیکل اینجلو پاگل، چارلس لیمب چھ ماہ پاگل خانے میں رہا۔ جان کیٹس اور اسٹیونسن کو تپ دق تھا اور میر کو مالیخولیا۔"

اس طرح میر کے مختلف اشعار سے اپنے مفروضہ کو انوکھے انداز سے آخر تک میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ میر کو مالیخولیا تھا، یہ طرز تخیل منطقی لحاظ سے یا واقعاتی اعتبار سے غلط سہی مگر اس میں ندرت و شگفتگی ضرور ہے اس انداز فکر و تحریر میں پیروڈی کی اعلیٰ خصوصیات جھلکتی ہیں کاش اور پیروڈی نگار اسی عنوان سے اپنی کاوشیں پیش کیا کریں۔

رپورتاژ

یہ صنف اردو ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تازہ وارد ہے۔ ۴۵، ۴۰ سال سے زیادہ آگے اس کے وجود کا پتہ نہیں چلتا اس سے پہلے یا تو صحافتی انداز میں واقعات کا بیان ہوتا تھا یا جذباتی طور پر تاثرات کا اظہار ضبط تحریر میں ہوتا تھا، جیسے جیسے سماجی اور سیاسی تغیرات بڑھتے گئے لوگوں کی خواہشات تلاش وجدت پسندی نے بھی نت نئے راستے اختراع کئے۔ حالات بیان کرنے میں مورخ کا قلم جذبات نگاری سے بے نیاز ہوتا تھا اخبار والے جو کچھ لکھتے تھے اس میں عبارت آرائی نہ ہوتی تھی، افسانہ نویس واقعات کے قلم بند کرنے میں صحافت کی دنیا سے دور ہو کر رومانی پہلو پہ نظر رکھتے تھے غرض

اس افراط و تفریط سے ناآسودہ ہو کر اہل نظر نے ایک نیا راستہ نکالا جس کو رپورتاژ یا رپورتاژ کے نام سے یاد کیا گیا۔

اس رپورتاژ میں ادبیت کے ساتھ ساتھ واقعات پر بھی نظر رکھی جاتی ہے یعنی تحریر میں ادبیت، صحافت، افسانویت کا امتزاج ہوتا ہے کسی واقعہ یا حادثہ کے بیان کرنے میں ان پہلوؤں کو بھی دکھایا جاتا ہے۔ جو مورخ نظر انداز کر جاتا مثلاً کسی مجمع میں لوگوں کی صورت سے جذبات کا کیا اندازہ ہوتا تھا، ان کی رفتار و گفتار سے شدت احساس کا کیا پتہ چلتا تھا انکے تیور اور مسائل زیر بحث میں کیا تناسب تھا۔ اس کے علاوہ بعض ایسے پہلو جن کو صحافی معمولی سمجھ کر چھوڑ جاتا مگر رپورتاژ لکھنے والا افسانوی لحاظ سے اہم خیال کر کے قلم بند کرتا ہے اور اس بظاہر معمولی واقعہ سے تمام مجمع کے تاثرات اور حالات کا نقشہ واضح طور پر پُر اثر بنا کر پیش کر دیتا ہے اور اس تحریر میں اختصار کے ساتھ ادب کی بھی چاشنی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے رپورتاژ کا تیار کرنا ایک ایسا مشکل کام ہے جس کے لئے فن کار کے دماغ کی ضرورت ہے۔ اس کو مورخ کا قلم، ادیب کا دماغ اور مصور کی نظر چاہئے۔

رپورتاژ عموماً ایسے واقعات پر مبنی ہوتا ہے جس سے ایک خاص طبقہ کو تعلق ہو یا اس کا اثر عام زندگی یا معاشرت سے ہو چاہے وہ منظم تحریک کی صورت کی بجائے انفرادی شعور کا ایسا کارنامہ ہو جو پھیلی ہوئی شکل میں عمومیت کا درجہ رکھتا ہو۔ یا کسی مجمع میں ایسے مسائل یا ادبی نکات پر گفتگو ہوئی ہو جسکے سُننے اور سمجھنے کے لئے کافی لوگ جمع ہو گئے ہوں اور دیکھنے والے نے

فضا کی کشمکش کا مطالعہ ایک خاص نظر سے کیا ہو تب ہی رپورتاژ کامیابی کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔ واقعات یا حالات کو جب تک خود نہ دیکھا گیا ہو رپورتاژ نہیں لکھا جا سکتا دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ رپورتاژ لکھنے والے کو موقع پر موجود ہونا اور ذاتی مشاہدہ کی ضرورت ہے گویا اسے چشم دید گواہ ہونا لازمی ہے۔ بغیر اس کے رپورتاژ، رپورتاژ نہ ہوگا چاہے کچھ اور ہو جائے۔

پیروڈی کی طرح رپورتاژ بھی مختصر چیز ہے اس کے اختصار کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا مگر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نہ تو تار کی طرح مختصر ہو اور نہ سفرنامے کی طرح طویل ہو اس میں تفصیل کی زیادہ گنجائش نہیں جامعیت کی ضرورت ہر جگہ ہے جو بات کہی جائے وہ مبہم نہ ہو اشارے اتنے پُرمعنی ہوں کہ ذہن مفہوم تک پہنچ جائے سننے والے کو زیادہ دماغ پر زور نہ دینا پڑے اور بات سمجھ میں آجائے اس لحاظ سے رپورٹ اور رپورتاژ میں وہی فرق ہے جو ناول اور مختصر افسانے میں یہ ضرور ہے کہ جو نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں ان میں بعض بعض رپورتاژ طولانی بھی ہیں لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا، مختصر ہی لکھنے کو لوگ بہتر سمجھتے ہیں۔

رپورتاژ کی بنیاد واقعات پر ہوتی ہے وہ مفروضہ یا تخیلی باتوں پر تیار نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اس کا تعلق براہ راست تاریخ سے ہے اور تاریخ کا پیٹ صرف وہی حالات بھر سکتے ہیں جو ظہور پذیر ہو چکے ہوں۔ جن سے لوگ متاثر ہوئے ہوں اب رہا ان واقعات سے نتیجہ نکالنا یہ اہل نظر پر منحصر ہے اپنے طور پر۔ لوگ جس طرح متاثر ہوتے ہیں ویسے ہی ان کے خیالات

رپورتاژ میں نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن رپورتاژ کے لئے پرانے واقعات یا حادثات کارآمد نہیں ہوتے اس کے لئے وہی باتیں مفید ہو سکتی ہیں جو اس زمانہ میں ہو رہی ہوں جس میں لکھنے والا موجود ہو ورنہ رپورتاژ بہک کر کہیں کا کہیں پہنچ جائے گا ساتھ ہی ساتھ واقعات میں ہیجانی کیفیت اور بحث طلب عناصر کا پایا جانا رپورتاژ کے لئے لازمی شرط ہے۔ وہ پُرسکون اور تفریحی معاملات میں عروج نہیں پاتا اس کے لئے ہنگامہ آرائی اور جان دار تحریکات کی فضا درکار ہے۔

رپورتاژ لکھنے والے کے پاس واضح سماجی اور سیاسی نقطۂ نظر ہونا چاہئے۔ جس قدر اس کا شعور بلند و ہمہ گیر ہوتا ہے اتنا ہی اس کی تحریر جاذب دل و دماغ ہوتی ہے کیوں کہ لوگ ہر بات کو صاف سُننا اور دیکھنا چاہتے ہیں اس لحاظ سے رپورتاژ میں کسی فلسفیانہ تخیل کی گنجائش نہیں اس میں تو جذبات اور واقعات کی جیتی جاگتی تصویر ہونا چاہئے لکھنے والا جو کچھ دیکھ اور سوچ رہا ہو اس کو جلد از جلد قلم بند کرنا چاہئے۔ شاعر کی طرح اس کو اتنی مہلت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے جذبات میں اعتدال پیدا کرے تب سکون کے ساتھ قلم اٹھائے اس کی تحریر کو آگ اور بجلی کی تیزی کی ضرورت ہے اسے ماحول کو اپنانا پڑتا ہے تاکہ وہ جلد از جلد اپنی تحریر اور اپنے شعور کا سہارا لے کر عوام سے قریب تر ہو سکے۔

جیسا ہم نے اوپر عرض کیا رپورتاژ میں ادبیت و صحافت دونوں شامل ہیں لیکن سچ پوچھئے تو نہ وہ ادب پارہ ہے نہ صحافت نگاری کا

نمونہ بلکہ دونوں کے بیچ کی ایک کڑی جس میں دونوں اجزا، وقتاً فوقتاً نظر آتے ہیں اسی طرح نہ یہ رپورٹ ہے نہ افسانہ مگر تھوڑی سی ترمیم کے بعد رپورتاژ افسانہ بھی بنایا جا سکتا ہے اور رپورٹ کی صورت میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے یہ ضرور ہے کہ اس کی بنیاد ادبیت پر قائم ہے ادبیت جزو اعظم ہے بغیر اس کے کوئی رپورتاژ کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔

اس رپورتاژ کے وجود و نشو و نما کے اسباب بھی سماج کی بدلتی ہوئی شکلوں میں تلاش کرنے سے ملتے ہیں سیاسی شعور کی ہمہ گیری اور نئے نظام کی سماج سے قربت نے علاوہ اور لوگوں کے ادیبوں کو بھی عملی زندگی سے دلچسپی لینے پر مائل کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ادیب و صحافی قریب تر ہوتے گئے ان کے رجحانات و طرز تخیل کو ایک سنگم کی ضرورت محسوس ہوئی صحافی کو ادب کی چاشنی اور ادیب کو صحافت کی چاشنی میں ایک ایسی لذت ملی جو اس سے پہلے نہ ملی تھی ویسے تو رسالوں کے ایڈیٹر عام طور سے ادیب ہوا کرتے تھے یہاں ان کا ذکر نہیں بلکہ ہماری مراد ان صحافیوں سے ہے جن کا اوڑھنا بچھونا سیاست ہے ان لوگوں کے مذاق اور ادب فہمی میں جب تبدیلی ہوئی تو ادیب کو بھی صحافت سے دلچسپی ہونے لگی علاوہ اس کے عوام کا مذاق سیاست کی طرف مائل دیکھ کر ادیبوں کو اور زیادہ خیال ہوا کہ سماج کی تشنگی خالص ادب سے نہیں جاتی ان کو روز مرہ کے حالات اور زندگی کے نشیب و فراز سے واقفیت کی بھی ضرورت ہے تو رفتہ رفتہ ایک ایسی صنف کا خاکہ تیار ہوا جس کو ادب سے بھی لگاؤ تھا اور صحافت

سے بھی، زندگی کی ترجمانی اس انداز میں کی گئی جس میں ادب اور سیاست دونوں ملے جلے نظر آئے اسی کا نام رپورتاژ رکھا گیا۔

پیروڈی کی طرح رپورتاژ بھی براہ راست مغربی ادب سے اُردو میں آیا، پیروڈی کے مماثل تو اردو میں جدید دور سے پہلے بھی جا بجا مل جاتے ہیں لیکن رپورتاژ کے نمونے اس صورت میں بھی کہیں نظر نہیں آتے اور اسکی تلاش بھی بے کار ہے اس لئے کہ پیروڈی کے اجزا میں مزاح و تنقید شامل ہیں اس لئے ہر ادب میں یہ عناصر مل سکتے ہیں لیکن رپورتاژ میں ان کے ہونے کا کوئی خاص سوال نہیں اس میں تو سیاسی نقطۂ نظر اور صحافتی رجحان کی ضرورت ہے اور لازمی نہیں کہ یہ عناصر ہر ادب میں خود بخود جزو ادب کی طرح پیدا ہو جائیں اس کا ظہور تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب ادیبوں کا سیاسی یا سماجی شعور ایک خاص بلندی حاصل کرے۔

ہم کو آزادی ابھی ابھی ملی ہے سیاسی یا سماجی شعور کی سطح اب سے پہلے اتنی بلند نہ تھی کہ ہم آزادی سے اپنے ماحول میں سانس لے سکتے عوام تک ادب کو پہنچانے کی نت نئی صورتیں سوچتے اصناف سخن کی شکلوں میں اضافہ کرتے نہ عوام کا رجحان ایسا تھا کہ وہ ادب کے ذریعے سے سیاست کے دروازے پر پہنچنے کی فکر کرتے اس لئے نہ ان کا کوئی مطالبہ تھا اور نہ ادیبوں کو اس کی فکر تھی لہٰذا دور حاضر سے پہلے رپورتاژ یا اس کے مشابہ کی چیز نہیں اگر کچھ ہو سکتی ہے تو ڈائری جو ہندوستان اور انگلستان میں عرصہ قدیم سے چلی آرہی تھی مگر ہندوستان میں اس کو کبھی بھی اتنا فروغ نہ ہوا کہ

عمومیت حاصل ہو سکے زیادہ تر یہ چیز خاص خاص گھروں میں پردہ نشین کی حیثیت سے رکھی گئی۔

اردو میں یہ چیز جتنی نئی ہے اتنی کم بھی ہے ابھی اس کا ذخیرہ وافر نہیں ہوا لیکن خوشی اس کی ہے کہ جو لوگ رپورتاز کے لئے قلم اٹھا رہے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جو علاوہ ادیب ہونے کے ایک خاص سیاسی، اور سماجی، ادبی شعور کے مالک ہیں ان کی طرز تحریر کا جھکاؤ پستی کی طرف نہیں ان کی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کی سوجھ بوجھ پر بھروسا کیا جا سکتا ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں یہ صنف اردو میں وسیع و ہر دلعزیز ہو جائے کیونکہ تیزی سے لوگوں کا رجحان رپورتاز کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ فی الحال جو اہل قلم رپورتاز کے لئے زیادہ مشہور ہیں ان میں کرشن چندر کا نام سب سے زیادہ لیا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس صنف کو بھی مختصر افسانہ کی طرح بلندی عطا کرنے کی فکر میں ہیں ان کے رپورتاز میں کم و بیش وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو ایک کامیاب رپورتاز میں سوچی جا سکتی ہیں۔ جیسا کہ ان کی "صبح ہوتی ہے" اور "پودے" کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے نمونہ کے لیے "صبح ہوتی ہے" میں سے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ کرشن چندر ایک ادبی کانفرنس کے لیے جنوبی ہند کا سفر اختیار کرتے ہیں اثنائے سفر میں ایک پادری سے ملاقات ہوتی ہے اس موقعے کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"ڈبے میں بہت دیر تک خاموشی رہی۔ گاڑی اب نندلور سے آگے نکل کے گھنے جنگلوں میں سے گذر رہی تھی۔ گورے پادری نے انگلی کے

اشارے سے مجھے بتایا کہ یہی راجہ پیتم پور کے جنگلات ہیں بہت دور تک ادھر مغرب میں نظام حیدآباد کی ریاست کے اندر وہ ان پہاڑی چوٹیوں کے پرے تک یہ جنگلات چلے جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں جنگلی جانور بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں، اور یہ جانور اس قدر دلیر ہیں کہ آس پاس کے گاؤں سے اور ایک روز تو اس اسٹیشن سے ایک اسٹیشن ماسٹر کو اٹھالے گئے بڑے خونخوار چیتے ہوتے ہیں اس جنگل کے ....

میں راجہ صاحب کے جنگلوں کی طرف دیکھنے لگا چھوٹی چھوٹی انسانی آبادیوں کے گرد میلوں تک پھیلے ہوئے خونخوار جنگل یہ صوبہ مدراس سے حیدرآباد تک پھیلے ہوئے وسیع جنگل جن کے بیچ میں ایک پھول قید ہے۔ کیا یہ پھول کبھی آزاد نہ ہو سکے گا۔ میں نے نگاہ اٹھا کے ان وسیع جنگلوں کی طرف دیکھا جن کے بیچ میں گاڑی بھاگی چلی جا رہی تھی یہ جگہ نشیب پر تھی، جنگل مغرب کی سمت اونچے اور اونچے پہاڑیوں پر پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ راجہ صاحب کے خوفناک جانوروں والے جنگل، پہاڑیوں کے اس طرف حیدآباد کی سرحد تھی، وہاں بھی یہ جنگل پھیلتے ہوئے چلے گئے تھے ان سے پرے تلنگانہ تھا، اور میں نے یہ سوچا ایک دن یہ پھول ضرور آزاد ہوگا تلنگانے کے ہاتھ اور شاعر کے دل ضرور اس جنگل کو فتح کریں گے جو انسان کی روح کے ارد گرد چھایا ہے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گورا پادری بڑے افسوس ناک لہجے میں کہنے لگا۔ آج کل شکار میں مزہ نہیں رہا۔

کیوں؟ میں نے پوچھا

شکار کے لیے ہنکئے نہیں ملتے پہلے بہت ملتے تھے، اب دُگنے داموں پر بھی بہت کم ہنکئے ملتے ہیں اور تم جانتے ہو ہنکیوں کے بغیر شکار کا لطف نہیں آتا اب کسانوں کو اپنی جان پیاری ہو گئی ہے، وہ شکار پر ہنکیوں کا کام کرنا پسند نہیں کرتے۔

میں نے پوچھا۔ فادر تمھیں شکار کا بہت شوق ہے؟

اس کا گول گول بچوں کا سا چہرہ کھل اٹھا، بولا "ترّی مِنیدوس"

میں نے کہا، فادر فرانسیسی ہو کہ اطالوی؟

وہ بولا میں ڈچ ہوں، مجھے یہاں آئے ہوئے تیس سال ہو گئے۔

تیس سال اسی حلقے میں گذر گئے۔ میں نے گاڑی سے باہر اشارہ کیا۔

وہ سر ہلا کے بولا۔ ہاں۔ مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے، یہاں شکار بہت ملتا ہے، ریچھ، شیر، چیتے، سور، ہرن، ہر طرح کا شکار ملتا ہے مگر نہیں ملتا ہے تو بس ایک ہاتھی نہیں ملتا ہے اس علاقے میں۔ میں نے کہا فادر! تم غلط کہتے ہو، ہاتھی تو یہاں بھی ملتا ہے مگر تم نے کبھی اُسے شکار کرنے کی کوشش نہیں کی تم ہمیشہ غریب آدمیوں کا شکار کرتے رہے، اور ہاتھیوں کو جنگل میں اکیلا چھوڑ دیا، ورنہ ہاتھی تو ہندوستان ہی میں ملتا ہے، اور نیچے جاؤ تو سیلون میں بھی ملے گا، برما میں بھی اور ملایا میں بھی، ہاتھی انڈونیشیا میں بھی ملتا ہے، مگر وہاں اس کا رنگ سفید ہوتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ سفید ہاتھی بڑا متبرک ہوتا ہے، اور بڑی مشکل سے ملتا ہے، مگر میرا تو یہ خیال ہے کہ ایشیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں یہ سفید ہاتھی نہ ملتا ہو حد تو یہ ہے کہ اب یہ سفید

ہاتھی عرب، عراق، سیریا، اور فلسطین کے ریگستانوں میں بھی ملنے لگا ہے جہاں جہاں تیل کے چشمے ہیں، لوہے کی کانیں ہیں، ربر اور چائے کے باغات ہیں وہاں یہ سفید ہاتھی پایا جاتا ہے۔

ڈچ پادری کا رنگ اڑ گیا، اس کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا، اس کے ہونٹ سختی سے اندر کو بھنچ گئے۔ اس نے جلدی سے لٹکتی ہوئی صلیب کو پکڑ لیا، اور میری طرف نفرت سے دیکھ کے منہ پھیر لیا۔

سانولے رنگ" کے پادری نے کہا" تمھیں فادر سے ایسے الفاظ کہنے کا کوئی حق نہیں تھا!"

میں نے بڑی نرمی سے کہا، میں نے فادر کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی ہے میں تو ہاتھیوں کا ذکر کر رہا تھا۔

راستے میں ایک اسٹیشن آ رہا تھا، پادریوں کو ابھی آگے اترنا تھا، مگر وہ دونوں یہیں اتر گئے، گاڑی سے اترتے ہوئے سانولے رنگ کے پادری نے میری طرف زہر میں بجھی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

مجھ سے نہیں رہا گیا، اس لیے میں نے کہا۔ اب جاتے ہو تو یہ بھی سنتے جاؤ کہ سفید اور کالے ہاتھیوں میں ہمیشہ لڑائی رہا کرتی تھی۔ دونوں الگ الگ اپنے گلے بنا کے جنگل میں گھوما کرتے تھے، مگر اب سنا ہے کہ آج کل کالے اور سفید ہاتھیوں میں بڑی ملی بھگت ہو رہی ہے، اور دونوں ایک دوسرے کے گلے میں سونڈ ڈالے ایشیا کے جنگلوں میں گھوم رہے ہیں۔

ڈچ پادری، اور دیسی پادری سوٹ کیس اٹھائے میری کھڑکی کے

سامنے سے گذر گئے۔ میں نے بچوں کی طرح چلا کے کہا "ترّی من ڈس"

دوسرا موقع وہ ہے جب وہ کانفرنس میں پہنچ کر وہاں کی روداد بیان کرتے ہیں لکھتے ہیں:۔

"اس ترّی چور میں ملیالم زبان کے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس گیارہ دسمبر سے شروع ہو رہی تھی ٹراونکور اور کوچین کی ریاستوں کو ایک دوسرے میں ضم کر دینے کے بعد بھی کیرلا کے علاقے کا ایک حصّہ صوبہ مدراس میں رہ گیا تھا، لیکن جب قوم اور زبان ایک ہو تو اس قسم کی جغرافیائی حد بندی زیادہ دیر تک عوامی تحریک کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔" ایکیا کیرلا" کی آواز کیرلا کے گوشے گوشے سے اٹھ رہی ہے، اور یہ آواز متحدہ مزدوروں اور کسانوں کی تحریک کی آواز ہے اس لئے یقین ہوتا ہے کہ جمہوری کیرلا بن کے رہے گا، اور مالابار کا وہ علاقہ بھی اس میں آئے گا جو ابھی تک صوبہ مدراس میں ہے، اور جہاں آج بھی انگریزوں کے زمانے کی سپیشل پولیس تعینات ہے، اور جہاں آج بھی کیرلا کے بہادر سپوت، ان تمام آلام، اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اپنے گھروں، اپنی زمینوں، اور اپنی بہو بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کر رہے ہیں۔

اس کانفرنس میں شمالی ملبار کے بہادر کسان ادیب اور مزدور ادیب بھی شرکت کے لئے آئے تھے ٹراونکور کوچین اور شمالی ملبار کے گوشے گوشے سے یہ ادیب آئے تھے، طالب علم، جرنلسٹ

مزدور اور کسان، جو اپنے اپنے محاذ پر لڑتے ہوئے بھی ادب کی تخلیق کرتے ہیں، اور اسے اپنے ملک کے سماجی حالات اور سماجی تحریکوں کا اہم حصہ سمجھتے تھے، یہ لوگ جو ادب کی تخلیق شوقیہ نہیں کرتے تھے جیسے بیٹر بازی شوقیہ کی جاتی ہے، بلکہ اسے زندگی کی ایک اہم ضرورت سمجھ کے اور عوامی لڑائی میں اس کی ضرورت اور اس کی افادیت کا احساس اپنے دل میں رکھتے ہوئے اپنے خون و جگر سے اسے سینچتے تھے۔

کانفرنس کا انعقاد شہر کے پرشکوہ ٹاؤن ہال میں ہوا۔ پہلے روز مندوبین کی تعداد چھ سو کے قریب تھی، سب سے پہلے میں نے کل ہند ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی طرف سے ایک پیغام پڑھ کے سنایا، اس کے بعد اچھوتے گروپ نے ملیالم زبان میں اپنی صدارتی تقریر میں مقامی حالات کا جائزہ لیا، اس سے چند ماہ پہلے کیرلا کے ادیبوں کی ایک اور کانفرنس ہو چکی تھی، جس میں ترقی پسندوں کے نئے منشور سے بحث کی گئی تھی لیکن یہ بحث کسی خاطر خواہ نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی۔ منشور کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہوسکا اور اس کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لئے جو کمیٹی بنی تھی اس نے کوئی کام نہیں کیا، اور معاملے کو یوں ڈھیل دی کہ پورے کیرلا میں انجمن کا کام تقریباً ختم ہو گیا، اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ کانفرنس بلائی گئی تھی۔ تاکہ انجمن کی تحریک کو پھر سے استوار کیا جا سکے، اور اس کا رشتہ عوامی تحریکوں سے مضبوط کیا جا سکے۔ خیال تھا کہ اس سلسلہ میں بہت سی مشکلیں پیش آئیں گی۔ اور رجعت پسندوں سے جو بدستور انجمن کو اک عضوِ معطل

بنائے رکھنا چاہتے تھے، زبردست مقابلہ بھی ہو گا۔

مندوبین میں ایسے عناصر بھی تھے۔ جو انجمن کے نئے منشور اور اس کی دلیرانہ روش کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کچھ ایسے پرانے کرم فرما بھی تھے جو اپنے گندے انڈے کے خول میں رہ کر ادب برائے ادب کی تخلیق کرنا چاہتے تھے جس کا مظاہرہ وہ علانیہ یوں کرتے تھے۔ کہ گندی جنسی کہانیاں لکھتے تھے۔ اور اسی قسم کی ننگی شاعری کرتے تھے جسے پڑھتے وقت آدمی کو غسل خانہ کا خیال آتا ہے۔ ان میں سے ایک صاحب وہ تھے جنھوں نے ایک گرم کتیا اور اس کے مالک کے غیر فطری عشق کی کہانی لکھی تھی، اور اسے ترقی پسندی کی سند سمجھتے تھے اور یہ لغو حرکتیں اس وقت ہو رہی تھیں جب کسان بھوک سے مر رہے تھے۔ اور اپنا غلہ۔ اپنی محنت سے پیدا کیا ہوا غلہ اپنے گھر میں رکھنے کے لئے جاگیرداروں، زمینداروں، اور سرمایہ داروں سے لڑ رہے تھے۔ اور ان کی حکومت کے استحصالی ہتھکنڈوں کا مقابلہ اپنی متحدہ قوت سے کر رہے تھے ایک طرف شہیدوں کا خون تھا۔ دوسری طرف کتے کتیا والی شاعری تھی، اور ادیبوں کو اپنا موضوعِ سخن چننا تھا۔ یہ کانفرنس اسی مقصد کے لئے بلائی گئی تھی"۔ ..... مختلف رجحانات سے بحث کرتے ہوئے کرد سے نے کہا کہ ہم لوگ اپنے ادب میں نظریاتی سچائی اور فکری رجحان اور اس کی صحت پر تو بڑا زور دیتے ہیں، اور دیتے رہے ہیں لیکن اسی عرصے میں ہم اپنے اصلی دشمن یعنی استحصال کرنے والا طبقے کو جو برسر اقتدار ہے۔ بالکل بھول جاتے ہیں۔ اور ایسا ادب نہیں تخلیق کرتے جو اسے بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو"۔